دینی اخلاقیات کے

قرآنی مفاہیم

تصنیف :

پروفیسر توشی ہیکو ازتسو

ترجمہ

ڈاکٹر محمد خالد مسعود

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

لاہور ○ پاکستان

دینی اخلاقیات کے قرآنی مفاہیم

تصنیف :

پروفیسر توشی ہیکو ازتسو

ترجمہ

ڈاکٹر محمد خالد مسعود

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

۲- کلب روڈ، لاہور

ISBN 969-469-113-3

طبع اول: 2005ء

تعداد: 1100

ناشر: ڈاکٹر رشید احمد (جالندھری)

ناظم ادارہ ثقافت اسلامیہ

مطبع: مکتبہ جدید پریس، لاہور

قیمت: -/375 روپے

اس کتاب کی طباعت و اشاعت اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، انفاق فاؤنڈیشن، کراچی اور محکمہ اطلاعات و ثقافت، حکومتِ پنجاب کی مالی معاونت کی بدولت ممکن ہوئی ہے۔ شکریہ!

انتساب

والدہ مرحومہ بشیرن خاتون کے نام

جنھیں ہم سب بہن بھائی

اور

جھنگ شہر کی سینکڑوں بچیاں، جنھوں نے ان سے قرآن شریف پڑھا
پیار سے بی بی کہا کرتے تھے!

بی بی کو قرآن کریم سے بے حد شغف تھا۔ ان کی عمر کا زیادہ حصہ قرآن کریم کی تعلیم و تدریس میں گزرا۔ قرآن فہمی کے موضوع پر پروفیسر ازتسو کی کتاب کے اس اردو ترجمے کا آغاز بی بی کی آخری علالت کے دنوں میں ہوا۔ بیشتر ابواب ان کی تیمارداری کی راتوں میں ۱۹۹۵ء میں مکمل ہوئے، جب وہ اسلام آباد کے مرکزی ہسپتال میں زیرِ علاج تھیں۔

بی بی کی قرآن سے وابستگی کی نسبت سے
میں اپنے شفیق استاد پروفیسر ازتسو کی کتاب کے اردو ترجمے کی
اس کوشش کا انتساب بی بی کے نام کرتا ہوں!

محمد خالد مسعود

اسلام آباد

۲۴ر فروری ۲۰۰۴ء

ابواب بندی

بنیادی تصورات کا تجزیہ

حرفِ مترجم

یہ کتاب پروفیسر ازتسو کی کتاب ''قرآن کریم کی اخلاقی اصطلاحات کا معنویاتی مطالعہ'' کا اُردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۵۹ء میں کائیو یونیورسٹی جاپان سے شائع ہوئی تھی اور اس پر اُنھیں ۱۹۶۰ء میں اسی یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری ملی تھی۔ بعد میں اُنھوں نے اس کتاب پر نظرِثانی کی اور ۱۹۶۶ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن میکگل یونیورسٹی، مانٹریال کینیڈا سے شائع کیا۔ قرآن کا معنویاتی مطالعہ کیسے کیا جائے، اس موضوع پر یہ بے حد وقیع کتاب ہے۔ پروفیسر ازتسو نے اس کتاب میں جو طریق کار تجویز کیا، اسے اہلِ علم میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ متعدد محققین نے اس طریقِ کار کو اختیار کیا اور قرآنی موضوعات کے بارے میں بیش قیمت مطالعے پیش کیے۔ ۱۹۸۱ء میں اس کتاب کا فارسی میں بھی ترجمہ ہوا۔ اس کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر خیال ہوا کہ اسے اُردو قارئین تک بھی پہنچنا چاہیے۔ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری کی تحریک پر خاکسار نے ۱۹۹۳ء میں اس کا اُردو ترجمہ شروع کیا۔ چند ابواب کا ترجمہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے مجلّے المعارف میں چھپا تو قارئین نے بے حد پسند کیا اور تقاضا ہوا کہ کتاب کا مکمل ترجمہ شائع کیا جائے۔ المعارف میں جو ترجمہ چھپا وہ کتاب کے ۱۹۵۹ء کے ایڈیشن کا تھا۔ زیرِ مطالعہ ترجمہ میں ۱۹۶۶ء کے ایڈیشن کو سامنے رکھا گیا ہے۔

پروفیسر ازتسو کی یہ کتاب کئی لحاظ سے اہم ہے۔ ایک جانب تو یہ کتاب دورِ جدید میں دینِ اسلام کے اس نئے رجحان کی نشان دہی کرتی ہے، جس میں قرآنِ کریم کو مسلمانوں کی زندگی میں مرکزی اہمیت حاصل ہوئی ہے، وہاں دوسری جانب اس بات کی بھی شہادت ہے کہ اس دور میں قرآنِ مجید کا علمی مطالعہ اور درس و تدریس مسلمانوں

تک محدود نہیں رہا۔ پروفیسر ازتسو کی طرح اس صدی میں متعدد غیر مسلم علما نے قرآن کا بغور علمی مطالعہ کیا ہے۔ غیر مسلم علماء کی قرآن کریم کے بارے میں تحقیق و تصنیف کی تعداد بلا مبالغہ اتنی زیادہ ہے کہ یہاں ان تمام کتابوں کا مکمل جائزہ پیش کرنا ممکن نہیں اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔ تاہم یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ جن موضوعات پر لوگوں نے کام کیا ہے، ان میں سے بیشتر عنوانات مسلم علما کی تحقیق کا بھی موضوع بنے۔

ان میں سے ایک اہم موضوع قرآن کریم کا تاریخی مطالعہ اور قرآنی سورتوں کی تاریخی ترتیب ہے۔ مستشرقین میں سے نولڈیکے، رچرڈ بل اور منٹگمری واٹس کے نام مثال کے طور پر لیے جا سکتے ہیں، جنہوں نے اس موضوع پر تحقیق کے نئے زاویے پیش کیے۔ مستشرقین نے اپنے مخصوص علمی اور سیاسی پس منظر کی بنا پر قدرتی طور پر قرآن کی تاریخ کے حوالے سے جمع قرآن اور اس کے انجیل اور تورات سے تقابل کے مسائل میں زیادہ دلچسپی لی۔ حالیہ علماء میں رچرڈ برٹن اور وانس بورو خاص طور پر نمایاں ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک جمع قرآن کا عمل بہت دیر میں مکمل ہوا۔ ہمیں یہاں ان تحقیقات اور ان کے نتائج سے سروکار نہیں بلکہ سردست صرف یہ کہنا ہے کہ غیر مسلم تحقیقات میں بھی قرآن کریم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ برصغیر میں بھی قرآن اور اس کی سورتوں کا تاریخی مطالعہ بہت سے مفسرین اور محققین کا محبوب موضوع رہا ہے۔ ان میں دیگر علما کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد کے قریبی ساتھی محمد اجمل خاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جنہوں نے قرآنی سورتوں کو تاریخ نزول کے حساب سے ترتیب دینے کی کوشش کی۔

دورِ جدید کے علمی رجحانات کی دوسری خصوصیت جو غیر مسلم اور مسلم تحقیقات میں مشترک پائی جاتی ہے وہ قرآن فہمی کا یہ پہلو ہے کہ قرآن کا بطور کتاب اور ایک اکائی مطالعہ ضروری سمجھا گیا۔ ماضی میں عام طور پر قرآن کریم کی تفسیر آیات اور سورتوں کی ترتیب سے کی جاتی تھی، جس میں ایک ایک کر کے آیت بہ آیت تفسیر درج کی جاتی تھی۔ جس سے یہ تصور ابھرتا تھا کہ قرآن کریم کو دوسری کتابوں کی طرح نہیں پڑھا جا سکتا۔ اس نقطہ نظر نے اس خیال کو بھی فروغ دیا کہ قرآن کریم ایک مربوط کتاب نہیں بلکہ اس کی شکل خطاب کی سی ہے۔ اہل علم نے اسے اعجاز قرآن کا ایک پہلو قرار دے کر

اس نے بطور کتاب مطالعہ کی حوصلہ شکنی کی۔ عصر جدید میں اس بات پر زور دیا گیا کہ قرآن کریم کا مطالعہ ایک جامع اور مربوط کتاب کی شکل میں ضروری ہے۔ برصغیر میں شاہ ولی اللہ کی الفوز الکبیر نے اس طرزِ مطالعہ کی داغ بیل ڈالی۔ متقدمین کے ہاں ربط آیات کا تصور نہ ہونے کی وجہ سے آیات کی کثیر تعداد کو اس لیے منسوخ قرار دے دیا جاتا تھا کہ وہ دوسری آیات کے بظاہر مخالف یا متضاد نظر آتی تھیں۔ شاہ صاحب نے مضامین قرآن کی پنجگانہ تقسیم پیش کر کے نہ صرف قرآنِ کریم کا بطورِ کتاب مطالعہ ضروری قرار دیا بلکہ اس کے موضوعات میں ایک بنیادی ربط ثابت کر کے ناسخ و منسوخ کے مسئلے کو نیا مفہوم دیا۔ بعد میں مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا حسین علی اور مولانا احمد علی (لاہوری) نے ربط آیت پر مزید کام کر کے پورے قرآن کو ایک مربوط کتاب کی طرح پڑھے جانے کو آسان بنا دیا۔ مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا امین احسن اصلاحی نے نظم قرآن کے پہلو کا مزید گہرائی سے مطالعہ کیا۔ برصغیر میں ان پیہم کوششوں نے اس بات کو تقویت دی کہ قرآن کی قرآن ہی سے تفسیر ممکن ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کے جزئی مطالعہ کی بجائے اس کا مجموعی اور کلی مطالعہ کیا جائے۔ قرآن فہمی کے ان رجحانات کا اثر اس دور کی تفسیروں پر بھی پڑا۔ اکثر تفسیروں میں آیت بہ آیت تفسیر کا اسلوب تو اختیار کیا گیا، لیکن ہر سورت کی مجموعی تفسیر اور اس کا تاریخی پس منظر بیان کرنا بھی ضروری سمجھا جانے لگا۔ قرآنی علوم پر الگ سے کتابیں لکھی گئیں۔ قرآن مجید کے اشاریے اور موضوعاتی فہرستیں تیار کی گئیں۔ مختلف موضوعات پر قرآنِ کریم کے مجموعی مطالعے پیش کیے گئے۔

اس پس منظر میں یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ دورِ جدید میں اجتہاد اور احیائے دین کی تحریکوں نے قرآن فہمی کے ان جدید رجحانات کو مزید تقویت دی۔ تقلید کے دور میں قیاس صرف فقہ کا ہی اہم ماخذ نہیں تھا، بلکہ علم تفسیر، علم الکلام حتی کہ مسلم فکر کا بنیادی طریق تحقیق بن چکا تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ عام طور پر قیاس کے لیے قرآن کریم کی ساری آیات کی بجائے کسی ایک آیت سے استدلال کافی تھا، بلکہ جہاں آیت سے واضح اور صریح حکم نہ ملتا ہو، وہاں مشابہت اور

علت کے اصول پر استنباط کیا جا سکتا تھا۔ مشابہت اور علت کا معیار کیا ہو، اس کا تعین قرآن کریم کی بجائے فقہ اور کلام کے اصولوں کی بنیاد پر طے کیا جانے لگا۔ اس سے قدرتی طور پر تقلید کو رواج ملا، جو پہلے پہل تو اہلِ علم سے سوال اور مشورے کا نام تھا، لیکن بتدریج یہ شخصی تقلید میں بدل گئی یعنی ہر بات میں کسی ایک امام یا مذہب کی پیروی۔ تقلید کی روایت نے فقہی مذاہب کو استحکام بخشا تو اس کا براہِ راست اثر تفسیر قرآن کے فن پر پڑا۔ قرآن کی تفسیر مضامینِ قرآن کی بجائے مختلف مذاہب کے نقطۂ نظر سے لکھی جانے لگی۔

جوں جوں اسلامی فکر پر روایت اور تقلید کی گرفت مضبوط ہوتی گئی، قرآن فہمی کا دارومدار روایت پر بڑھتا گیا۔ قرآن کریم نے بندے اور خدا کے درمیان براہِ راست رشتہ قائم کرتے ہوئے ہر مسلمان بلکہ ہر انسان کو قرآنِ کریم کے مطالب پر غور وفکر اور تدبر کی دعوت دی۔ لیکن روایت نے اس براہِ راست تعلق کو خدشے کا دروازہ سمجھ کر اسے بند کرنے کے لیے قرآن کے مطالعے میں روایت کی پابندی لازمی قرار دے دی۔ خطرہ تھا کہ براہِ راست مطالعہ قاری کو اغراض اور نفسانی خواہشات کی پیروی کی طرف لے جائے گا۔ چنانچہ قرآن فہمی کی صحت کو جانچنے کے لیے روایت کو ہی معیار قرار دے دیا گیا۔

تاریخِ اسلام کی ابتدا میں حدیث کی تحریک اُٹھی جس نے حدیث کو قرآن فہمی کی بنیاد ٹھہرایا۔ قرآن کی ایسی تفسیر جو حدیث کے عین مطابق ہو، صحیح تفسیر اور تفسیرِ ماثور کہلائی، یعنی اثر پر مبنی، لیکن اثر کی اصطلاح حدیث کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔ حدیث سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اور فعل ہے۔ لیکن اثر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے اقوال اور افعال بھی شامل ہیں۔ چنانچہ عملی طور پر اثر سے مراد وہ روایت ہے، جسے صدرِ اسلام میں اہلِ علم کی تین نسلوں کی غالب اکثریت کی حمایت حاصل ہو۔ اس طرح اثر کی اصطلاح کے حوالے سے خود حدیث بھی روایت کے معنی میں استعمال ہونے لگی۔ تفسیر ماثور اسی روایت کی پابند قرآن فہمی کو کہا گیا۔ اس کے برعکس جو تفسیر اس اصول کی پابندی نہ کرے، اسے تفسیر بالرائے کا نام دیا گیا۔ دراصل

تفسیر بالرائے اپنی مرضی کی تفسیر نہیں تھی، بلکہ تاریخی اور لسانی سیاق و سباق پر مکمل غور وفکر کے بعد کسی نتیجے پر پہنچنے کا نام تھا۔ لیکن تحریک حدیث کے پس منظر میں تفسیر بالرائے ذاتی خواہشات کی پیروی ٹھہری اور قابلِ مذمت قرار دی گئی۔ قرآن فہمی کو محمود اور مذموم کے خانوں میں تقسیم کرنے کا رجحان تحریکِ حدیث کے بعد اور بھی شدید ہوتا گیا۔ بعد میں فقہی مذاہب، کلامی فرقوں اور صوفی مسالک کی بنیادوں پر قرآن فہمی کو صحیح یا غلط سمجھا جانے لگا۔ یوں صحیح اور غلط کا معیار قرآن سے زیادہ روایت بنتی گئی۔ دورِ جدید میں احیا کی تحریکوں نے روایت اور تقلید کی اس گرفت کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کی تو عوام میں قرآن خوانی اور قرآن فہمی کے رجحانات نے زور پکڑا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں پوری اسلامی دُنیا میں مسجدوں اور گھروں میں درسِ قرآن کی مجالس عام ہو گئیں۔ ان مجالس نے ایسے علما کو ابھرنے کا موقع دیا، جنہوں نے روایتی دینی مدارس میں تعلیم نہیں پائی تھی، لیکن قرآن فہمی کی تحریک اور قرآن کے اپنے خصوصی اسلوب کی بنا پر عوام کی نگاہ میں علما کا رتبہ حاصل کر لیا۔ ان میں برصغیر میں مولانا ابوالکلام آزاد، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، علامہ غلام احمد پرویز اور عبدالماجد دریابادی کے نام بطور مثال لیے جا سکتے ہیں۔

احیائی تحریکوں نے پورے عالمِ اسلام میں قرآن فہمی اور بالخصوص قرآن کی قرآن سے تفسیر کے رجحان کو رواج دیا۔ جدید تفسیریں عربی زبان کے قواعد اور معانی کی بجائے اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر توجہ دینے لگیں۔ مصر میں مفتی عبدہ (م ۱۹۰۵ء) اور رشید رضا (م ۱۹۳۵ء) کی تفسیر المنار نے تفسیر کے اس جدید اسلوب کی مقبولیت میں اضافہ کیا کہ قرآن کو مجموعی طور پر اس کے تاریخی سیاق میں سمجھنا ضروری ہے۔ قرآنی آیات کو ایک دوسرے سے الگ رکھ کر نہیں پڑھا جا سکتا۔ علامہ جوہری طنطاوی (م ۱۹۴۰ء) کی تفسیر الجواہر نے قرآن کے سائنسی رموز کو تفسیر کا موضوع بنایا۔ شیخ محمود شلتوت کی تفسیر من ھدی القرآن میں اہتمام کیا گیا کہ ہر آیت کی تفسیر کی جگہ ہر سورت کے اہم موضوعات اور احکام کی تفسیر بیان کی جائے۔ دورِ جدید میں تفسیریں اتنی بڑی تعداد میں لکھی گئی ہیں کہ ان کی فہرست تو ایک طرف، ان تمام رجحانات کا سرسری احاطہ بھی ممکن نہیں۔ ان رجحانات میں سے ہم ایک کا ذکر ضرور کریں گے۔ یہ تھا قرآن

کی قرآن سے تفسیر کا اصول۔ یہ رجحان دورِ جدید میں زیادہ مقبول ضرور ہوا، لیکن اس کا سہرا امام ابن تیمیہ کے سر ہے، جنھوں نے القرآن یفسر بعضہ بعضا کے اصول پر زور دیا۔ مصر میں عائشہ بنت الشاطی نے اسی اصول کی بنیاد پر التفسیر البیانی للقرآن الکریم لکھی، جس میں بعض منتخب سورتوں کی تفسیر خود قرآن کریم کی آیات سے ہی پیش کی۔ ان جدید تفسیروں نے قرآن فہمی کو نئے افق فراہم کیے۔ اب تفسیر محض لغوی مباحث اور فقہی احکام تک محدود نہیں رہی، بلکہ قرآن فہمی کے لیے تاریخی اور معنوی سیاق کا سمجھنا ضروری ٹھہرا۔ اس ضمن میں مصری دانشور اور عالمِ دین نصر حامد ابوزید کی کتاب مفہوم النص، دراسۃ فی علوم القرآن خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہر دور کا ایک اپنا ادبی ذوق اور معنوی دائرہ فہم ہوتا ہے، جس میں لوگ ادبی عبارات کو پڑھتے اور سمجھتے رہے۔ قرآن فہمی کا بھی یہی معاملہ ہے۔

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، برصغیر میں شاہ ولی اللہ نے قرآن کریم کے فارسی ترجمے اور اصول تفسیر کے ذریعے قرآن فہمی کو روایت کی پابندی سے آزاد کیا۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے ولی اللہی فکر کو آگے بڑھایا اور بیرونِ ملک قیام کے دوران اسلامی دُنیا کے دوسرے علماء کو اس طرزِ فکر سے روشناس کرایا۔ ان میں روس کے مسلمان رہنما علامہ موسیٰ جار اللہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ علامہ جار اللہ چونکہ مصنف کتاب پروفیسر ازتسو کے استاد بھی ہیں، اس لیے ان کا قدرے تفصیلی تعارف پیش ہے۔

وسطی ایشیا اور روس کے مسلمانوں میں احیا اور تجدد کی تحریک میں علامہ موسیٰ جار اللہ (۱۸۷۵ء-۱۹۴۹ء)[۱] کا کام بہت نمایاں ہے۔ ان کا تعلق روس کے شہر روستوف سے

[۱] ڈاکٹر ریاض الحسن نے لکھا ہے: ''موسیٰ جار اللہ تقریباً ایک ہفتہ کلکتہ میں ٹھہرے اور ان ایام میں میں ان سے ہر روز جا کر ملتا تھا۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ ''آپ کے خیال میں قرآن کا کوئی فلسفہ بھی ہے، اگر ہے تو اس کی کیا صورت ہے؟'' کہنے لگے، ''بے شک قرآن کا ایک نظامِ فکر ہے، جہاں (قرآن میں) اوامر و نواہی موجود ہیں، وہاں زندگی کا ایک مربوط نظام بھی ہے اور اس کی بنیاد ایمان بالغیب پر ہے۔ یہیں سے سب کلّے پھوٹتے ہیں، جن میں عبادات اور معاملات کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر ایمان بالغیب نہ ہو تو انسان کو راہ راست پر لانے والی اور

(باقی اگلے صفحے پر)

تھا۔ دینی تعلیم استنبول اور قاہرہ میں حاصل کی۔ مصر میں مفتی عبدہ سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ جدید قانون میں اعلیٰ تعلیم سینٹ پیٹرز برگ کی یونیورسٹی میں مکمل کی۔ ۱۹۰۴ء سے روسی مسلمانوں میں سیاسی بیداری اور تعلیم کے فروغ کے لیے کام کرنے لگے۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں اشتراکی انقلاب برپا ہوا تو علامہ لینن گراڈ میں مسلمانوں کے سرکردہ رہنما تھے اور لینن کے بہت قریب۔ انھی دنوں ۱۹۲۳ء میں ریشمی رومال کی تحریک کے سلسلے میں مولانا عبیداللہ سندھی کابل سے ماسکو پہنچے تو علامہ جار اللہ سے ملاقات ہوئی۔ پیٹرز برگ میں مولانا علامہ کے گھر مہمان رہے۔ اس زمانے میں علامہ جار اللہ کے اشتراکی رہنماؤں سے اختلاف شروع ہو چکے تھے۔ علامہ اشتراکیت کے ساتھ ساتھ اسلامی تشخص اور مسلمانوں کی دینی اور ثقافتی خود مختاری کے قائل تھے۔ اشتراکی حکومت اسے پان اسلامزم قرار دیتی تھی۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۰ء کے درمیان کئی بار گرفتار ہوئے، جیل گئے اور جلا وطن ہوئے۔ خیالات کی ہم آہنگی کی وجہ سے مولانا سندھی اور علامہ جار اللہ کی دوستی اور گہری ہوگئی۔ ۱۹۳۰ء میں روس میں علامہ جار اللہ کا رہنا ناممکن ہوگیا تو وہ ہجرت کر کے افغانستان آ گئے۔ یہاں سے وہ ۱۹۳۵ء میں برصغیر میں بھی آئے۔ حجاز، جاپان اور چین بھی گئے۔ ادھر مولانا سندھی بھی اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ہندوستان سے باہر کبھی افغانستان اور کبھی حجاز میں مقیم رہے تو اس دوران دونوں حضرات میں ملاقاتیں جاری رہیں۔

مولانا سندھی ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۹ء کے دورانِ حرم شریف میں مقیم تھے۔ موسیٰ جار اللہ حجاز آئے تو مولانا سے تفصیلی رابطہ رہا۔ انھی دنوں میں موتمر عالمی اسلامی کے اجلاس میں ۱۹۳۱ء میں بیت المقدس میں موسیٰ جار اللہ کی علامہ اقبال سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس زمانے میں مولانا سندھی نے علامہ جار اللہ کو شاہ ولی اللہ کی فکر سے متعارف

(گذشتہ سے پیوستہ)

کوئی چیز نہیں۔" پھر اس کی انھوں نے واقعات کی بنا پر ایک لمبی تشریح کی۔ میں نے آخر میں پوچھا کہ "آپ کے خیال میں قرآن کے فکری نظام کو سمجھنے والا ہندوستان میں کوئی عالم ہے؟" تو انھوں نے مولانا ابوالکلام کا نام لیا۔" (المعارف، جنوری-جون ۲۰۰۳ء، ص ۲۰) (ایڈیٹر)

کرایا۔ مولانا نے اپنی تفسیر الہام الرحمان علامہ کو املا کرائی جو شاہ صاحب کے انداز سے لکھی گئی تھی۔

موسیٰ جار اللہ خود بھی قرآنی علوم پر کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں سے تاریخ القرآن و المصاحف، فقہ القرآن الکریم اور حروف اوائل السور شائع ہو چکی ہیں۔ علامہ نے روایتی طرزِ تفسیر پر جو تنقید کی، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی قرآن فہمی کا اسلوب شاہ ولی اللہ اور مولانا سندھی سے کتنا قریب تھا۔ ہم ذیل میں ان کی تحریر سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں:

> ''مفسرین تفسیر قرآن میں اپنا اپنا اسلوب اپناتے ہیں اور تشریح و استدلال کتبِ اصول سے اخذ کرتے ہیں۔ وہ قرآنِ کریم کے معانی کو عربی زبان اور روایت کے دو جہتی ڈھانچے میں محدود رکھتے ہیں۔ فکر و تدبر سے مزید معانی معلوم ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ اس سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ آیاتِ احکام سے شرعی اوامر کے علاوہ انسانی زندگی کے اصول و قواعد بھی اخذ کیے جا سکتے ہیں، دین کی تشریح میں عموم، خصوص، عبارت، اشارہ، محکم اور مجمل کے طریقِ استدلال کے ذریعے عبارتی نظم کی تلاش تو کرتے ہیں، لیکن انسانی زندگی میں مطلوب ان احکام کی اہمیت اور اثرات پر غور نہیں کرتے۔ فکرِ اسلامی کے جمود کی اور ترقی نہ کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔ (مقدمہ الموافقات)

علامہ جار اللہ حجاز سے ہندوستان تشریف لائے۔ یہاں سے چین اور جاپان بھی گئے۔ جاپان میں قیام کے دوران زیرِ نظر کتاب کے مصنف توشی ہیکو ازتسو سے ملاقات ہوئی۔ ازتسو ٹوکیو یونیورسٹی میں ادبیات کے استاد تھے۔ علوم شرقیہ میں دلچسپی تو تھی ہی، علامہ سے ملاقات کے بعد عربی زبان میں شغف میں اضافہ ہو گیا۔ علامہ نے عربی زبان کی متداول کتابوں سے متعارف کرایا۔ علامہ کے ذریعے قرآنِ کریم کے مطالعے کا شوق بھی بڑھا۔ علامہ جاپان اور چین کے بعد پھر ہندوستان آئے تو دوسری

عالمی جنگ شروع ہوگئی۔ حکومتِ برطانیہ نے علامہ کی سرگرمیوں کو مشکوک قرار دے کر پشاور میں قید کر دیا۔ نواب بھوپال کی کوششوں سے ڈیڑھ سال بعد رہائی پائی تو بھوپال چلے گئے۔ ۱۹۴۷ء میں ترکی گئے تو ان کا پُرزور استقبال ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں قاہرہ میں وفات پائی۔

اس تفصیل سے یہ بتانا مقصود تھا کہ دورِ جدید میں عالمِ اسلام میں مطالعۂ قرآن کو جو مرکزی اہمیت حاصل ہوئی، اس نے مختلف ملکوں کے ہم خیال علما میں رابطے بڑھائے۔ ان کوششوں میں برصغیر بہت اہم کڑی تھی۔ قرآن فہمی کی اس تحریک کا بنیادی اصول یہ تھا کہ قرآنِ کریم کو الگ الگ ٹکڑوں کی بجائے کل کی حیثیت سے پڑھا جائے۔ قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے۔ قرآن فہمی میں روایت کی پابندی کی وجہ سے قرآن کے معانی اس دور کی قرآن فہمی میں محدود ہو کر رہ جاتے ہیں، جس میں وہ روایت تشکیل پاتی ہے۔ اس طرزِ فکر کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ روایت ان معانی کو اصل معانی کا درجہ دیتی ہے اور عقیدے کی حد تک یہ تقاضا کرتی ہے کہ عہدِ نبوی اور عہدِ صحابہ میں بھی یہی معنی لیے جاتے تھے۔ اس کی ایک مثال مسلم اور مومن اور مسلم اور کافر کے معانی کا تعین ہے۔ قرآن کریم میں بھی مسلم اور مومن کو ایمان کے دو مدارج کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مسلم اور کافر میں فرق بیان کرتے ہوئے قرآنِ کریم نے کافر کی بنیادی خرابی یہ بتائی کہ کافر خدا کا شکرگزار نہیں ہوتا، وہ اللہ تعالیٰ کے بے پایاں احسانات کا انکار کر کے کفرانِ نعمت کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں مسلم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر لحہ اللہ تعالیٰ کا احسان مند اور شکرگزار رہتا ہے۔ اسی احسان مندی سے ایمان جنم لیتا ہے۔ روایت نے ان معانی کو علم الکلام اور عقائد کی باریکیوں میں دیکھا تو مسلم اور کافر کے بنیادی معنوں کی جگہ جن میں انسانی رویے اور کردار پر زور تھا، ثانوی معنی پر زور دیتے ہوئے کفر کو عقیدہ اور کلام کا موضوع بنا دیا۔ کافر کا مطلب بے ایمان اور بے دین قرار دیا، بلکہ ہر وہ شخص جو مسلمان نہ ہو کافر کہلایا۔ یہ روایتی معنی غلط نہیں، لیکن اس کی وجہ سے کفر کا ناشکرے پن کا مفہوم کلی طور پر اوجھل ہو گیا۔

پروفیسر ازتسو نے قرآنِ کریم کا مطالعہ کیا تو اس میں قرآنی الفاظ کے معانی

کے لیے قرآنی الفاظ سے ہی مدد لی۔ ان کے نزدیک قرآن فہمی کے لیے بنیادی اصول یہ ہے کہ جہاں تک ان قرآنی الفاظ کا تعلق ہے، جو اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے لیے قرآن سے باہر کے مصادر پر انحصار صحیح نہیں اور یہ کہ اس کے لیے قرآن کے ذخیرۂ الفاظ کو ہی مصدر سمجھا جائے۔ اس میں قدیم لغات یا قدیم عرب شاعری سے سیاق و سباق کے سمجھنے میں تو مدد لی جا سکتی ہے، لیکن ان پر مکمل انحصار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ قرآن کریم نے عرب اقدار کو نئے معانی دیے۔ پروفیسر ازتسو کا طریقہ یہ ہے کہ کسی ایک لفظ کو لے کر قرآن کریم میں ایسی تمام آیات کا مطالعہ کیا جائے جن میں وہ لفظ اور اس کے مشتقات استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے بعد مزید آیات کو تلاش کیا جائے، جن میں ان الفاظ کے ہم معنی یا متضاد الفاظ استعمال ہوئے ہوں۔ اسی طرح ایسی قرآنی آیات بھی تلاش کی جائیں، جہاں اس لفظ کی تفصیلی تعریف یا بیان مل جائے۔ اس مطالعہ میں چند آیت کا انتخاب نہ کیا جائے، نہ ہی ان آیات تک محدود رہا جائے، جن سے وہ معانی ثابت ہوتے ہوں، جو محقق کو مطلوب ہیں۔ اس ذخیرہ اور ان کے معانی کے تجزیہ کی بنیاد پر اس لفظ کا معنویاتی ڈھانچہ سامنے آ جاتا ہے۔ اس ڈھانچے میں صرف ایک ہم معنی یا ایک متضاد لفظ پر انحصار نہیں ہوتا، بلکہ قرآن کی تمام آیات کا احاطہ ہوتا ہے۔ معنی تخریج کی بجائے استقرا کی بنیاد پر اخذ کیے جاتے ہیں۔ یہ ان طریقوں سے یقینی طور پر بہتر ہے جو محض ایسی چند گنی چنی آیات پر انحصار کرتے ہیں جن سے مطلوبہ مقصد حاصل ہو جائے۔ مختصراً یہ ہے وہ معنویاتی طریقِ مطالعہ جو پروفیسر ازتسو نے اس کتاب میں اختیار کیا ہے۔ اس کتاب کو قرآن فہمی کی ان کوششوں کی ایک کڑی سمجھا جا سکتا، جن کا اوپر ذکر ہوا۔ اس کتاب نے مسلم دنیا کے ساتھ جاپان میں بھی قرآن کے مطالعے کو فروغ دیا۔ اس کی تفصیل پروفیسر ازتسو کے حالاتِ زندگی سے پتہ چلتی ہے جس کا مختصر ذکر ذیل میں درج ہے۔

توشی ہیکو ازتسو ۴؍مئی ۱۹۱۴ء کو ٹوکیو جاپان میں پیدا ہوئے۔ اور ۷؍جنوری ۱۹۹۳ء کو کاما کورا میں وفات پائی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۳۷ء میں کائیو یونیورسٹی کے شعبہ ادبیات میں ریسرچ فیلو مقرر ہوئے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، انہی دنوں میں ان

کی ملاقات علامہ موسیٰ جار اللہ سے ہوئی اور انہوں نے اسلام، عربی زبان اور قرآن کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا۔ اس وقت جاپان میں ان موضوعات میں علمی دلچسپی رکھنے والے اہل علم کی تعداد بہت کم تھی۔ انہوں نے بہت جلد اس میدان میں اپنا مقام بنا لیا اور ۱۹۴۹ء میں عربی، یونانی اور دیگر قدیم زبانوں کی تدریس کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ ۱۹۵۴ء میں ادارہ لسانیات میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۹ء کے دوران قرآن کریم کا جاپانی زبان میں ترجمہ مکمل کیا اور زیر نظر کتاب لکھی۔ ۱۹۶۰ء میں کائیو یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۶۲ء میں کینیڈا میں میکگل یونیورسٹی نے پروفیسر کی حیثیت سے درس و تدریس کے لیے دعوت دی۔ مترجم کو یہیں ان سے شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ ۱۹۷۵ء میں پروفیسر ازتسو کینیڈا سے ایران چلے گئے، جہاں فلسفہ کے ادارے سے وابستہ رہے۔ ۱۹۷۹ء میں جاپان واپس چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔

پروفیسر ازتسو زندگی بھر بہت سے علمی اداروں سے وابستہ رہے، جن میں کائیو یونیورسٹی جاپان، تہران یونیورسٹی ایران، عربی اکاڈیمی مصر اور بین الاقوامی ادارہ برائے فلسفہ فرانس کا نام بطور مثال لیا جا سکتا ہے۔

تصانیف:

پروفیسر ازتسو کی مختلف موضوعات پر تصانیف کی تعداد دو سو کے قریب ہے۔ ان کی اکثر کتابوں کے یورپی اور دوسری زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۳ء کے دوران ان کی تصانیف کا انتخاب بارہ جلدوں میں ٹوکیو سے شائع ہوا۔ ہم یہاں ان کی صرف ان کتابوں کا ذکر کریں گے، جن کا اسلامی علوم سے تعلق ہے۔ ہم ذیل میں کتابوں کے عنوانات کا اُردو ترجمہ درج کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اشاعت کی تاریخ کا ذکر ہے۔

جاپانی زبان میں ان کی چند کتابوں کے عنوان یوں ہیں:

۱۔ عرب فلسفہ کی تاریخ (۱۹۴۱ء)
۲۔ مشرقی ہندوستان میں فقۂ اسلامی کی تاریخ (۱۹۴۲ء)
۳۔ عربی زبان کی مبادیات (۱۹۴۹ء)
۴۔ حضرت محمد ﷺ (۱۹۵۹ء)
۵۔ افکار اسلامی کی تاریخ (۱۹۷۵ء)
۶۔ ظہور اسلام (۱۹۷۹ء)
۷۔ اسلامی ثقافت کی مبادیات (۱۹۸۱ء)
۸۔ فلسفۂ اسلامی کے مصادر (۱۹۸۲ء)
۹۔ مطالعۂ قرآن (۱۹۸۳ء)
۱۰۔ اسلامی اور یہودی روایاتِ فلسفہ میں انسان اور خدا (۱۹۹۱ء)

انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں میں اسلام سے متعلق ان کی چند تصانیف کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ قرآنِ کریم میں اخلاقی اصطلاحات کا معنویاتی مطالعہ (۱۹۵۹ء)
(اس کتاب کا ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔)
۲۔ وحی کے تصور کا لغوی تجزیہ (۱۹۶۲ء)
۳۔ اسلامی علم الکلام میں ایمان کا تصور (۱۹۶۵ء)
۴۔ تصوف اور تاؤمت کا تقابلی مطالعہ: ابن عربی اور لاؤتسے (۱۹۶۷ء)
۵۔ اسلام میں مابعد الطبیعیاتی فکر کا بنیادی ڈھانچہ (۱۹۷۱ء)
۶۔ نظریہ وحدت الوجود کا تجزیہ: فلاسفۂ مشرق کا مابعد الفلسفہ فکر
۷۔ اسلامی مابعد الطبیعیات میں ماہیت وجود اور کلیاتِ فطرت کا سلسلہ (۱۹۷۴ء)
۸۔ اسلامی تصوف اور زین بدھ مت میں تخلیقِ پیہم کا تصور (۱۹۷۷ء)
۹۔ میر داماد اور ان کا فلسفہ مابعد الطبیعیات (۱۹۷۷ء)
۱۰۔ تصوفِ اسلامی میں تجلیاتِ خودی کا مسئلہ: نجم الدین کبری اور صوفی

نفسیات (۱۹۷۸ء)

۱۱۔ قرآن میں انسان اور خدا: قرآنی تصورِ کائنات کا معنویاتی مطالعہ (۱۹۸۰ء)

۱۲۔ اسلامی تصوف میں وحدتِ وجود اور تخلیق پیہم (۱۹۸۰ء)

۱۳۔ حکیم سبزواری کے مابعد الطبیعیات (۱۹۹۰ء)

پروفیسر ازتسو نے اسلامی موضوعات پر خود بھی لکھا اور مسا کا تا کے شیتا کے بقول جاپان میں اسلام کے بارے میں علمی تحقیق کی روایت کا آغاز بھی اُنہوں نے ہی کیا۔ ان کی علمی حیثیت جاپان میں ہی نہیں بلکہ ساری علمی دُنیا میں تسلیم کی جاتی ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت تمام تر جاپان میں ہوئی، لیکن اپنی علمی تصنیفات کے لیے اُنہوں نے زیادہ تر انگریزی زبان کو اختیار کیا۔ چنانچہ وہ جاپان سے زیادہ باہر کے ممالک میں معروف رہے۔ تاہم جاپان میں بھی علومِ اسلامی کی پیشرفت میں ان کا اور ان کے شاگردوں کا کردار بہت نمایاں ہے۔ جاپان میں علومِ اسلامی کے مراکز حال ہی میں قائم ہوئے۔ عرصہ دراز تک جاپانی طلبہ اسلامیات کی تعلیم کے لیے زیادہ تر مصر اور ایران یا مغربی جامعات میں جاتے تھے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں جاپان میں مراکز قائم ہونے لگے۔ ۱۹۸۲ء میں ٹوکیو یونیورسٹی میں شعبہ علومِ اسلامیہ اور ۱۹۸۷ء میں انٹرنیشنل یونیورسٹی آف جاپان میں ادارہ مطالعات مشرقِ وسطٰی قائم ہوئے۔ ادارہ مطالعات مشرقِ وسطٰی کے سربراہ توشیو کورودا پروفیسر ازتسو کے شاگرد ہیں۔ یہ ادارے علمی اور تحقیقی مجلّات بھی شائع کر رہے ہیں۔

جاپانی علما کی تصنیفات کے موضوعات میں ہمعصر سیاسی حالات کے علاوہ اسلامی فلسفہ، تصوف اور قرآنی علوم بھی شامل ہیں۔ کوجی رونا کامورا، شی گیرو کا مادا اور آکیرو ماتسوموتو نے غزالی، ملا صدرا، علامہ قزوینی، روزبہان بقلی، دیلمی اور ابنِ عربی کے افکار پر تحقیقات شائع کی ہیں۔ ان میں کان کا گایا کی کتاب قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگی جس میں اُنہوں نے شاہ ولی اللہ کی کتاب ہمعات کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ علومِ اسلامی میں قرآن اور عرفان کے موضوعات پر تصنیفات میں پروفیسر ازتسو کا اثر

بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ قرآنِ کریم کے جاپانی تراجم میں پروفیسر ازتسو کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ لیکن مطالعہ قرآن کا جو مخصوص طریقہ کار انہوں نے پیش کیا، اس کی جھلک ان کے شاگرد شینا ماکینو کی کتاب تخلیق اور ہلاکت میں دکھائی دیتی ہے۔ اس موضوع پر قرآنی اصطلاحات کے تجزیے میں ماکینو نے ازتسو کا طریقِ کار اختیار کیا ہے۔ اسی طریقِ کار کو بنیاد بنا کر یوشیکو اودا نے قرآنِ کریم میں تقویٰ کے تصور کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ جاپان میں پروفیسر ازتسو کے جاپانی تلامذہ میں شینا ماکینو (ٹوکیو یونیورسٹی)، توشیو کورودا (انٹرنیشنل یونیورسٹی آف جاپان)، اور ہیتو شیا گراراشی (توسکوبایو یونیورسٹی) کے نام نمایاں ہیں۔ شنیاما کینو کا حدیث کے شعبے میں نمایاں کارنامہ صحیح بخاری کا جاپانی زبان میں ترجمہ ہے۔

اس کتاب کے ترجمے میں بہت سے مسائل پیش آئے جن کا ذکر ضروری ہے۔ اُردو زبان کا اپنا مخصوص مزاج ہے جو لمبے اور پیچیدہ جملوں کا متحمل نہیں۔ ہم نے جہاں ممکن ہو سکا، انگریزی کے پیچیدہ جملوں کو اُردو میں ترجمہ کرتے وقت ایک سے زیادہ سادہ جملوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ دوسرا بڑا مسئلہ نقل حرفی کا ہے۔ انگریزی یا غیراُردو ناموں کو اُردو میں کیسے لکھا جائے۔ ہم نے یہ التزام کیا ہے کہ کتابوں کے عنوانات کا اُردو ترجمہ دے دیا ہے اور جہاں ضروری تھا۔ وہاں انگریزی حروف میں کتابوں کے عنوانات حواشی میں درج کر دیے ہیں۔ یورپی مصنّفین کے ناموں کا مسئلہ مختلف ہے۔ کتابوں کے عنوانات کی طرح ان کا اُردو ترجمہ تو نہیں دیا جا سکتا۔ ہم نے تلفظ کی بنیاد پر ان کے نام اُردو حروف میں دے کر اصل نام حواشی میں درج کر دیے ہیں۔ اسی طرح اُردو کے برعکس انگریزی زبان میں تعظیمی الفاظ بہت کم استعمال ہوتے ہیں۔ ہم نے اُردو ترجمہ میں قرآنِ کریم اور حضرت محمد صلعم کو اختیار کیا ہے۔ اصل کتاب میں قرآنی آیات، احادیث، عربی اشعار اور عبارات کا انگریزی ترجمہ دیا گیا تھا۔ ہم نے قرآنی آیات اور احادیث کا اصل عربی متن دیا ہے۔ جہاں تک ہو سکا، تلاش کر کے عربی اشعار اور عبارات کا اصل عربی متن ترجمے میں شامل کیا ہے۔ اس تلاش میں اکثر مصنف کے ذکر کردہ مصادر کا حصول ممکن نہیں تھا۔ ایسی صورت میں ہم نے حواشی میں اپنے مصادر کا

حوالہ دے دیا ہے۔ آخر میں کائیو یونیورسٹی اور میکگل یونیورسٹی کا شکریہ ادا کرنا ہے جو اس کتاب کے ناشرین ہیں۔ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ ان کے تعاون کے بغیر یہ کام ممکن نہیں تھا۔

محمد خالد مسعود

اسلام آباد

دیباچۂ مصنف

موجودہ کتاب پہلے ۱۹۵۹ء میں ٹوکیو میں کائیو یونیورسٹی سے ''قرآن میں اخلاقی اقدار کے ڈھانچے'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ اب یہ نظر ثانی کے بعد پیش کی جا رہی ہے۔ اس عرصے میں میری سوچ میں جو تبدیلیاں آئی ہیں، اُن کے پیشِ نظر کتاب میں مجموعی طور پر اور چند مقامات پر خاص طور پر نظر ثانی بے حد ضروری تھی۔ نظر ثانی کے دوران میری کوشش رہی ہے کہ میں اپنی موجودہ سوچ کو زیادہ تسلی بخش طریقے سے پیش کر سکوں۔ چنانچہ بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور بہت سی ایسی باتیں جنھیں میں اب غیر اہم سمجھتا ہوں، حذف کر دی گئی ہیں۔ کئی جگہ مباحث کو نئے سرے سے لکھا گیا ہے۔ الغرض کتاب میں اتنی تبدیلیاں آئی ہیں کہ موجودہ کتاب کو نئی کتاب کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ اگرچہ موجودہ کتاب کا مواد اکثر و بیشتر پہلی کتاب کا ہی ہے۔

کتاب کا عنوان بھی بدل دیا گیا ہے تاکہ قاری کو یہ مغالطہ نہ رہے کہ یہ کتاب قرآن میں مذکور اخلاقی اقدار سے بحث کرتی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ اخلاقی مفاہیم پر مشتمل قرآنی اصطلاحات کو دو اہم قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم میں وہ مفاہیم ہیں جو مسلمانوں کی بطور امتِ اسلامیہ اخلاقی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری قسم کے مفاہیم انسان کی اس بنیادی فطرت کی گہرائیوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن سے انسان کا دینی وجود تشکیل پاتا ہے۔ یہ مفاہیم وہ روحانی خصائص ہیں، جو انسانی مزاج کی قرآنی تعریف کے مطابق انسان کے دینی وجود کے اظہار کے لیے لازمی ہیں۔ اسلام جو اصلاً اخلاقی مذہب ہے، اس بات کا متقاضی ہے کہ یہ انسانی خصوصیات بیک

وقت اخلاقی بھی ہوں اور دینی بھی۔ اور اس ضمن میں ان میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔

موجودہ کتاب اخلاقی اصطلاحات کی صرف دوسری قسم سے بحث کرتی ہے۔ پہلی قسم کی اصطلاحات کا بہت کم ذکر ہے اور وہ بھی استثنائی مثالوں کے طور پر۔

اب کچھ باتیں کتاب کے نظریاتی پہلو کے بارے میں۔ کتاب کے گذشتہ ایڈیشن میں زبان کے اخلاقی پہلو سے متعلق جدید نظریات کے بارے میں نظری اور اصولی بحث پر بہت زیادہ توجہ دی گئی تھی۔ پوری کتاب میں جابجا مناہجِ تحقیق کے اصول اور ملاحظات سے بحث کی گئی تھی۔ موجودہ کتاب میں اُن نظری بحثوں کی جگہ علمِ لسانیات کے زیادہ بنیادی نظریات اور علمِ معنویات کے اس تصورِ کائنات پر بحث شامل کی گئی ہے، جن کا موجودہ تجزیاتی مطالعے سے براہِ راست تعلق ہے۔ اس تجزیے کے رہنما اصولوں کا ذکر مقدمے میں کر دیا گیا ہے۔

موجودہ مطالعہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں معنویاتی تجزیے کے طریقِ کار کے بنیادی اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں قبل از اسلام اخلاقی ضابطے اور اسلامی اخلاقیات اور اس ضمن میں بالخصوص قرآنی اخلاقیات کے مابین جو ایجابی وسلبی رشتے موجود ہیں، اُن کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں تحقیقی منہج کے اُن اصولوں کی روشنی میں جن کی تفصیل پہلے حصے میں دی گئی ہے، قرآنِ کریم میں مذکور اہم دینی اخلاقی اقدار کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔☆

اس نظرِ ثانی کی تحریک ڈاکٹر چارلس جے ایڈمز کی طرف سے ہوئی تھی، جو میکگل یونیورسٹی میں انسٹیٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز کے ڈائریکٹر ہیں۔ اوّل تا آخر اُنھوں نے اس کام میں عملی دلچسپی لی۔ ان کی اس مستقل معاونت، ہمدردی اور حوصلہ افزائی کے بغیر یہ کام اپنی موجودہ صورت میں کبھی تکمیل نہ پا سکتا۔ میں اس موقع کی

☆ یہاں مصنف نے عربی حروف کے انگریزی میں نقل حرفی اور قرآنی آیات کے حوالوں اور قرآنِ کریم کے انگریزی ترجمے کے بارے میں کتاب میں اپنائے طریق کار کی وضاحت کی ہے۔ چونکہ اُردو میں ترجمے سے ان مسائل کا براہِ راست تعلق نہیں ہے اور اس ترجمے میں ان مسائل کی نوعیت بالکل مختلف ہے، اس لیے یہ پیرا حذف کر دیا گیا ہے۔ [ایڈیٹر]

مناسبت سے بڑے خلوص کے ساتھ اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اس ضمن میں دو اور اشخاص کا ذکر بھی ضروری ہے، جن کا میں اتنا ہی احسان مند ہوں۔ ان میں ایک ولیم جے واٹسن ہیں جو اُس وقت ادارے کے چیف لائبریرین تھے، جنھوں نے ازراہِ کرم مسودہ مکمل ہونے پر اس کو بغور پڑھا اور بیش قیمت مشوروں سے نوازا۔ دوسرے میکگل یونیورسٹی پریس کی مارگری تھمپسن ہیں، جنھوں نے مسودے کی تصحیح کی، ان کی بے حد مفید آراء کی روشنی میں میں نے مسودے کے کئی حصوں پر نظرثانی کی ہے۔ میں ڈیوڈ ایڈ کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا، جنھوں نے پروف خوانی اور اشاریے کی تیاری میں مدد کی۔

آخر میں بے حد مسرت کے ساتھ میں پروفیسر نویوہیرو ماتسوموتو کو ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔ موصوف کائیو یونیورسٹی میں انسٹیٹیوٹ آف کلچرل اینڈ لنگویسٹک سٹڈیز کے ڈائریکٹر ہیں۔ میں بے حد ممنون ہوں کہ اُنہوں نے اس نظرثانی شدہ ایڈیشن کی اشاعت کی اجازت مرحمت فرمائی۔ کتاب کا اصل ایڈیشن انہی کے تعاون سے جاپان میں لکھا گیا تھا اور وہیں سے شائع بھی ہوا تھا۔

توشی ہیکو ازتسو

معنویاتی تجزیے
کے
اصول وقواعد

زبان اور ثقافت

قرآنِ کریم میں دینی اخلاقی تصورات کے موضوع کا مطالعہ کئی مختلف طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔ ہم فقۂ اسلامی کے تفصیلی احکام سے بھی شروع کر سکتے ہیں جو بعد کے ادوار میں انسانی اعمال کے سارے پہلوؤں کا نہایت باریک بینی سے احاطہ کرنے لگے تھے۔ لیکن یہ مطالعہ بھی ہمیں واپس قرآنِ کریم کی طرف لے جاتا ہے، کیونکہ ان تمام اوامر ونواہی کا اصل مرجع قرآنِ کریم ہی ہے۔ ہم علمِ کلام کے مباحث سے بھی ابتدا کر سکتے ہیں، جو فقہ سے کسی طرح کم منظم نہیں، لیکن یہاں بھی ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ علمِ کلام دراصل اس نظری بحث کا نام ہے، جو اس سوال کو لے کر چلتی ہے کہ ایک سچے مومن کا عقیدہ کیا ہونا چاہیے؟ اور اسے کن باتوں پر ایمان لانا چاہیے؟ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس کا رویّہ کیا ہو؟ اور اپنے ان عقائد پر وہ کیسے عمل بجا لائے؟ تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہم اخلاق کے بارے میں قرآنِ کریم کی ساری تعلیمات اور بیانات کا تفصیل سے جائزہ لے کر اُن کو ایک باقاعدہ ترتیب سے یکجا کریں اور اُن سے 'قرآنی اخلاقیات' پر ایک کتاب مرتب کریں۔

زیرِ نظر کتاب میں ہمارا طریقہ مندرجہ بالا اور ان سے ملتی جلتی تمام کوششوں سے مختلف ہے۔ اس اختلاف کی بنیاد ہمارا تجزیاتی طریقہ ہے، جس کی رُو سے ہم قرآنی تعلیمات کا مطالعہ کریں گے۔ یہ طریقہ قرآنی تصورات کی تعبیر اور تفسیر کے لیے خود قرآن پر انحصار کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ہماری تحقیق میں مواد سے زیادہ لسانی تجزیے کے طریقے کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ یہ ایک خاص نقطۂ نظر ہے جو قرآنِ کریم کے ایسے

تمام الفاظ کی معنوی ساخت کے تجزیہ پر زور دیتا ہے جو اخلاق و کردار کے بارے میں اسلامی قدریں متعین کرتے ہیں۔

ہم اس بحث کے آغاز میں ہی ایک بات پر زور دینا چاہیں گے، جو بظاہر بالکل پیش پا افتادہ لگتی ہے، لیکن بے حد اہم ہے۔ وہ یہ کہ کسی زبان کے ترجمے کے ذریعے اصل زبان کے متن کے بارے میں جو معلومات مہیا ہوتی ہیں، وہ بالواسطہ ہوتی ہیں، اور ان پر قطعی انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ ترجمے میں الفاظ اور جملے اگر اصل کے قریب بھی ہوں تو وہ زیادہ سے زیادہ جزوی مطابقت ظاہر کرتے ہیں۔ وہ ہماری اوّلین کوششوں میں عارضی رہنمائی تو کر سکتے ہیں، لیکن ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ اکثر ناکافی اور بعض صورتوں میں گمراہ کن ثابت ہوتے ہیں۔

بہرصورت کسی قوم کی اخلاقی کائنات کے تصور کی ہیئت کا تجزیہ کرنے کے لیے ترجمہ کبھی قابلِ اعتماد بنیاد فراہم نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ ابھی ذکر ہوا کہ یہ اتنی عام سی بات ہے کہ اس کی خصوصی تاکید بے وجہ لگتی ہے۔ اس اصول کی صحیح قدر و قیمت کے بارے میں اور اس پر مسلسل توجہ نہ دینے سے جو ہولناک خطرات مرتب ہوتے ہیں، اُن پر ہم آئندہ چل کر بات کریں گے۔ یہاں اتنا یاد رکھنا کافی ہے کہ جب ہم کوئی عبارت اصل زبان میں بھی پڑھ رہے ہوتے ہیں تو قطعاً لاشعوری طور پر ہم اس عبارت میں اپنے ہی تصورات پڑھنے لگتے ہیں جو ہماری مادری زبان نے ہمارے ذہن پر نقش کیے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم اس عبارت کے اگر سارے نہیں تو بہت سے کلیدی الفاظ کے مفہوم کو اپنی مادری زبان میں دستیاب ملتے جلتے تصورات میں تبدیل کر کے سمجھ رہے ہوتے ہیں۔[1] دراصل ہم اُس اصل زبان کی عبارت کو بھی ترجمے کی شکل میں پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہم درحقیقت ترجمہ شدہ تصورات سے کام لے رہے ہوتے ہیں اور ہمیں اس کا پتہ بھی نہیں ہوتا۔ اس قسم کے لاشعوری 'انتقالِ تصورات'[2] کے مضر نتائج اخلاقیات کے بارے میں حالیہ تحقیقات میں بہت واضح طور پر سامنے آئے ہیں۔ خاص طور پر اخلاقی تصورات کے مختلف نظامات کے تقابلی مطالعے کے میدان میں تو یہ اثرات بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ ماضی قریب میں 'ثقافتی بشریات'[3]

کے علم کی نشوونما میں جو حیران کن پیش رفت ہوئی ہے، اس نے اس احساس کو اور بھی تقویت دی ہے۔

کوئی بھی شخص جو ثقافت اور علومِ انسانی کے مسائل میں دلچسپی رکھتا ہے، وہ ثقافتی بشریات کی اس پیش رفت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اخلاقی موضوعات پر لکھنے والے چاہیں یا نہ چاہیں، انہیں آج اپنی ثقافتی دُنیا سے باہر ایسے اخلاقی ضابطوں سے لازماً واسطہ پڑتا ہے جو ان کی اپنی ثقافت سے قطعاً مختلف ہیں۔ انہیں ان مختلف ضابطوں کی طرف توجہ دینی پڑتی ہے، خواہ یہ توجہ ان ضابطوں کے وجود کے اعتراف کے ذکر تک ہی محدود کیوں نہ ہو۔ آج کل تقابلی اخلاقیات اور اس سے ملتی جلتی باتوں کا عام رواج ہے۔ حتیٰ کہ وہ مصنفین جو اخلاقی امور میں کسی تنوع کو حقیقی ماننے کو تیار نہیں، وہ بھی یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہ زمان و مکان کے اختلاف کے باوجود ساری دُنیا میں انسانی اخلاقیات ایک سی ہیں، دراصل ایک تقابلی ملاحظہ پیش کر رہے ہوتے ہیں۔

اس قسم کے اکثر بیانات میں غیر محتاط اور عمومی ملاحظات دراصل اخلاقی اصطلاحات کے ایسے تقابلی جائزے پر مبنی ہوتے ہیں جو درحقیقت 'انتقالِ تصورات'(۴) کے اس لاشعوری عمل سے پیدا ہوتے ہیں، جس کا اوپر ذکر ہوا۔

پروفیسر مورس کوہن(۵) نے اپنی کتاب 'دیباچۂ منطق'(۶) میں ارسطو کے 'نیک آدمی' کے تصور پر بحث کرتے ہوئے متنبہ کیا ہے کہ یونانی لفظ 'آرے تے'(۷) کو انگریزی لفظ 'ورچو'(۸) کا مترادف سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ اس نے واضح کیا کہ عموماً انگریزی لفظ ورچو (نیکی) کو بہت آسانی سے یونانی لفظ 'آرے تے' کا ہم معنی قرار دیا جاتا ہے۔ 'آرے تے' کا بہتر مفہوم 'عمدگی' ہوسکتا ہے، جو قابلِ ستائش خصوصیات کا مجموعہ ہے۔

فی الحال ہم اس بحث میں نہیں پڑیں گے کہ پروفیسر مورس کی رائے صحیح ہے یا غلط۔ گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ اگر ان تمام عبارات کا جائزہ لیں، جہاں ارسطو نے لفظ 'آرے تے' استعمال کیا ہے، اس سے یہی مطلب نکلتا ہے، جو پروفیسر مورس نے بیان کیا۔ اب فرض کر لیجیے کہ ایک شخص قدیم یونانیوں کے نیکی کے تصور پر مقالہ لکھنا چاہتا ہے۔ وہ افلاطون اور ارسطو کی کتابوں کے انگریزی ترجمے سے

ایسی تمام عبارتیں جمع کر لیتا ہے، جہاں لفظ 'ورچو'، 'آرے تے' کے ترجمے کے طور پر آیا ہے۔ یا وہ اصل متن کا مطالعہ کرتے ہوئے، جہاں جہاں لفظ 'آرے تے' آیا ہے، 'انتقالِ تصورات' کے عمل سے گزرتے ہوئے اسے لفظ 'ورچو' کے مترادف قرار دے کر یہ سارا مواد جمع کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے تحقیق کا یہ عمل نہایت خطرناک ہوگا۔ 'آرے تے' اور 'ورچو' کی غیر حقیقی مساوات کی بنیاد پر اور اس مساوات کی درستی پر ایک لمحہ شک کیے بغیر یہ شخص نیکی کے یونانی تصور کی نوعیت پر جو بحث کرے گا وہ بے معنی ہوگی۔ یا پھر وہ یونانیوں اور انگریزوں کے مابین نیکی کی اصل حقیقت کی غیر حقیقی بحث میں الجھ جائے گا۔ وہ انگریزی لفظ 'ورچو' کے معنویاتی عناصر کو خواہ مخواہ اور لاشعوری طور پر یونانی لفظ 'آرے تے' سے منسوب کرنے لگے گا۔ حالانکہ دونوں لفظوں میں اگر کسی قدر مشترک کے پائے جانے کا امکان ہے تو شاید اتنا کہ دونوں ذاتی فضیلت اور قابلِ ستائش خوبیوں کا تصور ہیں، لیکن یہ اشتراک بہت ہی مبہم ہوگا۔

بدقسمتی سے آج کل اخلاقیات پر جو کتابیں لکھی جا رہی ہیں، ان میں اس قسم کی غلطیاں بہت عام ہیں۔ مغربی اہلِ علم کی کتابیں، جن میں جاپان کے شنٹو مذہب یا چین کے کنفیوشس مذہب میں راستی اور انصاف کے تصورات پر بحث کی گئی ہے، اس غلط رجحان کی گواہ ہیں، کیونکہ ان میں یہ آراء انگریزی تراجم کی بنیاد پر قائم کی گئی ہیں۔ جاپانی اور چینی زبان میں متعدد الفاظ ایسے ہیں، جو انصاف اور راستی کے مفہوم کے مختلف مدارج سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اگر اس مبہم اشتراک اور ترادف پر تقابلی اخلاقیات کی عمارت تعمیر کی جائے تو وہ بے شک مشکوک ہوگی۔

یہی بات عربی زبان میں لفظ صالح پر صادق آتی ہے۔ ہم اس لفظ کی معنوی ساخت کا تفصیلی تجزیہ تو آگے چل کر پیش کریں گے۔ فی الحال مختصراً یہ کہیں گے کہ اس لفظ کا ترجمہ عموماً راست باز یا انگریزی میں 'رائیٹیس'(۹) کیا جاتا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ یہ لفظ اپنے معنویاتی عناصر میں انگریزی کے اسم صفت سے کوئی مماثلت نہیں رکھتا۔

ہم یہ دعویٰ ہرگز نہیں کر رہے کہ مذکورہ تحریریں سراسر بے کار اور بے معنی ہیں۔ یہ کہنا بھی تحقیق کے اصولوں کے خلاف ہوگا۔ ہم یہاں صرف یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ

تصورات کا اصل زبان میں باقاعدہ اور دقتِ نظر سے مطالعہ کیے بغیر، محض ترجمے کی بنیاد پر کسی قوم کی اخلاقیات کی نوعیت پر گفتگو غلط راہ پر ڈال سکتی ہے۔ ہم تاریخ کو اضافی چیز قرار دینے والے انتہاپسندوں میں سے نہیں۔

نوول سمتھ (۱۰) اپنی کتاب 'اخلاقیات' میں لکھتا ہے کہ ''اخلاقی ضوابط کے مطالعے میں ہم جوں جوں آگے بڑھتے ہیں، پتہ چلتا ہے کہ بنیادی اصولی نکات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جو اختلافات ہیں، وہ تجربے پر مبنی حقائق کے بارے میں ہیں--- تمام اخلاقی ضوابط اس پر متفق ہیں کہ اچھائی کا بدلہ اچھائی سے دینا انسانی فرض ہے، لیکن اس ضابطے پر عمل کیسے ہو؟ اس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ کسی معاشرے میں کسی کے ساتھ نیکی کرنے سے کیا مراد لی جاتی ہے۔ وہ کیا طرزِ عمل ہے، جسے اچھائی کا بدلہ کہا جاتا ہے، اس کے بارے میں مختلف زاویۂ نظر ہونے کی وجہ سے اس اصول کی عملی شکلیں مختلف ہوں گی۔''(۱۱)

سمتھ کی بات بظاہر صحیح نظر آتی ہے اور شاید اس پر ہمیں شدید اعتراض بھی نہ ہو، لیکن ایسا لگتا ہے کہ سمتھ ایسے اصولوں کی بات کر رہا ہے جو ٹھوس حقائق سے بالا ہیں اور ان میں ان حقائق کی بنیاد پر اختلافِ رائے بھی نہیں ہے، لیکن اس اعلیٰ سطح کے اصولوں پر بات تبھی ممکن ہے جب یہ مانیں کہ انسانی طبائع ایک سی ہیں۔ بے شک اس طرح یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اخلاقیات کے بعض عالمگیر اصول تمام انسانوں کے مابین مشترک ہیں۔ تاہم ہمارے خیال میں اخلاقیات کے بنیادی مسائل کا تعلق تجرباتی حقائق اور عملی زندگی کی اعلیٰ سطح سے نہیں، بلکہ روزمرہ کی عام سطح سے ہے۔ کوئی بھی اخلاقی اصطلاح ہو اس کے معنویاتی عناصر کی تشکیل کسی معاشرے کی عملی زندگی کے ٹھوس حقائق سے ہوتی ہے۔ ایک معاشرے میں نیک عمل کا تصور دوسرے معاشروں سے لازمی مختلف ہوگا، کیونکہ اچھائی کے لفظ کے معنویاتی عناصر ہر معاشرے میں مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن ہم اس نتیجے پر تبھی پہنچ سکتے ہیں جب یہ فرض کر لیں کہ ہر زبان میں انگریزی زبان کے لفظ 'گڈ'(۱۲) (اچھا) کے مفہوم اور معانی سے مساوی یا قریب قریب مطابق الفاظ ہر زبان میں موجود ہیں۔ مختصر یہ کہ اگر ہم ایک زبان کی ہیئت اور خصوصیات کو دوسری

زبانوں کے معنویاتی پہلو پر منطبق کرنا صحیح نہیں سمجھتے تو اس قسم کے بے بنیاد مفروضوں سے اجتناب بہتر ہوگا، جس کی ہم نے اوپر مثال دی۔

ہمیں یقین ہے کہ گذشتہ بحث سے زبان کے معنویاتی پہلو کی اہمیت کے بارے میں ہمارا موقف بہت حد تک واضح ہو گیا ہوگا۔ اس کتاب میں ہمارا طرزِ تحقیق یوں ہوگا کہ ہم مکمل غیر جانبداری سے مشاہدہ پر مبنی حقائق پیش کریں گے اور مختلف فیہ نظریات میں سے کسی کی حمایت سے بھی گریز کریں گے، لیکن ہم زبان اور ثقافت کے مابین گہرے رابطے کے قائل ہیں اور اپنے اس موقف کی کھل کر وضاحت کریں گے۔ ہمارے اس مخصوص نقطۂ نظر کی وجہ سے اس بحث میں ایک ذاتی رجحان واضح طور پر دِکھائی دے گا، اس سے مفر نہیں۔ ہم تنوع پر یقین رکھتے ہیں کیونکہ زمان اور مکان کی تبدیلی کے ساتھ اچھائی اور برائی کے مفہوم بدلتے رہتے ہیں۔

مفہوم اور معنی کی یہ تبدیلی جزوی اختلاف کہہ کر نظرانداز نہیں کی جا سکتی۔ یہ اختلافات بنیادی ہیں۔ اس تبدیلی کا تعلق کسی ثقافت کے یک طرفہ ارتقاء کے مختلف مدارج کے فرق سے نہیں ہے، بلکہ یہ فرق دراصل اس بنیادی ثقافتی اختلاف سے ہے، جس کی جڑیں کسی بھی معاشرے کے لسانی رواجات کی گہرائی میں جاگزیں ہوتی ہیں۔

اس کتاب کی فکری بنیاد جس نظریۂ معانی پر رکھی گئی ہے، وہ نظریہ ہماری تخلیق نہیں۔ یہ نظریہ جرمن پروفیسر لیو وائز برگر[۱۳] نے اپنی کتاب 'جرمن زبان کی کائناتِ تصور'[۱۴] میں 'لسانیاتی تصورِ کائنات کا علم'[۱۵] کے نام سے پیش کیا تھا۔ اس نظریے کے بنیادی دلائل وہی ہیں جو 'نسبی لسانیات'[۱۶] کے ہیں۔ دونوں نظریے لسانی اور ثقافتی اسالیب کے درمیان بنیادی رابطے پر زور دیتے ہیں۔ 'نسبی لسانیات' کا نظریہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے پروفیسر ایڈورڈ سپیر[۱۷] نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں پیش کیا تھا۔ اس نظریات کے تفصیلی اختلافات پر گفتگو یہاں ممکن نہیں۔ ہم دونوں پر اکٹھی بحث کرتے ہوئے صرف ایسے دلائل کا ذکر کریں گے جن کا ہمارے موضوع سے براہِ راست تعلق ہے۔

ان نظریات کی اصولی بحث کو ہم چند ٹھوس مثالوں کے ذریعے بیان کریں

گے۔ مثلاً انگریزی لفظ وِیڈ[۱۸] (گھاس پھوس) کو لیجیے۔ انگریزی لغت کی کتابوں میں اس کا مطلب اس طرح بیان کیا گیا ہے: ''خودرو سبزہ جو ایسی جگہ اُگ رہا ہو جہاں اس کی ضرورت نہیں۔'' بالفاظِ دیگر یہ غیرضروری اور ناپسندیدہ نباتات ہیں۔ نظامِ فطرت میں ایسی کوئی چیز نہیں جسے غیرضروری یا ناپسندیدہ نباتات کہا جا سکے۔ یہ بات صرف وہ انسان کہہ سکتا ہے جو فطری اشیا کی لامحدود اور گوناگوں کائنات کا جائزہ لیتے ہوئے اسے ایک خاص نقطۂ نظر سے ترتیب دیتا ہے اور مختلف اہداف کے تحت ان کی الگ الگ قدر و قیمت متعین کر کے مختلف خانوں میں درجہ بندی کرتا ہے۔ یہ عمل ایک خاص نقطۂ نظر کا نتیجہ ہے اور انسانی ذہن کے ایک مخصوص داخلی رویے کا اظہار ہے۔

عام فہم نقطۂ نظر[۱۹] بہت سادگی سے یہ فرض کر لیتا ہے کہ ہر لفظ کا حقیقی شے سے براہِ راست تعلق ہے۔ اس طرح اوّل تو یہ مان لیا جاتا ہے کہ تمام اشیا پہلے سے موجود تھیں، ہم نے انہیں مختلف نام دے دیے ہیں۔ مثلاً لفظ 'میز' ایک حقیقی چیز ہے جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ اوپر انگریزی لفظ 'وِیڈ' کی مثال سے یہ صراحت ہوتی ہے کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ دراصل لفظ اور چیز کے درمیان لغوی تعبیر کا ایک خاص عمل دخل ہوتا ہے جو نظر آنے والی حقیقت کو داخلی اور غیرمعروضی نقطۂ نظر سے بیان کرتا ہے۔ ہمارے ذہن تعبیر کے اس عمل سے متاثر ہو کر حقیقت کی دُنیا کو دیکھتے ہیں، بلکہ زیادہ صراحت کے ساتھ حقیقت کو اس مخصوص نقطۂ نظر سے پیش کرتے ہیں۔ اس مثبت ذہنی عمل کو جرمن زبان میں گائسٹ[۲۰] (رُوح) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس عمل کے ذریعے ہم اشیا کے وجود کو سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں۔

زبان اور حقیقت کے مابین دراصل ایک قسم کا تخلیقی عمل واقع ہوتا ہے جو مادی وجود کو ایک خاص زاویے سے بیان کرتا ہے۔ یہی عمل علمِ معانی کا موضوع اور میدان ہے۔ آج کی زبان میں یوں کہیے کہ ہر لفظ ایک غیرلسانی حقیقت کی مخصوص زاویے سے لسانی درجہ بندی کا نام ہے۔ یہ درجہ بندی ایک ذہنی عمل کی پیداوار ہے جو مختلف غیرلسانی اشیا کو ایک خانے میں جمع کرتا ہے۔ اس عمل کی بنیاد مخصوص زاویۂ نگاہ کا اصول ہے، جس سے انسان حقیقت پر نظر ڈالتا ہے۔ یہ زاویۂ نگاہ ثقافتی اور تاریخی عوامل سے تشکیل پاتا

ہے۔

لفظ 'وِیڈ' (گھاس پھوس) کی مذکورہ مثال سے یہ بات بہت اچھی طرح واضح ہوتی ہے، تاہم یہ مثال استثنائی نہیں۔ تمام الفاظ کم و بیش اِسی نوعیت کے ہیں۔ بنجمن وہارف[۲۱] نے جب ہند یورپی زبانوں مثلاً فرانسیسی، جرمن اور انگریزی کے الفاظ کا موازنہ امریکن انڈین زبانوں کے الفاظ سے کیا تو وہ اس حیران کن نتیجے پر پہنچا کہ یہ زبانیں بولنے والے لوگ بالکل مختلف دُنیاؤں میں رہتے ہیں۔ ان کے تجربات اور احساسات بھی مختلف ہیں اور وہ حقائق کی دُنیا کو بالکل مختلف انداز سے دیکھتے ہیں۔ ان کے ہاں اشیاء کی درجہ بندی کے اصول قطعاً مختلف ہیں۔

ہم نے ابھی میز کی مثال دی تھی، انگریزی میں اسے ٹیبل[۲۲] کہتے ہیں۔ فرض کیجیے ہمارے سامنے دو میزیں ہیں، ایک گول اور دوسرا مربع شکل کا۔ دونوں کی شکلیں مختلف ہیں، لیکن ہم دونوں کو ٹیبل کہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم گول اور مربع دونوں کی درجہ بندی ایک ہی لفظ کے تحت کرتے ہیں۔ یعنی عام فہم نقطۂ نظر یہ ہے کہ گول ہو یا مربع، میز میز ہے۔ تاہم ہم اکثر بھول جاتے ہیں کہ یہ عام فہم نقطۂ نظر دراصل اس بات پر زور دے رہا ہے کہ میز کے تصور میں اس کی شکل فیصلہ کن حیثیت نہیں رکھتی۔ اس تصور کی رُو سے ہم ایسی دو چیزوں کو جو اپنی شکل اور انفرادی حیثیت میں جدا جدا ہیں، ایک 'چیز' شمار کرتے ہیں۔ حقیقت میں ہماری آنکھوں کے سامنے دو مختلف چیزیں گول اور مربع شکل میں موجود ہیں، لیکن ہمارا ذہن انہیں بنیادی طور پر ایک چیز بتاتا ہے۔ یہ بنیاد ہمارے ذہن کی پیدا کردہ ہے۔

بنجمن وہارف[۲۳] کو حیرانی ہوئی کہ ہند یورپی زبانیں بولنے والوں سے الگ ایک ایسی دُنیا بھی موجود ہے جو چیزوں کی درجہ بندی ان کی بنیادی شکلوں یعنی گول، مربع، مستطیل، مکعب، ٹھوس، مائع وغیرہ کے حساب سے کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک گول چیزوں کی درجہ بندی مربع چیزوں کے ساتھ نہیں ہو سکتی، ان دونوں کے لیے الگ الگ نام ضروری ہیں۔ ان کے حساب سے مغربی اقوام کی درجہ بندی کے اصول غیر منطقی اور غیر معقول ہیں کیونکہ وہ حقیقی دُنیا کے نظام سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ گول اور مربع دو

مختلف اشیا کو ایک ہی درجہ میں رکھنا کیسے ممکن ہے؟

اس سادہ سی مثال سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جانی چاہیے کہ نام اور چیز میں مطابقت کسی مادی، معروضی، سادہ اور یکتا بنیاد پر نہیں۔ ان دونوں کے درمیان ہمیشہ ایک مخصوص ذہنی عمل کارفرما رہتا ہے۔ یہ ایک تخلیقی عمل ہے جو ایک مخصوص زاویۂ نظر سے کسی چیز کو داخلی حوالے سے شکل دیتا ہے۔ میز کی مثال میں یہ مخصوص زاویہ اس چیز کی عملی افادیت کا پہلو ہے، اس میں میز کی مربع یا گول شکل کا اختلاف بے معنی ہے۔ اس کے استعمال کی بنا پر دونوں شکلوں کو ایک نام دیا گیا۔ چونکہ دونوں شکلوں کے میز ایک ہی مقصد کے لیے ہیں، اس لیے ظاہری اور صوری اختلاف قدرتی طور پر غیر اہم ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے لوگوں کے نزدیک چیزوں کی شکل و صورت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ وہ دنیا کو شکل و صورت کے اعتبار سے دیکھتے ہیں، مقصد اور استعمال کی بنیاد پر نہیں۔

اگر میز جیسے سادہ لفظ کا یہ حال ہے تو ایسے الفاظ کا کیا ہوگا جو نہ تو عام ہیں اور نہ مادی اور محسوس چیزوں کے نام ہیں۔ ایک سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے والے ہی جانتے ہیں کہ بعض اوقات ایک معمولی لفظ یا عبارت کا مطلب دوسری زبان میں بیان کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اکثر تو ہمت ہار کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس لفظ کا ترجمہ ممکن نہیں۔ ڈاکٹر فاؤسٹ (۲۴) گوئٹے (۲۵) کی کتاب کے ترجمے میں یونانی لفظ 'لوگوس' (۲۶) کا جرمن معنی تلاش کرتے ہوئے تھک کر آخرکار اسی جملے کا سہارا لیتا ہے۔ (۲۷)

اس مشکل کا اصل سبب یہ ہے کہ 'ناقابلِ ترجمہ' الفاظ دراصل کسی زبان کے بولنے والوں کے مخصوص ذہنی رویے کے حامل ہوتے ہیں۔ تاہم اس مخصوص رویے کی یہ چند مثالیں محض وضاحت کے لیے پیش کی گئیں۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ کسی لفظ کا بھی مکمل ترجمہ دوسری زبان میں ممکن نہیں ہے۔ اوپر کی مثالوں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ میز کا ترجمہ آسان اور لوگوس کا مشکل ہے، لیکن دراصل یہ فرق اتنا زیادہ نہیں جتنا بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے۔ صحیح معنوں میں دونوں کا ترجمہ مشکل ہے۔

ہم جو لفظ بھی بولتے ہیں، وہ ہمارے اس مخصوص زاویۂ نظر کی غمازی کرتے

ہیں جس سے ہم اس لفظ کا تصور کرتے ہیں۔ یہ تصور اسی داخلی رویے کی ترقی یافتہ شکل کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ زاویۂ نظر مختلف چیزوں کی شکلیں تیار کرتا ہے جو کم و بیش مستقل حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ انہی شکلوں کو ہم تصور[۲۸] کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں زاویۂ نظر کے داخلی ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر فرد کا اپنا اپنا زاویۂ نگاہ ہے۔ ہم جس زاویۂ نظر کی بات کر رہے ہیں، وہ انفرادی نہیں اجتماعی ہے کیونکہ پورا معاشرہ اس میں شریک ہے۔ یہ ایسا مشترکہ سرمایہ ہے جو نسل در نسل تاریخی روایت کی شکل میں منتقل ہوتا ہے۔ ہم اسے داخلی اس لیے کہہ رہے ہیں کہ اس کی تشکیل میں کسی حد تک ایجابی ذاتی مفاد کو دخل ہے جس کی وجہ سے کائنات کے بارے میں یہ تصوراتی تصویر باہر کی دُنیا کے ٹھوس حقائق کی بعینہٖ نمائندگی نہیں کرتی۔ علمِ معنویات انہی زاویوں کے تجزیاتی مطالعے کا نام ہے جو لفظ اور تصور کے باہمی رشتے کے ذریعے معانی پیدا کرتے ہیں۔

ہنری برگساں[۲۹] لکھتا ہے کہ اپنے متبادر تجربے میں ہم حقیقت کو ایک ایسے کُل کی طرح دیکھتے ہیں جس کے اجزا کو ہم ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ قدیم فلسفی اس کُل کو 'ہیولے'[۳۰] (اوّلین مواد) کہتے تھے۔ ماضی قریب میں فرانس کے وجودی فلسفی اسے غیر منظم بے شکل مادہ قرار دیتے تھے جس میں شامل مختلف چیزوں اور اجزا میں سے کسی کے خدوخال نمایاں نہیں ہوتے۔ پوری کائنات ایک بے کار، عریاں اور اندھے مواد کی طرح گندھے ہوئے آٹے کی شکل میں نظر آتی ہے، جس کی بے شکلی سے گھِن آتی ہے۔ یہ انسانی ذہن ہے جس نے اسے غیر ممیز کُل میں بہت ساری شکلیں تخلیق کی ہیں، جو الگ الگ اور منفرد ہیں۔ ان شکلوں کی تعداد اور صورتیں ہر قوم میں اور اس کی تاریخ میں مختلف زمانوں میں مختلف ہوتی ہیں۔ عربی جیسی زبان کا وسیع ذخیرۂ الفاظ ظاہر کرتا ہے کہ اس کے بولنے والوں نے حقیقت کے مجموعی کُل سے کتنی زیادہ شکلیں اور اکائیاں الگ کر لی ہیں۔ اس کے برعکس کسی زبان کا کم ذخیرۂ الفاظ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اُس کے بولنے والوں کے نزدیک حقیقت کا بیشتر حصہ ناقابلِ تمیز ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ ہر قوم اپنے طریقے سے طے کرتی ہے کہ حقیقت کے کُل میں سے کیا الگ کرنا ہے اور کس حساب سے کرنا ہے۔ یا یوں کہیے کہ صورتوں کو الگ

کرنے کے عمل کا انحصار ہمیشہ کسی قوم کی داخلی دلچسپی کے معیار پر ہوتا ہے۔ یہی معیار اس عمل کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہ تعین مادی اشیا میں معروضی طور پر باہمی مشابہت کی بنیاد پر نہیں ہوتا، بلکہ اس داخلی معیار پر ہوتا ہے جس سے ان چیزوں کی خانہ بندی کی جاتی ہے۔ حقیقت کا جو روپ ہماری اُمید وبیم، رغبت وتقسیم اور خواہش وعمل کو اہم دکھائی دیتا ہے، صرف اسی کو الگ اور مستقل جزو کی حیثیت سے ایک الگ نام دے کر ایک الگ حقیقت قرار دیا جاتا ہے۔ اس ذہنی حقیقت کو ہم 'تصور' کہتے ہیں۔ ہر لحہ تیزی سے بدلتے بہتے تاثرات میں سے ہم صرف ان چیزوں کا انتخاب کرتے ہیں جو ذاتی داخلی دلچسپی کی حامل ہوتی ہیں، یا ہم جنہیں نظامِ زندگی کے لیے مجموعی طور پر لازمی سمجھتے ہیں۔ اس طرح ہم ان چیزوں کو جو ایک غیر متعین اور ہر لحہ تغیر پذیر کُل کا جز ہیں، اپنے اس نقطۂ نظر سے متعین کرنے کی غرض سے اس کے لیے ایک لفظ مخصوص کر دیتے ہیں۔ اس لغوی چھاپ کے عمل کو 'نام' کہا جاتا ہے۔

کائناتی وجود کے مواد کو جو دراصل بے شکل ہے، انسانی ذہن اَن گنت خطوط کھینچ کر مختلف خانوں اور ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ حقائق کی دُنیا پر لسانی اور تصوراتی تقسیم کے نقوش ثبت کر دیے جاتے ہیں۔ اور یوں اصلاً ایک بے ہنگم وجود کو ایک نظام اور ترتیب دے دی جاتی ہے۔ تصورات اور الفاظ جو اُن تصورات کے اظہار کے لیے وضع کیے گئے ہیں، مل کر ایک پیچیدہ نظام تشکیل دیتے ہیں۔ یہ نظام متعدد مظاہر میں نظر آتا ہے۔ یہ نظام انسانی ذہن اور مادی اشیا کے درمیان ایک پردہ بن جاتا ہے جو حقیقی وجود کی جگہ تصورات کے ذریعے تشکیل دیے ہوئے وجود کو منعکس کرتا ہے۔ پردے کے اس مخصوص عمل کی وجہ سے انسانی ذہن تک جو حقائق پہنچتے ہیں، اُن کی شکل ترمیم شدہ حتیٰ کہ بعض اوقات بگڑی ہوئی ہوتی ہے۔

ہم حقائق کو اس پردے کے ذریعے دیکھنے کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ یہ پردہ ہمیں بالکل شفاف اور قدرتی لگتا ہے اور پھر بتدریج ہمیں اس کے وجود کا احساس بھی نہیں رہتا۔ اپنی سادہ لوحی میں ہمیں پورا یقین ہوتا ہے کہ ہم حقائق کی دُنیا کو بالکل اُسی طرح محسوس کر رہے ہیں، جیسا کہ وہ فطری طور پر اصل میں ہے، اور ہم اسے براہِ

راست دیکھ رہے ہیں۔ عام فہم نقطۂ نظر کے حساب سے فطری اور حقیقی دُنیا اپنے اظہار کے پیرایوں اور گوناگوں تنوع کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے بدیہی طور پر موجود ہے۔ ہم اسے بالکل اسی تفصیلی درجہ بندی اور مکمل نظم کے ساتھ دیکھ رہے ہیں، جیسا کہ وہ اصل میں ہے۔ ہم سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ ہم دُنیا کا ادراک جس ترتیب اور تقسیم سے کر رہے ہیں، وہ اصل میں بھی اسی طرح موجود ہے۔ ہم اس فطری تنوع اور تقسیم کے مطابق اپنے ذہن میں تصورات قائم کرتے ہیں، چیزوں کو نام دیتے ہیں اور اس طرح ہمارا ذخیرۂ الفاظ تشکیل پاتا ہے۔(۳۱)

یہ عام فہم نقطۂ نظر ایک اہم حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ حقیقتِ کلی کا ادراک تو ایک طرف (اسے تو یونانی حکماء بھی فوضی یا بدنظمی کا نام دیتے تھے)، ہم حقیقت کے کسی ایک جز کا بھی صحیح ادراک نہیں کر سکتے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم حقیقت کے کسی بھی پہلو کو جتنے اجزا میں چاہیں اور جس طرح چاہیں اور جس زاویے سے چاہیں تقسیم کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ وجودی فلسفی کہتے ہیں کہ زندگی کے لمحہ بہ لمحہ تجربات و واقعات کے خام مواد کو جب تک ہم اس ذہنی عمل کے ذریعے متفرق مستقل ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کر لیتے، ہمیں یہ دُنیا قطعی طور پر بے صورت اور بے معنی لگتی ہے۔ تقسیم کے اس ذہنی عمل کو علم معنویات میں 'اظہار'(۳۲) یا بیان کہتے ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ ہم اظہار کا یہ عمل خود وضع کریں۔ یہ نظام ذخیرۂ الفاظ کی صورت میں ہمیں استعمال کے لیے تیار ملتا ہے۔ یہ ذخیرہ ہمیں اپنے آباء و اجداد کی جانب سے ثقافتی ورثے میں حاصل ہوتا ہے۔ بچپن میں جب ہم مادری زبان سیکھتے ہیں تو یہ ذخیرہ اپنے ذہن میں محفوظ کرتے جاتے ہیں۔

وجود کی حقیقت کچھ بھی ہو، وہ ہمارے تصور میں اپنی اصلی اور فطری شکل میں نہیں نظر آتا، بلکہ وہ ہماری زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں موجود علامات کے منشور سے گزر کر سامنے آتا ہے۔ علامت کا یہ منشور اصل کا عکس نہیں ہے اور نہ ہی علامات حقیقت کی اصل شکل سے کوئی مطابقت رکھتی ہیں۔ یہ تو تصوراتی شکلیں ہیں، لیکن صرف انہی کے واسطے سے کوئی چیز ہمارے عقلی ادراک میں حقیقت کی شکل دھارتی ہے۔

اس ضمن میں سب سے اہم قابلِ غور بات صرف یہی نہیں کہ کائنات کو مختلف اکائیوں میں تقسیم وتفریق کا ہر قوم کا اپنا طریقہ ہے، بلکہ اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ یہ اکائیاں مل کر جو نظام تشکیل دیتی ہیں، وہ بھی ہر قوم سے مخصوص ہوتا ہے۔ یہ نظام کسی ترتیب اور اصول کے بغیر وجود میں نہیں آتے بلکہ یہ اکائیاں مل کر ایک بہت ہی پیچیدہ اور منظم کُل بناتی ہیں۔ اس قوم کا خاصہ صرف وہ نظام ہی نہیں، جس میں یہ اکائیاں ایک دوسرے سے جُڑی نظر آتی ہیں، بلکہ ہر قوم اپنے مخصوص طریقے سے یہ تعین کرتی ہے کہ کس اکائی کی کیا ماہیت ہے اور اس کا درجہ اور مقام کیا ہے۔ یہ منظم کُل ذخیرۂ الفاظ کی صورت میں ہر قوم کا اپنا سرمایہ ہوتا ہے۔

ذخیرۂ الفاظ یا عام الفاظ میں زبان یا لغت دلالت کے مختلف پیرایوں پر مبنی اظہار اور بیان کی شکلوں کے نظام کا نام ہے جس کے ذریعے ہم ہر لمحہ بدلتی کائنات کو اشیا اور واقعات کی صورت میں دیکھتے ہیں۔

بنجمن وہارف[۳۳] کا یہ قول بالکل برمحل ہے کہ ہر زبان حقیقت کے وقتی تجزیے کا نام ہے، کیونکہ ہر زبان کائنات اور فطرت کے وجود کو مختلف طریقوں سے اکائیوں میں بانٹتی ہے، حتیٰ کہ ایک عام سا واقعہ بھی مختلف زبانوں میں مختلف طریقوں سے بیان ہوتا ہے کیونکہ یہ زبانیں اس واقعے کو حقائق کے مختلف پیمانوں سے ناپتی ہیں۔ ہر زبان اپنے طریقے سے ان اکائیوں کو گروہ بندی کے مختلف قسم کے متعدد بنیادی اصولوں کے تحت ترتیب دیتی ہے۔ پھر اُن کی مدد سے تصورات کا ایک مربوط جال بُنا جاتا ہے۔ اس جال کو ذخیرۂ الفاظ کہتے ہیں۔

کسی بھی زبان کا ذخیرۂ الفاظ یا نظامِ دلالت ایک مخصوص تصورِ کائنات[۳۴] سے مجسم ہوتا ہے اور اسی کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ تجربے کے خام مواد کو ایک بامعنی اور تعبیری دُنیا میں تبدیل کرتا ہے۔ ان معنوں میں ذخیرۂ الفاظ صرف ایک سطحی عمارت نہیں بلکہ یہ ذیلی درجہ کے ذخیرۂ الفاظ کی متعدد سطحوں پر تعمیر کی گئی ہے جو عام طور پر ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے پہلو میں بنی ہیں، لیکن اکثر اُن کے رقبے باہم مشترک بھی ہوتے ہیں۔

اخلاق سے متعلقہ اصطلاحی الفاظ کے باہمی رابطوں سے جو تصوراتی نظام تشکیل پاتا ہے، وہ اسی طرح کے ذیلی لیکن قدرے مستقل ذخیرۂ الفاظ سے بنتا ہے، جن کے درمیان بہت سے تصوراتی رشتے قائم ہوتے ہیں جو نسبتاً مستقل ہوتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا تصورِ کائنات مختلف ہوتا ہے۔

علمِ معنویات کی رُو سے اخلاقی ضابطے اسی تعبیراتی معنوی دُنیا کے خطے ہیں۔ اس جملے سے قاری کا ذہن فوراً جان لاڈ[۳۵] کی نہایت اہم کتاب 'اخلاقی ضابطے کی ہیئت'[۳۶] کی طرف مبذول ہوگا جس میں اس نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ اخلاقی ضابطے دراصل کسی نظریۂ حیات کا حصہ ہوتے ہیں۔ درحقیقت میرے اور ڈاکٹر جان لاڈ کے موقف میں بہت سے نکات میں مماثلت ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ میں نے اپنے نظریات کو مرتب کرنے میں اس مصنف کی گہری بصیرت سے بہت استفادہ کیا ہے۔ خصوصاً اخلاق کے کلام[۳۷] کی نوعیت کے بارے میں ہمارے خیالات بہت ملتے جلتے ہیں۔ تاہم اس ضمن میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ڈاکٹر لاڈ نے ناواہو[۳۸] قبیلے کی اخلاقیات پر جو تحقیق کی ہے، اُس کے بنیادی شواہد اخلاق کے بارے میں 'بیانات'[۳۹] ہیں، 'جملے'[۴۰] نہیں۔

زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہیے کہ ڈاکٹر لاڈ کے بنیادی شواہد ترجمے کے ذریعے حاصل شدہ معلومات ہیں۔ اپنی کتاب کے آغاز میں ہی ڈاکٹر لاڈ اپنے موقف کے جواز میں 'جملے' اور 'بیان' میں ایک قطعی فرق ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ 'داس ہاؤس اسٹ وائس'[۴۱] (جرمن)، 'لامیزاں اے بلانش'[۴۲] (فرانسیسی)، 'دی ہاؤس از وہائٹ'[۴۳] (انگریزی)، مختلف 'جملے' ہیں، لیکن سب ایک ہی 'بیان' (گھر سفید ہے) پر مشتمل ہیں۔ بیان کے لیے ضروری نہیں کہ اس کا اظہار مخصوص الفاظ میں ہو اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ اسے کسی مخصوص زبان میں ادا کیا جائے۔ اس کا کہنا ہے کہ 'بیان' کی یہی خصوصیت تھی جس کی وجہ سے مقامی باشندوں سے گفتگو کے بارے میں اسے علم ہو سکا، کیونکہ وہ ناواہو زبان سے ناواقف تھا، اس لیے اسے یہ علم نہیں ہو سکتا تھا کہ مقامی باشندوں نے اصل میں کونسے جملے بولے تھے۔

اب جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، یہ بات میرے طریقِ کار سے قطعاً مختلف ہے، جو میں نے اس کتاب میں اختیار کیا ہے۔ میرے نزدیک مقامی باشندے کا 'جملہ' اس 'بیان' سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ اس کا اظہار کسی بھی زبان میں ہوسکتا ہے۔ یہ بات کہ 'بیان' کی طرح کی کوئی شے موجود ہے جو ساری زبانوں میں برابر مشترک ہے، بے حد مشکوک ہے۔

جیسا کہ پروفیسر راجر براؤن[۴۴] نے لکھا ہے کہ ایسے روزمرہ کے الفاظ مثلاً 'ماں'، 'میر'[۴۵] (فرانسیسی) اور 'مدر'[۴۶] (انگریزی) بھی مکمل طور پر ایک دوسرے کے مترادف نہیں۔ فرانسیسی لفظ 'آمی'[۴۷]، جرمن لفظ 'فروئنڈین'[۴۸] اور انگریزی لفظ 'لیڈی فرینڈ'[۴۹] بنیادی معنوں میں ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔[۵۰] ایسا شاید ہی ہو کہ کسی زبان میں کسی جملہ میں اگر کسی کی اخلاقی حالت کے بارے میں کوئی بات کی جا رہی ہو تو وہ بعینہٖ اسی طرح دوسری زبان میں بھی کہی جا سکے۔

ایڈورڈ سپیر[۵۱] بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ ادراک کا سادہ سا عمل بھی بڑی حد تک دلالتِ معانی کے سماجی اسالیب کا پابند ہوتا ہے، اور اس لحاظ سے یہ عمل ثقافت سے مربوط ہوتا ہے۔[۵۲] اگر یہ صحیح ہے تو انسانی اخلاق اور کردار کی اقدار کے اظہار کے اعمال تو ثقافت سے اور بھی زیادہ مربوط ہوتے ہیں۔ ہر ثقافت میں اخلاقی کردار کے بیان کے لیے ایک سے زیادہ روایتی اسلوب ہیں جو تاریخی عمل سے گذر کر شکل پذیر ہوتے ہیں اور اس زبان کی اخلاقی اصطلاحات کا حصہ بنتے ہیں۔ انہی کے ذریعے اس زبان کے بولنے والوں کو اظہار کے وسائل کا ایک مکمل مجموعہ ملتا ہے جن کے ذریعے وہ اخلاقی حوادث کی درجہ بندی کرتے ہیں۔ اپنی زبان کے انہی معنویاتی اسالیب کے ذریعے کسی زبان کے بولنے والے انسانی افعال اور کردار کا آسانی سے تجزیہ کر سکتے ہیں، اسے بیان کر سکتے ہیں اور اس کی درجہ بندی کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب کسی قوم میں اقدار کی درجہ بندی کے اصول عملی زندگی سے مکمل مطابقت رکھتے ہوں اور اس قوم کی لغات میں اخلاقی اصطلاحات کی شکل میں جگہ پا چکے ہوں۔

معنویات کے اس موضوع کے مبادیات کیا ہیں؟ اس کے تجزیے کے لیے علمی

اور باوثوق طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟ علمی تحقیق اور تفتیش کے تقاضے کیا ہیں؟ معنویاتی درجہ بندیوں کے نظام کی دریافت کیسے ہو؟ ان سوالات کے جواب سے پہلے ہم یہ وضاحت کرتے چلیں کہ یہاں 'علمی' سے مراد تجرباتی اور استقرائی طریقِ تحقیق ہے۔ موجودہ مطالعے کے حوالے سے اس کا مقصد اخلاقی اصطلاحات کا ایک ایسا تجزیاتی مطالعہ ہے جس کی بنیاد ان کے سیاقِ استعمال پر ہو اور حتی المقدور کسی بھی اخلاقی فلسفہ یا نظریہ کی جانبدارانہ حمایت یا تعصب سے اجتناب کیا جائے۔

ہمارے خیال میں اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کسی لفظ کی معنویاتی شکل کی اس کے سیاق کے حوالے سے وضاحت کی جائے، یعنی کسی لفظ کے معانی کو اس صورتِ حال اور واقعہ کے حوالے سے بیان کیا جائے جہاں وہ استعمال ہوا ہے۔ کسی لفظ کے استعمال کا سیاق کسے کہتے ہیں؟ اس کے بنیادی عناصر اور لازمی خصوصیات کیا ہیں؟ اس لفظ کے درست معانی تک پہنچنے کے لیے ان سوالات کے جواب لازمی ہیں۔

ہم نے اس طریقۂ کار کو اس یقین کی بنیاد پر چُنا ہے کہ انسانی ذہن کی یہ خاصیت ہے کہ وہ چیزوں کی درجہ بندی کرتا ہے، اور زبان چونکہ دلالت یعنی لفظ اور چیز کے رشتے کے بیان کا وسیلہ ہے، اس لیے یہ درجہ بندی کے عمل کا سب سے اعلیٰ اور مکمل اظہار ہے۔ (۵۳)

ہر زبان کا ایک عمومی دلالتی نظام ہوتا ہے جو مخصوص درجہ بندیوں سے مل کر بنتا ہے۔ دینی اخلاقی اصطلاحات کے ایسے ہی ایک مخصوص نظام کا نام ہے۔ محقق کا بنیادی کام ان اصطلاحات کی درجہ بندی کے اصول دریافت کرنا ہے۔ وہ کونسی خاص باتیں ہیں جن کی بنیاد پر کسی اصطلاح کو مخصوص درجے میں رکھا گیا ہے۔ بے شمار، مختلف اور ایک دوسرے سے الگ بے شمار خواص میں سے ایک درجے میں مشترک خواص طے کر کے اس درجے میں شامل تمام چیزوں کو ایک مشترک نام دیا گیا ہے۔ جب کوئی شخص کسی زبان کی دینی اخلاقی اصطلاحات کا تجزیہ کرنا شروع کرتا ہے تو وہ آہستہ آہستہ اس زبان کا نظام سمجھنے لگتا ہے۔ وہ دلالت کی بنیادی ساخت سے واقف ہونے لگتا ہے اور اسے پتہ چلتا ہے کہ جن واقعات اور حالات کا تعلق اخلاقیات سے ہے اور جہاں کسی چیز یا عمل کے

اچھے یا برے ہونے کے بارے میں بتایا جاتا ہے، وہ زبان کی چھلنی میں کیسے چھنتے ہیں اور اس عمل کے ذریعے وہ زبان روزمرہ اصطلاحات کی شکل میں ان اقدار کو کیسے آسانی سے دستیاب کرتی ہے۔

بچے اسی عمل سے گزر کر زبان سیکھتے ہیں۔ محقق کی حالت بھی اسی بچے کی طرح ہے جو بولنا سیکھ رہا ہو۔ بشریاتی ماہرینِ زبان نئی زبانوں پر تحقیق کے دوران اسی عمل سے گزرتے ہیں۔ لفظ 'سیب' کہاں، کیسے اور کس چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے، بچہ اسے آہستہ آہستہ والدین کے ردِعمل اور رویّے سے سیکھتا ہے۔ جب والدین 'سیب' کا لفظ بولتے ہیں تو ہر مرتبہ اس کا سیاق مختلف ہو سکتا ہے۔ بچہ ان مختلف مواقع سے اس لفظ اور چیز یعنی مخصوص قسم کے پھل کے مابین دلالت کے رشتے کو سمجھتا ہے۔ یہ عمل کئی مرتبہ دہرایا جاتا ہے تو دہرائے گئے ان تمام مواقع کو وہ ایک درجے میں ڈال کر ان مختلف مواقع کو سیب کے لفظ کے استعمال کی مختلف مثالیں قرار دیتا ہے، جن سے اس پھل کی خصوصیات مثلاً ضخامت، رنگ، شکل، ذائقہ وغیرہ، اس پھل کی پہچان اور اس لفظ کے ذریعے ان خصوصیات کی دلالت پر قائم ہوتی ہے۔ یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں کہ بچہ اخلاقی اصطلاحات بھی اسی طرح سیکھتا ہے۔ جس طرح ایک خاص چیز اور اس کی مخصوص خصوصیات کے لیے لفظ سیب بولا جاتا ہے، بالکل اسی طرح ایک مخصوص صورتِ حال کے لیے ایک مخصوص اخلاقی اصطلاح بولی جاتی ہے۔ دونوں کا طریقۂ دلالت ایک سا ہے۔ ان میں کوئی فرق نہیں۔

یہاں راجر براؤن کے کھیل کا ذکر دلچسپی کا باعث ہوگا جسے وہ 'اصل لفظ کا کھیل' کہتا ہے۔ اس کھیل میں ایک استاد ایک لفظ بولتا ہے اور پھر مختلف چیزوں سے اس لفظ کا رشتہ جوڑتا ہے۔ کھلاڑی کو ان مثالوں میں سے اصل لفظ تلاش کرنا ہے۔ کھلاڑی بغور مشاہدہ کرتا ہے کہ استاد اصل لفظ کہاں اور کیسے استعمال کرتا ہے اور پھر اس کا تعلق ان اشیاء سے قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو لفظ یا معنی سے ہٹ کر یا دوسرے لفظوں میں غیرلسانی ہیں۔ کھلاڑی کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ ان غیرلسانی اشیاء کو ان کی خصوصیات کی بنیاد پر ایک دوسرے سے الگ کر سکتا ہے یا نہیں۔ اسے بغور دیکھنا چاہیے

کہ استاد نے کس خاص قسم کے سوال یا تحریک پر کیا جواب دیا اور اس میں کیا مخصوص لفظ استعمال کیا۔

کام یقیناً آسان نہیں، اکثر اوقات بار بار غلطی اور لگاتار کوشش کے عمل سے گذرنے کے بعد ہی کھلاڑی سمجھ سکتا ہے کہ استاد کسی خاص لفظ کو کب استعمال کرتا ہے۔ ہمارے محقق کے ساتھ بھی تقریباً یہی سب کچھ پیش آتا ہے۔ وہ پہلے تو اخلاقی اصطلاحات کے اصل استعمال کی تمام مثالوں کو جمع کرتا ہے۔ پھر ان دستیاب مثالوں کا بغور مطالعہ کرتا ہے۔ ان کے واقعاتی سیاق کا تجزیہ کرتا ہے۔ مفروضے قائم کرتا ہے، پھر ان مفروضوں کا مزید شواہد کی روشنی میں محاکمہ کرتا ہے۔ ضرورت ہو تو ان پر نظرثانی کرتا ہے اور اس اُمید میں رہتا ہے کہ وہ اس طریقے سے اپنے مسئلے کا تسلی بخش حل ڈھونڈ لے گا۔

ہم نے قرآن کریم کی دینی اخلاقی اصطلاحات کے مطالعے کے لیے یہی طریقہ اپنایا ہے۔ تاہم ہم نہ تو اس بچے کی طرح ہیں جو ابھی کوئی زبان نہیں جانتا اور نہ ہی ہم بشریاتی ماہرِ زبان کی طرح ہیں، جس کا واسطہ ایک نئی زبان سے ہے۔ عربی زبان دُنیا کی معروف ترین زبانوں میں سے ہے۔ اس کے قواعد اور ذخیرۂ الفاظ کا انتہائی تفصیل سے مطالعہ ہو چکا ہے۔ بہترین لغات دستیاب ہیں۔ بہت سا لغوی کام موجود ہے۔ خصوصاً قرآن کریم کی تفسیر کے میدان میں بہت سی قدیم معتبر تفاسیر بھی موجود ہیں۔ ان سب کے باوجود ہمارے طریقِ تحقیق کے اصول اس بات سے منع کرتے ہیں کہ ہم ان ثانوی ذرائع پر اور اُن کی نظریاتی بنیادوں پر انحصار کریں۔ ان تمام ذرائع کو ہم زیادہ سے زیادہ مفید اور امدادی مراجع کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ مراجع معلومات فراہم کرتے ہوئے، ہمیں ہمارے اصل راستے سے ہٹا سکتے ہیں، اس لیے ہمیں ان ذرائع کے استعمال میں انتہائی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ ہم ان مراجع سے شواہد ضرور حاصل کریں گے، لیکن ان کو نتائج کا درجہ نہیں دیں گے۔

اس بحث سے خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ ہم سیدھی سی بات کو خواہ مخواہ پیچیدہ بنا رہے ہیں، حالانکہ جس زبان پر تحقیق کی بات ہو رہی ہے، اس پر پہلے سے کام موجود ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس کتاب کے مطالعے سے بتدریج واضح ہو جائے گا کہ نئے

مطالعے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ یہاں ہم ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلاتے چلیں۔ ہمارا طریقِ کار بظاہر بہت مشکل، پُر پیچ اور طویل نظر آتا ہے، لیکن اخلاقی اصطلاحات کے معاملے میں دوسرے بہت سے طریقوں کے مقابلے میں یقیناً یہ زیادہ قابلِ عمل ہے۔ اس طریقے کے ذریعے ہم اخلاقی اقدار کے الفاظ کا دوسرے عام الفاظ کی طرح تجزیہ کر سکیں گے۔ اس زاویے سے دیکھیں تو اخلاقی اصطلاحات، خاص طور پر جن کا تعلق زبان کے متبادر اور اوّلین سطح کے الفاظ سے ہے، ان عام الفاظ سے کسی طرح مختلف نہیں جن کے ذریعے ہم چیزوں کے نام رکھتے ہیں، مثلاً میز، کھانا، چاول، سرخ۔ ان تمام الفاظ کے سیکھنے کا بنیادی عمل وہی ہے جو اخلاقی الفاظ کا ہے۔

حواشی:

(۱) اس نکتے کا مزید تجزیہ اگلے باب میں کیا جائے گا۔

(2) Transmutation

(3) Cultural Anthropology

(4) Transmutation

(5) Morris Cohen

(6) *A Preface to Logic* (London, 1946)

(7) arete

(8) virtue

(9) righteous

(10) Nowell-Smith

(11) P.H. Nowell-Smith, *Ethics* (London: Pelican Books, 1954), Chapter 1, Section 2.

(12) good

(13) Leo Weisberger

(14) *Vom Weltbild der deutschen Sprache* (Dusseldorf, 1950)

(15) Sprachliche Weltanschauungslehre

(16) Ethnolinguistics

(17) Edward Sapir

(18) Weed

(19) Commonsense view

(۲۰) geist، ہم اُردو زبان میں بھی الفاظ کی بجائے ان کی روح کو سمجھنے کی بات کرتے ہیں۔

(21) Benjamin Wharf

(22) Table

(23) ملاحظہ ہو: Benjamin Lee Wharf, *Language, Thought and Reality* (Cambridge, 1956)

لسانیات کے اس شعبہ میں حالیہ پیش رفت کی زیادہ واضح تصویر مندرجہ ذیل کتاب میں ملتی ہے۔

Paul Henle (ed)., *Language, Thought and Culture*, (Ann Arbor, 1958)

(24) Faust

(25) Goethe

(26) Logos

(۲۷) قرآن کریم کے کلیدی الفاظ کا بھی تقریباً یہی حال ہے، مثلاً کفر کے لفظ کو لیجیے۔ اگر ہم اس کا ترجمہ بے ایمانی (ایمان کی غیر موجودگی) یا نافرمانی کریں تو بہت زیادہ فرق ہو جاتا ہے۔ وہ ذہنی رویہ جو کفر کے لفظ کی معنوی ساخت سے بنتا ہے، ترجمے سے قطعی بدل جاتا ہے، یا اُس کا رُخ مڑ جاتا ہے۔

(28) Concept

(29) Henry Bergson

(۳۰) hule: خام مواد، عربی میں اسے 'ہیولیٰ' کا نام دیا گیا۔

(۳۱) ملاحظہ ہو، ہماری کتاب 'قرآن میں خدا اور انسان' جس کے باب اوّل اور فصل چہارم میں ہم نے تفصیل سے ذخیرۂ الفاظ اور فکری کائنات پر بحث کی ہے اور واضح کیا ہے کہ ذخیرۂ الفاظ معنویاتی روابط کے نظام کا مرتب کیا ہوا ہے۔

(32) Articulation

(33) Benjamin Wharf

(34) Weltanschauung

(35) Dr. John Ladd

(36) *The Structure of a Moral Code*, (Cambridge, 1957)

(37) Discourse

(38) Navaho

(39) Statements

(40) Sentences

(41) Das Hause is Weiss.

(42) La Maison est blanche.

(43) The house is white.

(44) Professor Roger Brown

(45) mere (ماں)

(46) mother (ماں)

(47) amie (دوست) مونث

(48) Freundin (دوست) مونث

(49) Lady friend

(50) Roger Brown, *Language and Categories*, published as an appendix to *A Study of Thinking*, by: J.S. Brunner, J.J. Goodnow and G.A. Austin (New York, 1956), p.311.

ہمارے خیال میں اس موضوع پر اس سے بہتر کوئی کتاب موجود نہیں۔

(51) Edward Sapir

(52) ملاحظہ ہو، ان کا مقالہ: "*The Status of Linguistics*", *Selected Writings*, (Los Angeles, 1951), pp. 160 ff.

(۵۳) درجہ بندی کے عمل کے عمومی اور تفصیلی تجزیے اور انسانی ذہن کی تشکیل میں اس کی اہمیت کے بارے میں مزید مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو:

Brunner, Goodnow and Austin, *A Study of Thinking*

مصنفین درجہ بندی کے عمل کی تعریف یوں کرتے ہیں: ''یہ پہچان کا ایسا عمل ہے، جس کے ذریعے نامیاتی اجسام (حیوانات) اپنے اردگرد کے واقعات کو متعدد اصناف میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس طریقے سے درجہ بندی کے لیے کسی شے یا واقعے میں ایک مخصوص تعداد میں تعریفی خواص کا ہونا ضروری ہے تاکہ درجہ بند تمیز قائم ہو سکے۔ اس درجہ بندی کے وجود کا ثبوت یہ ہے کہ اس کی بنیاد پر نامیاتی اجسام اشیا اور واقعات کی بہت بڑی تعداد کو ایک گروہ کی شکل دے کر ان کے بارے میں مشترک اور یکساں ردِّعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ درجہ بندی طے ہونے کے بعد ہی یہ واضح رویہ ممکن ہے، ورنہ وہ ہر شے اور ہر واقعے کے بارے میں فرداً فرداً ردِّعمل ظاہر کرتے رہتے۔ اب وہ ایک گروہ کی اشیاء کو اس درجہ کے ایک فرد یا رُکن کے طور پر دیکھتے ہیں اور اس گروہ کے تمام ارکان کے بارے میں یکساں ردِّعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ (باب اوّل، صفحات ۱ تا ۲۴)۔

باب اوّل

کتاب کا موضوع اور دائرۂ کار

ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کا سرزمینِ عرب میں ظہور ہوا تو اس نے نہایت بنیادی دینی اصطلاحات کو رواج دیا اور قرآنِ کریم اس عظیم انقلاب کی اوّلین معتبر دستاویز ہے۔ اس سے بہت واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ اس بحران کے زمانے میں صدیوں سے رائج قبائلی اقدار کس طرح اسلام کے نئے تصورِ زندگی سے خون آشام تصادم پر کمربستہ ہوگئیں، کس طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئیں اور کس طرح بے مقصد اور مایوسانہ مدافعت کی کوششوں کے بعد آخرکار ناکام ہوئیں اور پھر اس نئی ابھرتی ہوئی قوت کے زیرِ نگیں آنے پر مجبور ہوئیں۔ اخلاقی سوچ کے مسائل میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے زمانۂ جاہلیت کی مشرکانہ زندگی سے لے کر اسلام کے ابتدائی دَور تک جزیرۂ عرب خصوصی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اس دَور میں ایک نئے اخلاقی ضابطے کی نمود اور نشوونما کے مطالعے کے لیے بہترین مواد اور شواہد ملتے ہیں۔

اس نام نہاد زمانۂ جہالت (جاہلیت) میں جو ظہورِ اسلام سے پہلے کے مشرکانہ دَور کا نام ہے، بدو عرب لوگوں میں مشرکانہ عقائد سے جُڑے ہوئے بے شمار عجیب و غریب تصورات اور رسوم و رواج موجود تھے۔ ان میں سے بہت سی رسوم و تقالید کو اسلام نے قطعی طور پر مسترد کر دیا کیونکہ وہ وحیِ الٰہی سے کسی طرح مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ تاہم ان میں سے بہت بڑی تعداد کو بعض ظاہری اور معنوی تبدیلیوں کے بعد بحال رکھا اور ان کو اعلیٰ اخلاقی تصورات کی شکل دے کر اسلامی اخلاقیات کے نئے ضابطے میں بدل دیا۔ ہمیں اُمید ہے کہ عربی زبان کی تاریخ کے اس فیصلہ ساز دَور میں اخلاقی اصطلاحات میں جو بنیادی تبدیلیاں آئیں، ان کے بغور مطالعے سے نہ صرف

اسلام کے اخلاقی ضابطے کی روحِ رواں منکشف ہوگی بلکہ اخلاقی کلامیات(۱) کی عمومی مبادیات پر مزید روشنی بھی پڑ سکے گی اور انسانی ثقافت میں اس کے کردار کا علم بھی ہو سکے گا۔

قرآنی فکر کا خصوصی مزاج اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم اخلاقی کلامیات کی تین مختلف سطحوں کو ایک دوسرے سے الگ پہچاننے کی کوشش کریں۔ قرآنِ کریم میں اخلاقی تصورات تین قسم کے ہیں، اوّل جو اللہ تعالیٰ کی اخلاقی صفات کو بیان کرتے ہیں۔ دوسرے جو خدا کے بارے میں، جو انسان کا خالق ہے، انسان کے بنیادی رویّے کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔ تیسرے وہ جو ان اصولوں اور قاعدوں کو بیان کرتے ہیں، جن سے اسلام کی معاشرت میں شامل اور وابستہ افراد کے مابین اخلاقی روابط منضبط ہوتے ہیں۔

پہلا گروہ ان الفاظ پر مشتمل ہے، جنھیں اسمائے حسنٰی یعنی اللہ تعالیٰ کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، مثلاً رحمٰن، رحیم، غفار، مقسط (انصاف کرنے والا)، جلیل۔ یہ نام اللہ تعالیٰ کی صفات کے مخصوص پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ دوسرے تمام سامی مذاہب کی طرح قرآنِ کریم میں بھی خدا کو ایسی ہستی بیان کیا گیا ہے جو اپنی اصل میں اخلاقی صفات کی حامل ہے۔ تصورات کی یہ قسم جسے بعد میں متکلمین نے مزید مطالعہ کے بعد صفاتِ الٰہی کے نظریے کا نام دیا، اسے اخلاقیاتِ الٰہیہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ الفاظ موجودہ کتاب کے دائرۂ کار سے باہر ہیں۔

الٰہی اخلاقیات کے بالمقابل انسانی اخلاقیات ہے جو تصورات کی باقی دو قسموں پر مشتمل ہے۔ دوسری قسم کا تعلق انسان کے خدا کے ساتھ بنیادی اخلاقی رشتے سے ہے۔ قرآنی تصور کے مطابق چونکہ اللہ تعالیٰ اخلاقی صفات کا مالک ہے اور انسانوں کے ساتھ اس کے معاملات اخلاقیات پر مبنی ہیں۔ اس لیے اس تصور کا تقاضا ہے کہ انسان کا جوابی رویّہ بھی اخلاقی ہو۔(۲)

قرآن کی زبان میں اعمالِ خداوندی کے جواب میں انسان کے اخلاقی

رویّے کا نام دین ہے۔ یہ مطالبہ کہ بنی نوع انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے بنیادی رویّے کے جواب میں انسانی رویّہ اس طرح ہو یا انسان کو اللہ کے اوامر و نواہی کے مطابق یوں عمل کرنا چاہیے، اخلاقی تعلیم بھی ہے اور دین بھی۔ اس مفہوم میں دوسرے گروہ کے تمام تصورات اخلاقی دینی تصورات ہیں۔ قرآنِ کریم میں موجود اخلاقی دینی تصورات کی یہ مخصوص قسم اس کتاب کے مطالعے کا اصل موضوع ہے۔

تیسری قسم کا تعلق ایک ہی معاشرے میں رہنے والے انسانوں کے باہمی اخلاقی رویّوں سے ہے۔ افراد کی سماجی زندگی کو اخلاقی اصولوں کے ایک مخصوص مجموعے اور اس کے ضمنی قواعد کے ذریعے ضبط میں لایا جاتا ہے۔ انہی قواعد سے سماجی اخلاقیات کا نظام وجود میں آتا ہے۔ نزولِ قرآن کے بعد کے زمانے میں انہی قواعد کی بنیاد پر فقۂ اسلامی کا وسیع نظام تعمیر ہوا۔ صحیح معنوں میں الفاظ کی یہ قسم بھی اس کتاب کے دائرے میں نہیں آتی۔ البتہ گاہے بگاہے اس کا حوالہ ضرور آئے گا، خصوصاً اس کتاب کے پہلے حصے میں جہاں ہم قرآنِ کریم اور زمانۂ جاہلیت کے اخلاقی اصولوں میں فرق کو سمجھنے کی کوشش کریں گے، وہاں سماجی اخلاقیات کی اصطلاحات کا ذکر ناگزیر ہوگا۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ تینوں قسمیں کسی طرح بھی ایک دوسرے سے مکمل طور پر الگ نہیں ہیں، بلکہ باہمی طور پر مربوط ہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ قرآنی تصورِ کائنات کا مرکز اصل میں خدا کا تصور ہے جو پوری کائنات کو محیط ہے۔ اس کائنات کا ایک ذرّہ بھی اس کے علم اور عنایات سے باہر نہیں۔ معنویات کے نقطۂ نظر سے اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں کوئی بھی اہم تصور، تصورِ الٰہی سے الگ وجود نہیں رکھتا۔ اور یہ کہ انسانی اخلاقیات کے میدان میں قرآن کے تمام کلیدی تصورات یا فطرتِ الٰہیہ کا ہلکا سا پرتو ہیں، جو بہت ہی نامکمل مشابہت کے حامل ہیں۔ یا اعمالِ خداوندی سے استنباط شدہ ہیں۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ دینی اخلاقیات کی اصطلاحات کی یہ دوسری قسم بالآخر دو نہایت اہم تصورات پر مبنی ہے، جو کھل کر ایک دوسرے کے مقابل نظر آتے

ہیں۔ ایک طرف اللہ پر مکمل بھروسہ اور دوسری طرف اللہ کا ڈر۔[۳] یہ تقابل درحقیقت ایک مؤمن کے ذہن میں موجود اس دوئی کا پرتو ہے، جس کا مشاہدہ وہ خود اللہ کی صفات میں کرتا ہے۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ مطلق اچھائی، رحمت، کرم اور عنایت کا نام ہے اور دوسری جانب وہ نافرمانوں کے لیے قہر، انتقام اور عذاب کا نام ہے۔ انسانی اخلاقیات یعنی انسان کا خدا کے بارے میں دینی اخلاقی رویہ انہی معنوں میں اخلاقیاتِ الٰہیہ کا پرتو ہے۔

بنیادی طور پر یہی بات تصورات کی تیسری قسم کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے، جو مسلم معاشرے کے مختلف افراد کے مابین اخلاقی روابط کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔ انسان کو اپنے ہم جنسوں کے ساتھ انصاف اور نیکی سے پیش آنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ مطلق انصاف اور راستی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ انسان کو کبھی دوسروں پر ظلم نہیں کرنا چاہیے کیونکہ خدا کبھی کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ قرآنِ کریم میں بار بار کہا گیا ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملات میں نہ دوسروں پر ظلم کرے، نہ خود پر ظلم کرے۔ یہ بات خود اللہ کی صفت کی مظہر ہے، جو دہرا دہرا کر یہ کہتا ہے کہ وہ کبھی ظلم نہیں کرے گا۔ ایک چیونٹی کے وزن برابر بھی نہیں اور ایک کھجور کے ریشے جتنا بھی نہیں۔ ایک آیت میں اعلان ہے کہ

وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ۔ (ق:۲۹)

اور نہ میں اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا ہوں۔[۴]

قرآن کریم یہ بھی سکھلاتا ہے کہ جب کسی کے ماں باپ بڑھاپے کو پہنچیں تو وہ ان کے ساتھ انتہائی مہربانی اور رحم سے پیش آئے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ
اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ
وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ
الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا۔ (بنی

اسرائیل:۲۳-۲۴)

اور تیرا پروردگار صاف صاف حکم دے چکا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا۔ اگر تیری موجودگی میں ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کے آگے اُف تک نہ کہنا۔ نہ اُنہیں ڈانٹ ڈپٹ کرنا، بلکہ ان کے ساتھ ادب و احترام سے بات چیت کرنا۔ اور عاجزی اور رحمت کے ساتھ ان کے سامنے تواضع کا بازو پست رکھے رکھنا اور دُعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار! ان پر ویسا ہی رحم کر، جیسا کہ اُنہوں نے میرے بچپن میں میری پرورش کی ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ فطرتِ الٰہی اور انسانی اخلاقیات کے مابین ربط کی کڑی کو رحمت کے کلیدی تصور کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جو وجود کے دو مختلف نظامات میں مشترک بتایا گیا ہے۔ اور اگر ہم اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کے رحمان اور رحیم ہونے کی صفات کا ذکر کرتے نہیں تھکتا تو یہ سمجھنے میں مشکل نہیں ہوگی کہ قرآنی تصورات میں انسانی رحمت دراصل انسان کی جانب سے اللہ کی رحمت کی پیروی کی کوشش ہے۔

انسانی اخلاقیات کا اخلاقیاتِ الٰہیہ پر مبنی ہونا مندرجہ ذیل آیت سے مزید واضح ہوکر سامنے آتا ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو دوسروں کے ساتھ عفو و درگذر سے پیش آنا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ عفو و درگذر سے کام لیتا ہے۔

وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْآ اُولِی الْقُرْبٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَالْمُهٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَکُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔

(النور:۲۲)

تم میں سے جن کے پاس زیادہ ہے اور فراخی ہے،
انہیں اپنے قرابت داروں، مسکینوں اور اللہ کی راہ میں مہاجروں کو
نہ دینے کی قسم نہیں کھانی چاہیے، بلکہ معاف کر دینا اور درگذر کرنا
چاہیے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے قصور معاف
فرمائے۔ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اخلاقی تصورات کی تینوں قسموں کے باہمی ربط کی وضاحت کے لیے اتنا کافی ہے۔ انسانی اخلاقیات سے متعلق قرآن کے اہم تصورات کا تجزیہ کرتے وقت ہمیں کبھی یہ بھولنا نہیں چاہیے کہ ان کا اللہ تعالیٰ کی اخلاقی فطرت سے رشتہ بنیادی ہے۔

اخلاقیات سے متعلق جدید تحریروں کا خاصہ یہ ہے کہ جب ماہرینِ فلسفہ اخلاقیاتی زبان کے مزاج اور ساخت کی بات کرتے ہیں تو وہ زیادہ تر اخلاقیاتی خطاب کے دوسرے درجے کے الفاظ مثلاً 'اچھے' اور 'برے' تک محدود رہتے ہیں۔ وہ مسائل کی ایسی بحثوں میں الجھے رہتے ہیں، جو کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ مثلاً ''فلاں اچھا ہے۔'' تو اس جملے کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ کیا دنیا میں نیکی کے خواص نام کی چیزیں وجود رکھتی ہیں؟ کیا نیکی کسی موجود چیز کی خاصیت بیان کرتی ہے یا محض جذبات کے اظہار کا نام ہے؟ ہمیں ان سوالوں کی اہمیت سے انکار نہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ان سوالات میں الجھ کر ماہرینِ اخلاقیات ایک بہت ہی اہم حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اصل زندگی میں اخلاقی اقدار کا تعین عام طور پر خطاب کے بہت ہی ابتدائی درجے میں ہو جاتا ہے۔

روزمرہ صورتِ حال میں ہم دوسرے لوگوں کے بارے میں اخلاقی فیصلے یہ کہہ کر سناتے ہیں کہ فلاں بہت نیک شخص ہے یا فلاں شخص منافق ہے۔ 'نیک' اور 'منافق'، دراصل 'مسکین'، 'سخی' اور 'کنجوس' کی طرح پہلے درجے کی اخلاقی اصطلاحات ہیں۔ ان اصطلاحات اور ان سے ملتے جلتے الفاظ کا نظام درحقیقت کسی معاشرے کے اخلاقی ضابطے کی صحیح خصوصیت کا تعین کرتا ہے۔ پہلے درجے کے الفاظ اپنی اصل میں بیانیہ الفاظ ہیں، جبکہ دوسرے درجے میں یہ اخلاقی الفاظ اقدار کی خصوصیات رکھتے

ہیں۔ لفظ سخی اپنے ابتدائی اور متبادر مفہوم میں بیانی لفظ ہے۔ تاہم اس حیثیت سے کہ یہ سخاوت کی صفت کو قابلِ تعریف قرار دیتا ہے، یہ لفظ صرف بیان تک محدود نہیں رہتا۔ چنانچہ یہ لفظ اپنے ابتدائی درجے اور معنوں میں بیانیہ لیکن دوسرے درجے میں اس کی قدر بھی بتلاتا ہے۔

پہلے درجے کی اخلاقی اصطلاحات دراصل روزمرہ بیانیہ الفاظ ہیں، جن سے اہم اخلاقی مطالب ادا کیے جاتے ہیں۔ دوسرے درجے کی اخلاقی اصطلاحات کا کام درجہ بندی ہے، ان کے ذریعے مختلف بیانیہ خصوصیات کی درجہ بندی کی جاتی ہے تاکہ وہ اخلاقی اقدار کی ایسی قسم میں بدل جائیں جسے سب جانتے اور مانتے ہوں، مثلاً سخاوت، انکساری۔ جب ہم کسی شخص کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ اچھا آدمی ہے کیونکہ اس میں انکساری کی ساری مخصوص صفات پائی جاتی ہیں، تو ہم انکساری کی صفت کو قابلِ تعریف صفات کے درجے میں جگہ دے رہے ہوتے ہیں۔ ان معنوں میں دوسرے درجے کی اخلاقی اصطلاحات کو بجاطور پر اخلاقی مابعداللغات کہہ سکتے ہیں۔ اخلاقیات کے ضمن میں یہ پہلے اور دوسرے درجے کا امتیاز کم و بیش اسی طرح کا امتیاز ہے، جو اہلِ منطق موضوعی الفاظ اور منطقی الفاظ میں کرتے ہیں۔

مختصراً پہلے درجے کے اخلاقی الفاظ بیانیہ الفاظ ہیں، جن میں اخلاقی یا اقداری قوت پائی جاتی ہے۔ ذہن نشین رہے کہ جب ہم کسی معاشرت کی اخلاقی لغات کا تجزیہ کرتے ہیں تو لسانی نقطۂ نظر سے اخلاقی ضابطے کا عمومی ذخیرۂ الفاظ اسی درجے کے الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے۔ بالکل یہی بات قرآنِ کریم کے اخلاقی ضابطے پر بھی صادق آتی ہے۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن کے نزول کے وقت عربوں کے ہاں نیکی اور بدی کا مجرد تصور موجود نہیں تھا۔ یہاں درحقیقت مختلف انداز سے یہ کہا جا رہا ہے کہ قرآنِ کریم کا اخلاقی ضابطہ اصل میں اخلاقی اصطلاحات کے پہلے درجے پر کارفرما ہے۔ یہ نکتہ اور بھی واضح طریقے سے سامنے آتا ہے، جب ہم احکام کی اس پنجگانہ تقسیم

پر عمومی نظر ڈالیں جو فقہا نے بعد کے اَدوار میں مرتب کی اور جو اخلاقی اصطلاحات کے دوسرے درجے کی مثال ہے۔

۱۔ واجب یا لازمی: اللہ کے بتائے ہوئے فرائض، جن کا بجا لانا قطعاً ضروری ہے اور جن کے ترک پر قانون لازمی سزا دیتا ہے۔

۲۔ مندوب یا پسندیدہ:(۵) وہ فرائض جن کا بجا لانا لازمی نہیں لیکن قابلِ ستائش ہے۔ ان کے بجالانے پر ثواب ہے، لیکن ترک کرنے پر سزا لازمی نہیں۔

۳۔ جائز: بیچ کا درجہ:(۶) ایسے کام جن کا کرنا نہ کرنا برابر ہے، کرنے پر ثواب یا نہ کرنے پر سزا لازمی نہیں۔

۴۔ مکروہ، ناپسندیدہ: ایسے کام جو ناپسندیدہ ہیں، لیکن حرام یا منع نہیں۔ ان کے نہ کرنے پر ثواب ہے، لیکن کرنے پر سزا نہیں۔

۵۔ محظور، ممنوع:(۷) ایسے کام جن سے اللہ نے منع کیا ہے اور ان کے ارتکاب پر قانون لازماً سزا دیتا ہے۔

مسلمان کے افعال کی یہ پنجگانہ درجہ بندی مابعداللسان تفصیلی نظام کی مثال ہے، جس میں ہر فعل کو ایک خاص درجے میں رکھا گیا ہے اور نیکی اور بدی کے ایک مقررہ معیار کے مطابق اس کو ناپا جاتا ہے۔ ان اصطلاحات کا کام واضح خواص بیان کرنا نہیں، بلکہ یہ طے کرنا ہے کہ کوئی بھی انسانی فعل اخلاقی اقدار کے ان پانچ درجوں میں کس سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرے درجے کی اخلاقی اصطلاحات کی درجہ بندی کا یہ تفصیلی نظام قرآنِ کریم میں نہیں دیا گیا۔ یہ ایک فوقانی تعمیر ہے۔ مسلمان کی اخلاقی زندگی کی اصل بنیاد تو اخلاقی اقدار کے اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ نظام پر قائم ہے جو خطاب(۸) کے پہلے درجے میں بیان کردہ ان گنت اخلاقی الفاظ سے عبارت ہے۔

یہ بات نہیں کہ قرآن کریم کی اخلاقیات سے مافوق اللسان درجے کے الفاظ موجود نہیں ہیں۔ یقیناً قرآنِ کریم میں ایسے الفاظ ہیں، جو بیان سے زیادہ اقدار کے تعین کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ گیارھویں باب کے سارے نہیں تو اکثر الفاظ نیک اور

بد کے مفہوم میں کم از کم اپنے استعمال کے سیاق میں صحیح معنوں میں دوسرے درجے کی اخلاقی اصطلاحات کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً لفظ خیر اور شر اچھے اور برے کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ گناہ کے معنوں میں بولے گئے الفاظ مثلاً ذنب اور اثم بیانیہ سے زیادہ قدری درجہ بندی کے الفاظ ہیں، مزاج اور کردار دونوں اعتبار سے۔ تاہم زیادہ اہم یہ بات ہے کہ وہ اپنی ذات سے اخلاقی افکار کا مکمل نظام تشکیل نہیں دیتے۔ قرآنِ کریم میں اخلاقی افکار کا جو نظام کارفرما ہے، وہ محض پہلے درجے کے قدری الفاظ پر مشتمل ہے۔

ہم دونوں درجوں میں فرق کو چند حقیقی مثالوں کے ذریعے واضح کرتے ہیں۔ مثلاً لفظ کفر کو لیجیے جو قرآنِ کریم کے قدری الفاظ میں نہایت اہم لفظ ہے۔ اس لفظ سے مراد ناشکری کا وہ رویّہ ہے جو حاصل شدہ نعمتوں اور مہربانیوں کے مقابلے میں اختیار کیا جائے۔ اس لحاظ سے یہ صحیح معنوں میں بیانیہ لفظ ہے جو ٹھوس حقائق پر مبنی ہے۔ تاہم اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح ہے کہ اس لفظ کا ایک قدری ہالہ بھی ہے جو اس کے بیانیہ معانی کے بیچوں بیچ موجود ہے، جس کی وجہ سے کفر پہلے درجے کی اصلی اخلاقی اصطلاح بن جاتا ہے۔ اس لفظ کا موازنہ ذنب (گناہ) اور اس طرح کے دوسرے الفاظ سے کیا جائے جو دراصل مافوق اللسان درجے سے تعلق رکھتے ہیں تو یہ بات پوری طرح صاف ہو جائے گی۔

قرآنِ کریم میں ذنب اکثر کفر کے ہم معنی استعمال ہوا ہے۔ اپنے آخری معنوں میں دونوں سے ایک صورتِ حال مراد ہوتی ہے۔ لیکن یہ دو الفاظ اس ایک ہی صورتِ حال کو دو مختلف مخصوص زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ لفظ کفر بنیادی طور پر ناشکرے یا منکر کے بارے میں حقیقی صورتِ حال کو بیان کرتا ہے اور صرف دوسرے درجے میں بتاتا ہے کہ یہ بری بات ہے۔ اس کے برعکس لفظ ذنب اپنے اوّلین معنوں میں اس صورتِ حال کی مذمت کرتا ہے کیونکہ اس لفظ کا تعلق منفی یا ناپسندیدہ صفات سے ہے۔ اوّل الذکر میں قدری قوت ایک ہالے کی طرح موجود ہے، لیکن دوسرے لفظ میں یہ

قدری صفت اس کے معنویاتی ڈھانچے کا حصہ ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ پہلے درجے کی اخلاقی اصطلاحات کے معنویاتی مزاج کو سمجھنے کے لیے ہمیں بیان اور قدر کی دو مختلف تہوں کو الگ کر کے دیکھنا ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ معنوں کی یہ دونوں تہیں مل کر حقیقی معنویاتی اکائی بناتی ہیں، لیکن نظریاتی طور پر یہ ممکن بلکہ ضروری ہے کہ ان کے درمیان امتیاز کیا جائے۔ چنانچہ زمانۂ جاہلیت کے غیر دینی سیاق میں، انکساری اور سر جھکانا شرمناک سمجھا جاتا تھا۔ یہ کمزور اور پست کردار شخصیت کا خاصہ تھا۔ اس کے مقابلے میں غرور اور سرکشی قبلِ اسلام عرب کی نظروں میں شرافت کی علامت تھی۔ ظہورِ اسلام کے بعد پانسہ پوری طرح پلٹ گیا۔ اب اسلام کے خالص توحیدی سیاق میں اللہ کے حضور میں عاجزی اور سر جھکانا سب سے اونچی نیکی اور غرور اور سرکشی بے دینی کا نشان ٹھہرا۔ دوسرے الفاظ میں ان ذاتی صفات کی قدر مکمل طور پر بدل گئی۔ ان الفاظ کے بیانیہ معانی کی تہ اسی طرح برقرار رہی، لیکن ان کی قدری قوت منفی سے مثبت اور مثبت سے منفی شکل اختیار کر گئی۔

اس بات پر بحث ہو سکتی ہے کہ اخلاقی معاملات میں مافوق اللسان اور موضوعاتی زبان کی تہوں کو بہت صراحت کے ساتھ الگ نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ اگر یہ دو تہیں واقعی وجود رکھتی ہیں، تب بھی یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ کسی حد تک یہ اعتراض صحیح ہے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جہاں تک عام زبان کا تعلق ہے، ہر چیز پہلے درجے پر شروع ہوتی ہے، حتیٰ کہ زبان کی نشوونما کے عالمگیر اصولوں کے مطابق جن اصطلاحات کو ہم دوسرے درجے میں شمار کر رہے ہیں، وہ بھی بیانیہ الفاظ کے زمرے میں پیدا ہوتے ہیں اور پھر نشوونما کے کئی مرحلوں سے گذر کر مثالی قسم کے خالص قدری الفاظ بنتے ہیں۔ چنانچہ ایک طرح سے اخلاقی کلام کے دونوں مدارج میں جتنے بھی امتیازات ہیں، انہیں آخری معنوں میں 'کم و بیش' ایک ہی درجے میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن دوسرے موضوعات کی طرح یہاں بھی درجوں کا اختلاف جب ایک خاص حد سے بڑھ جائے تو وہ ایک قسم

کا اختلاف بن جاتا ہے۔ چنانچہ دوسرے درجے کی نمائندہ اخلاقی اصطلاحات مثلاً 'اچھا' میں بیانیہ پہلو بھی موجود رہتا ہے۔ صرف یہ ہے کہ لفظ اچھا کے معانی میں یہ بیانیہ پہلو اتنا معمولی اور غیراہم ہے کہ اگر اس کے قدری پہلو سے موازنہ کیا جائے تو ہم اسے بلاجھجک اخلاقیات کے مافوق اللسان ذخیرے میں شامل کر سکتے ہیں۔

لفظ 'اچھا' کی طرح کے خالص قدری الفاظ قرآنِ کریم میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ قرآنی ضابطۂ اخلاق لغوی ساخت کے اعتبار سے زیادہ تر اس پہلے درجے کی اخلاقی اصطلاحات پر مشتمل ہے، جس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ دوسرے درجے کی اصطلاحات اِکّا دُکّا استعمال ہوئی ہیں۔ اخلاقیات کی باقاعدہ منظّم مافوق اللسان اصطلاحات اسلام کی ابتدائی صدیوں میں علمِ فقہ کے ہاتھوں تشکیل پائیں۔ قرآنِ کریم کے اخلاقی ضمیر کی تشکیل میں پہلے درجے کی اصطلاحات ہی نمایاں طور پر کارفرما ہیں۔

حواشی:

(۱) خطاب (Discourse)

(۲) اس پہلو پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے:

Izutsu: *God and Man in the Koran* (Tokyo, 1964), Chapter IX.

(۳) قرآنِ کریم میں بھروسہ کے تصور کو اسلام اور ایمان کی اصطلاحات کے ساتھ اور ڈر کو تقویٰ کی اصطلاح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

(۴) ظَلّام لفظ ظالم کے مبالغے کی شکل ہے۔ آیت میں اس مبالغے کے ساتھ ظلم کی مطلق نفی مراد ہے۔

(۵) انہیں مسنون بھی کہا گیا ہے۔ (مترجم)

(۶) انہیں مباح بھی کہا گیا ہے۔ (مترجم)

(۷) انہیں حرام بھی کہا گیا ہے۔ (مترجم)

(۸) خطاب (Discourse)

باب دوم

معنویاتی تجزیے کا طریقِ کار

کسی اجنبی زبان کے الفاظ کا مطلب معلوم کرنے کے بہت سے طریقے ہو سکتے ہیں۔ ان میں سب سے عام اور سب سے سادہ یہ ہے کہ اپنی زبان میں اس لفظ کا مترادف اور ہم معنی لفظ تلاش کیا جائے، لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ یہ طریقہ سب سے زیادہ غیر معتبر ہے۔ مثلاً جرمن لفظ 'گاٹ'(۱) کا مترادف انگریزی زبان میں 'ہز بنڈ'(۲) (شوہر) ہے۔ اسی طرح عربی لفظ 'کافر' کے معنی لغت میں 'بے دین' اور 'بدعقیدہ'، 'ظالم' کے معنی 'برائی کرنے والا' اور 'ناانصاف' اور 'ذنب' کے معنی 'گناہ' بتائے گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ معانی کی ان مثالوں میں سے ہر ایک میں کسی نہ کسی طور معنوی مماثلت موجود ہے، لیکن دوسری طرف عربی زبان سے آگاہی رکھنے والے جانتے ہیں کہ قدرے غور کے بعد پتہ چلتا ہے کہ بظاہر مترادف الفاظ اصل الفاظ کے معنی کما حقہٗ ادا نہیں کر سکتے۔ مثلاً 'ناانصاف' یا 'برائی کرنے والا' پوری طرح 'ظالم' کا مفہوم ادا نہیں کرتا۔ اسی طرح 'کافر' اور 'بے دین' کے معانی میں جو فرق ہے، اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ہم مقدمے میں واضح کر چکے ہیں کہ محض مترادفات کی بنیاد پر استنباط اکثر غلط نتائج کی طرف لے جاتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ترجمہ اکثر اوقات مطلب سے آگاہی کی بجائے غلط فہمی کا موجب بنتا ہے۔ اس کی وجہ سمجھنا بہت آسان ہے۔

رچرڈ رابنسن (۳) نے بجا طور پر وضاحت کی ہے کہ ایک لفظ کی دوسرے لفظ سے تعریف کے طریقے میں یہ احتمال رہتا ہے کہ وہ دراصل لفظ کے مقابلے میں چیز سے تعریف کے طریقے میں نہ بدل جائے۔ مثلاً 'گاٹ' کا معنی 'شوہر' بظاہر ایک لفظ کی دوسرے لفظ سے تعریف ہے لیکن اگر سننے والا جانتا ہے کہ لفظ شوہر سے مراد کیا ہے تو یہ

چیز کے حوالے سے لفظ کی تعریف بن جاتی ہے۔

ظالم:

بالکل اسی طرح 'ظالم' کا معنی 'برا' بھی نامکمل ہے۔ جو لوگ صرف 'برا' کے معنی سے واقف ہیں تو اس صورتِ حال میں ان کے لیے لفظ 'ظالم' کا مطلب جاننے کے لیے صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اس لفظ کو 'برا' کے معانی کے خانے میں ڈال دیا جائے۔ بالفاظِ دیگر وہ 'ظالم' کے معنی سمجھ سکتے ہیں، تو براہِ راست نہیں، بلکہ صرف 'برا' کے مفاہیم پر قیاس کر کے ہی اس کا مطلب جان سکتے ہیں۔ کسی لفظ کے معانی کسی ایسے دوسرے لفظ کے ذریعے معلوم کرنے میں جو کسی اجنبی ثقافت کی روایت میں پلا بڑھا ہو، یہ خطرہ لازماً موجود رہتا ہے کہ اس کا مطلب کچھ کا کچھ ہو جائے۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے ایسے اقدامات ضروری ہیں کہ لفظ سے لفظ کی تعریف (ظالم کے معنی برا) کو بالواسطہ لفظ سے چیز کی تعریف میں نہ بدلیں بلکہ براہِ راست تعریف کا طریقہ اپنائیں جس میں لفظ کا رشتہ کسی غیرلسانی حقیقت سے بلاواسطہ قائم ہو جائے۔

'ظالم' کا ترجمہ 'برائی کرنے والا' یا 'بدکار'، ظالم کے معنی معلوم کرنے کا آسان اور عارضی طریقہ تو ہو سکتا ہے اور غالباً کوئی شخص بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ زبان سیکھنے کے پہلے عملی قدم کے طور پر یہ مفید بھی ہے۔ لیکن یہ صرف پہلا ہی قدم ہے۔ اگر ہم لفظ کے معنی اور مفہوم کو پوری طرح سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں مزید کھوج لگانا ہوگا کہ قدیم عربی زبان اور اس کتاب کے حوالے سے قرآنِ کریم میں یہ لفظ واقعتاً کس قسم کے انسان، کس قسم کی اخلاقی صفات اور کس قسم کے عمل کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔ اس کھوج کے لیے صرف ایک مثال بھی کافی ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ یہ مثال موضوع سے متعلق ہو اور بہت احتیاط سے انتخاب کی گئی ہو۔ مثلاً سورۂ اعراف (۴۴-۴۵) میں ہے:

لَعنَةُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِینَ۔ اَلّذِینَ یَصُدُّونَ عَن سبیلِ
اللّٰہِ وَیبغُونَہا عوجا وَھم بِالآخرۃِ کٰفِرونَ۔ (اعراف:

٤٤-٤٥)

اللہ کی مار ہو ان ظالموں پر جو اللہ کی راہ سے اعراض
کرتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کرتے رہتے ہیں اور وہ لوگ
آخرت کے بھی منکر ہیں۔

کیا یہ آیت بذاتِ خود ظالم کی لفظی تعریف پر مشتمل نہیں؟ قرآنِ کریم میں اسی لفظ کے استعمال کی اس طرح کی مثالیں کثیر تعداد میں ملتی ہیں۔ ان کو یک جا جمع کر کے ایک دوسرے سے موازنہ اور محاکمہ کرنے کے بعد کیا یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ہم کسی حد تک اس عربی لفظ کی تعریف لفظ سے چیز کے طریقے کی جگہ اصل تعریف بیان کر سکیں گے؟ یہ یقیناً ممکن ہے اور ہم آئندہ بہت سی مثالوں سے اسے واضح کریں گے۔

آیئے اب لفظ 'کافر' کے معانی ('بے ایمان'، 'بے دین'، 'بدعقیدہ'، 'نہ ماننے والا') کا جائزہ لیں۔ پہلی ہی نظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ خود اصل لفظ اور ترجمے کے الفاظ کی ظاہری ساخت میں ہی بنیادی فرق ہے (ترجمے کے الفاظ مرکب اور سلبی ہیں)۔ اس کے برعکس 'مروّہ' مردانگی کے معانی کی مساوات کو لیں، جس پر ہم تھوڑی دیر میں بات کریں گے۔ یہاں مساوات کے دونوں اطراف کے الفاظ کی ظاہری ساخت میں کسی حد تک مطابقت ہے۔ عربی لفظ کافر اوّل تو ایک مستقل اور غیر مرکب مادہ ہے، اس کو مزید اجزا میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے مقابلے میں مترادف ترجمے کے کسی بھی لفظ کو لیں۔ ہر ایک صریح طور پر دو اجزا پر مشتمل ہے۔

(۱) ایک جز سلبی یا منفی مفہوم دیتا ہے۔ 'بے'، 'بد'، 'نہ'۔

(۲) دوسرا جز مفہوم کے مادی یا مثبت عنصر کی نشان دہی کرتا ہے۔

یہ مثبت مفہوم 'ایمان و دین'، 'عقیدہ'، 'ماننے والا' ہیں۔ گویا ترجمے کے مترادفات میں کافر کے مفہوم میں بنیادی عنصر ایمان اور دین کا ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ عربی لفظ کافر کے معانی کے مضمرات میں سے ایک اہم عنصر ایمان بھی ہے۔ لیکن یہ نہ بھولیے کہ ایمان اس لفظ کا اکیلا بنیادی معنوی عنصر نہیں

ہے اور نہ ہی اس کا اصل عنصر ہے۔ قبل اسلام ادب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس لفظ کی معنوی ساخت کا حقیقی اور مرکزی عنصر 'بے ایمان' قطعاً نہیں تھا۔ اپنی اصل میں لفظ کافر درحقیقت 'شاکر' (شکرگزار) کا متضاد تھا۔

جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، دینِ اسلام میں ایمان کے مفہوم کا کلیدی عنصر 'احسان مندی' اور 'شکر' ہے۔ دراصل شکر اور احسان قرآن میں خدا کے تصور میں اس کے رحمان اور رحیم اور انسان اور کائنات کے رب ہونے کی صفات کے متوازی اور متقابل مفاہیم ہیں۔ درحقیقت قرآنِ کریم بار بار اللہ جل جلالہٗ کی جانب سے تمام مخلوقات پر اس کی بے غرضانہ رحمت کے عمل پر زور دیتا ہے۔ اس کے جواب میں انسان کا فرض ہے کہ وہ فضل و انعام کے اس سلوک پر اس کا شکر بجا لائے۔ کافر وہ انسان ہے جو اپنے اعمال سے نہ اس احسان مندی اور شکر کا اظہار کرتا ہے اور نہ کرنا چاہتا ہے۔

قرآنِ کریم میں لفظ کافر کے یہ تابع معنی اُبھر کر آتے ہیں: وہ شخص جو خدا پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں یہ لفظ کثرت سے 'مؤمن' اور 'مسلم' کے بالمقابل استعمال ہوا ہے۔ مؤمن کے معنی ہیں ''وہ شخص جو کسی چیز کے سچا ہونے میں قطعی یقین رکھتا ہے'' یا 'جو ایمان رکھتا ہے'۔ 'مسلم' کا معنی ہے ''وہ شخص جس نے اپنے کو اللہ کی رضا کے سپرد کر دیا۔'' عمومی قاعدے کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ ہر معنویاتی نشوونما میں اپنے ان قریبی الفاظ سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے، جو اُسی معنویاتی میدان سے تعلق رکھتے ہوں۔ اور جب لفظ کا مزاج ایسا ہو کہ وہ اپنے متضاد کے بالمقابل ایک مخصوص سیاق میں بار بار استعمال ہو تو لازماً وہ اس سے ایک نمایاں معنویاتی قدر کا اکتساب کرتا ہے۔ چنانچہ لفظ کافر ایک ہی لفظ ہوتے ہوئے بھی جب لفظ 'شاکر' کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے تو ایک معنی ہوتے ہیں اور لفظ مومن کے مقابل دوسرے۔ پہلی صورت میں ناشکری اور دوسرے میں ایمان نہ رکھنے والا۔ جونہی ہم لفظ کافر کے معنی صرف ایمان کے حوالے سے کرنے لگتے ہیں، تو اس کا پہلا معنویاتی عنصر جو درحقیقت اس کا کلیدی عنصر ہے، نظروں سے پوری طرح اوجھل ہو جاتا ہے۔

جب ہم زندگی کے ان پہلوؤں کی طرف آتے ہیں، جہاں صرف ایک مخصوص زاویہ غالب ہوتا ہے اور جہاں زبان کا اولین کام یہ ٹھہرتا ہے کہ وہ لوگوں کی زندگی کے قومی اور نسلی عنصر کی صحت اور صراحت سے انعکاسی کرے، وہاں الفاظ اور ان کے اجنبی زبان کے مترادفات میں معنویاتی تفاوت بڑھ جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم یہ قاعدہ بنا سکتے ہیں کہ کوئی لفظ کسی ثقافت کے نسلی عنصر کی جس قدر گہرائی سے عکاسی کرتا ہے، اس کو کسی دوسری زبان میں صحیح طور پر منتقل کرنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ ہر زبان میں ایسے الفاظ کی خاص تعداد ہوتی ہے جن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً انگریزی کے لفظ 'ہیومر'(۴) فرانسیسی کے 'ایسپری'(۵) اور جرمن کے 'گیمٹ'(۶) کا صحیح اور مکمل ترجمہ نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح قدیم عربی زبان میں بھی ایسے الفاظ ہیں جو اسلامی اخلاقی ثقافت کی بجائے قبل اسلام جزیرہ نمائے عرب کی بدوی طرزِ زندگی سے مخصوص ہیں، مثلاً حماسہ، مروہ اور جہل۔ آر۔ اے نکلسن(۷) نے حماسہ کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس لفظ میں میدانِ جنگ میں شجاعت، مصیبت میں صبر، حصولِ انتقام میں ثابت قدمی، کمزور کی حفاظت اور طاقت ور کے خلاف بغاوت کے سارے مفاہیم کا امتزاج پایا جاتا ہے''۔ ہم آگے چل کر وضاحت کریں گے کہ یہ حماسہ کے سارے معانی کا احاطہ نہیں بلکہ ایک بہت ہی سرسری اور ابتدائی سا تخمینہ ہے۔ لیکن یہ ابتدائی معانی بھی 'بہادری'، 'جرأت' یا 'حوصلے' کے الفاظ سے ادا نہیں ہو سکتے، جو عام طور پر حماسہ کے ترجمے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

اب ہم ایک قدم آگے بڑھیں اور ان اعلیٰ اخلاقی قدروں کے ذخیرے میں دو اور بہت ہی اہم عناصر شامل کر دیں۔ ایک تو فیاضی اور سخاوت، جو صحرائی عربوں کی خصوصیت ہے اور جس کی عکاسی حاتم طائی کی داستانوں میں ملتی ہے اور دوسرے قبائلی مفادات کے ساتھ غیر متزلزل وفاداری، جو اتنی ہی اہم خوبی شمار ہوتی ہے۔ ان قدروں کے امتزاج سے اخلاقی قدر 'مروّہ' (مردانگی) سامنے آتی ہے۔ لفظ مروت بدوی ثقافت میں اخلاق کے اعلیٰ ترین تصور اور سب سے بڑی خوبی کو بیان کرتا ہے، بلکہ یوں کہیے

کہ اس میں صحرائی ثقافت کی ساری مثالی اقدار جمع ہوگئی ہیں۔ لفظ مروّہ اپنی ظاہری شکل میں بہت صاف طور پر 'مردانگی' کے مصداق نظر آتا ہے۔ دونوں کا بنیادی لغوی مادہ 'مرد' (بمقابلہ 'عورت') ہے۔

دونوں میں اشتقاق کی شکل بھی مماثل ہے جو کسی لفظ کے مادے کے آخر میں شامل ہو کر خوبی اور خاصیت کا مجرد مفہوم پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ اشتقاق کے اعتبار سے مروّہ کا مطلب ہوگا: ''مرد ہونے کی خاصیت''۔ لہٰذا ہم پورے اطمینان سے 'مردانگی' کو مروّہ کا صحیح اور مکمل مترادف کہہ سکتے ہیں۔ یہ بات ایسے سیاق میں صحیح بھی ہوگی جہاں صحتِ معنوی میں دقتِ نظر ضروری نہ ہو۔ تاہم یہ حقیقت قابلِ فراموش نہیں کہ ان دونوں الفاظ میں مماثلت محض ان کی ظاہری ساخت تک محدود ہے۔ یہی وہ حدِ فاصل ہے جہاں خالص ظاہری مفہوم ختم ہو کر حقیقی معانی کے مسائل شروع ہوتے ہیں۔ کیونکہ لازمی بات ہے کہ جوں جوں 'مرد' کی بعض خصوصیات کو اس معنویاتی اصطلاح کے کلیدی خصائص قرار دیا جائے گا، اس کے ساتھ ساتھ مردانگی کے معانی بدلتے جائیں گے۔

مرد کے خصائل کے اختصاص اور انتخاب کی عملی طور پر کوئی حد متعین نہیں کی جا سکتی۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ تمام زبانیں 'مرد ہونے کی خصوصیت' کو معاشرتی زندگی کے لیے اتنا ہی اہم سمجھنے پر اتفاق کرتی ہیں کہ اسے ایک مستقل لغوی شکل دینا ضروری قرار دیتی ہیں، تب بھی ہر زبان اپنے مخصوص طریقے سے 'مرد' کے متعدد خصائل میں سے چند کا انتخاب کرے گی اور اپنے طریقے سے ان منتخب عناصر کو ترتیب دے کر ایک مخصوص معنوی شکل پیدا کرے گی۔ یہی صورتِ حال عربی لفظ 'مروّہ' کی ہے۔ معنی کے لحاظ سے 'مروّہ' کے مفہوم کے پس منظر میں صحرائے عرب کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی بدوی زندگی کی طویل تاریخ ہے۔ صحرائی زندگی سے اس کی وابستگی اتنی گہری ہے کہ اس زندگی کی تفصیلات بتائے بغیر اس کا مفہوم سمجھایا نہیں جا سکتا۔

مذکورہ بالا تین الفاظ (حماسہ، مروّہ اور جہل) میں جہل کی کہانی ذرا مختلف ہے۔ چونکہ اس لفظ کا موضوعِ بحث سے براہِ راست تعلق ہے، اس لیے ہم اس کی معنوی شکل کی بنیادی ساخت کو ذرا تفصیل سے بیان کریں گے۔ ہم حتیٰ الامکان وہ

باتیں نہیں دہرائیں گے، جو کئی سال پہلے اگناتس گولڈ زیہر (۸) نے بیان کی تھیں۔

گولڈ زیہر کی تحقیقات کی اشاعت سے پہلے جن میں اس نے حتمی طریقے سے بتایا ہے کہ اس لفظ کو صحیح طور پر سمجھنے کا کیا طریقہ ہے، یہ خیال تھا کہ جہل 'علم' کی عین ضد ہے۔ خود عرب ماہرینِ لغات بھی اس بات کے قائل تھے۔ چنانچہ 'جہل' کے بنیادی معنی 'لاعلمی' اور 'ناخواندگی' بیان کیے جاتے تھے۔

مسلمان ظہورِ اسلام سے قبل عرب کی حالت بیان کرنے کے لیے 'جاہلیۃ' کا لفظ استعمال کرتے ہیں جو جہل کا ایک اہم مشتق ہے۔ مذکورہ بالا پس منظر میں فطری طور پر اس کا مطلب جہالت سمجھا گیا اور مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی زمانۂ جاہلیت یعنی جہالت کیا گیا۔ گولڈ زیہر نے اس لفظ کے اصلی معانی کی وضاحت کے لیے جو طریقہ اختیار کیا، وہ بنیادی طور پر ہمارے اس طریقے سے بہت مماثل ہے، جسے ہم نے اس کتاب میں معنوی تجزیے کے طریقِ کار کا نام دیا ہے۔ گولڈ زیہر نے قبل از اسلام عرب شاعری سے ایسے اہم اشعار و نظائر کی بہت بڑی تعداد جمع کی، جن میں جہل کا مادہ فی الواقعہ استعمال ہوا تھا۔ اس نے ان کا بہت احتیاط سے تجزیہ کیا اور اس اہم نتیجے پر پہنچا کہ 'جاہلیۃ' کے بارے میں روایتی رائے بنیادی طور پر غلط تھی۔ اس کی تحقیق کے نتائج کی رُو سے اپنے اصلی مفہوم میں 'جہل'، 'علم' کی ضد نہیں بلکہ 'حلم' کی ضد ہے، جس کے معنی ہیں 'ایک مہذب شخص کی اخلاقی سمجھ بوجھ (نکلسن)۔ اس مفہوم میں ابتدائی طور پر مندرجہ ذیل خصائص شامل ہیں۔ برداشت، صبر، بردباری اور اندھی جذباتیت کی عدم موجودگی۔ بعد کے اَدوار میں--- اور بعض اوقات قبل از اسلام شاعری میں بھی--- ہم دیکھتے ہیں کہ جہل علم کی عین ضد کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے۔ لیکن یہ ثانوی اور اشتقاقی مفہوم ہے۔ اس کے اصلی مفہوم کا مقصود عرب مشرکین کے سنگ دِل اور غیرمحتاط مزاج کو بیان کرنا تھا۔

آیئے اب ہم اصل مسئلے کی طرف آتے ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کے نزدیک جاہلیت کا اصل مفہوم کیا تھا؟ حضرت محمد ﷺ اور ان کے اصحاب اس لفظ کا مطلب کیا سمجھتے تھے؟ ابنِ اسحاق نے سیرت النبی ﷺ میں ایک بوڑھے مشرک شاس بن قیس کا

قصہ بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ آنحضرت ﷺ کی مکہ سے مدینہ ہجرت کے تھوڑے عرصے بعد پیش آیا۔ یہ 'دشمنِ خدا' ایک بوڑھا تھا جو نئے دین کی مخالفت اور ضد میں اصحابِؓ محمد ﷺ سے عناد اور دشمنی کے اظہار میں سب سے پیش پیش تھا۔ ایک دِن وہ مدینے کے دو اہم انصاری قبیلوں اوس اور خزرج کے ایک گروہ کے پاس سے گزر رہا تھا جو کبھی ایک دوسرے کے شدید دشمن تھے، لیکن اب آنحضرت ﷺ کی قیادت میں اخوت کے رشتے سے منسلک مشترکہ مفاد کے لیے جدوجہد میں مصروف تھے۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ لوگ دوستانہ انداز میں ایک دوسرے سے ہنس بول رہے ہیں تو اُس کے حسد اور غصے کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے ایک یہودی نوجوان کو بڑی رازداری سے اس بات پر اُکسایا کہ وہ اس گروہ کے پاس جا کر بیٹھ جائے اور انہیں پرانی لڑائیوں اور قتل و غارت کے قصے یاد دِلائے جو قبل از اسلام پیش آئے تھے۔ دونوں طرف کے شعرا کی نظمیں پڑھ کر سنائے تاکہ پرانی دشمنی جاگ اُٹھے۔

اس کی خواہش پوری ہوئی۔ ان لوگوں میں شدید جھگڑا ہو گیا۔ کسی نے کہا 'کیا تم یہی کچھ پھر سے چاہتے ہو؟ اگر ایسا ہے تو ہم بھی تیار ہیں۔' ان الفاظ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور سب کے سب آتش فشاں راستے پر ہتھیار ہتھیار چیختے بھاگ نکلے۔

یہ خبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ بہت تیزی سے جائے وقوعہ پر آئے اور آواز دی ''مومنو! تمہیں خدا کو بھول جانے کی جرأت کیسے ہوئی؟ کیا تم نے پھر جاہلیت کی آواز (دعویٰ) پر لبیک کہا ہے؟ ابھی میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ خدا نے تمہیں اسلام کی ہدایت عطا فرمائی، تمہیں عزت دی اور تمہیں جاہلیت کے تسلط سے آزاد کیا۔ تمہیں کفر سے نجات دِلائی اور تمہیں ایک دوسرے کا دوست بنا دیا۔'' یہ سن کر ہر ایک کو احساس ہوا کہ یہ سب شیطان کے اُکسانے پر ہوا اور وہ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر رونے لگے۔

اس واقعہ سے لفظ جاہلیت کے بارے میں دو اہم نکات کا پتہ چلتا ہے، اوّل یہ کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کے نزدیک جاہلیت ظہورِ اسلام سے پہلے کے زمانے کا نام نہیں تھا جو گزر چکا تھا بلکہ ایسی اثر آفرین قوت اور نفسیاتی کیفیت کا نام تھا

جسے اسلام کی نئی طاقت نے سامنے سے ہٹا دیا تھا لیکن جو ابھی خفیہ طور پر خود مومنین کے ذہنوں میں باقی تھی۔ اور کسی بھی وقت ان کے شعور پر حملہ آور ہو سکتی تھی۔ آنحضرت ﷺ اسے نئے دین کے لیے ایک مستقل خطرہ سمجھتے تھے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ درحقیقت جاہلیت کا جہالت سے کوئی تعلق نہیں، اصل میں اس کا مطلب قبائلی فخر و مباہات کا گہرا احساس، غرور اور رقابت کا نہ دبنے والا جذبہ اور وہ تمام درشت اور اجڈ رسم و رواج تھے جو انتہائی جذباتی مزاج کی پیداوار ہوتے ہیں۔

بعینہٖ یہی وہ مقام ہے، جہاں سے تحریکِ اسلامی کی صحیح اہمیت کے مطالعے کا آغاز ہونا چاہیے کہ اس نے اخلاقی اصلاح کے اس عظیم کام کو کیسے سرانجام دیا۔ مختصراً ظہورِ اسلام کے اخلاقی پہلو کو ایک ایسی جرأت مندانہ کوشش بھی کہا جا سکتا ہے، جس نے جاہلیت کی رُوح کے خلاف آخر دم تک جنگ کی تاکہ اس کو جڑ سے اُکھاڑ کر اس کی جگہ ہمیشہ کے لیے حلم اور بردباری کی روح کو مستحکم کر دیا جائے۔ ابنِ اسحاق (۹) نے ایک اور دلچسپ روایت بھی بیان کی ہے، جس سے جاہلیت کے اس پہلو پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

۸ھ میں فتح مکہ کے فوراً بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے مضافات میں فوجی دستے بھیجے۔ یہ خالصتاً تبلیغی کارروائی تھی۔ آپ نے حکم دیا کہ لوگوں کو محض دوستانہ انداز سے اسلام کی دعوت دی جائے۔ مبلغین کی اس جماعت میں بہادر خالدؓ بن ولید بھی تھے جو اللہ کی تلوار کے لقب سے معروف تھے، وہ بنو جذیمہ کے قبیلے کے پاس گئے۔ اُنھوں نے جب خالد بن ولید کو دیکھا تو لڑائی کے لیے ہتھیار اُٹھا لیے۔ خالدؓ بن ولید نے اُن کو یقین دِلایا کہ وہ امن کے ارادے سے آئے ہیں اور اُنھیں ہتھیار ڈالنے کو کہا۔ کیونکہ اُنھوں نے کہا تھا کہ دوسرے تمام لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں، جنگ ختم ہو چکی ہے اور ہر شخص محفوظ ہے۔ جب اُنھوں نے ہتھیار ڈال دیئے تو خالدؓ بن ولید نے ان کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے اور قبیلے کے ایک شخص کے مخلصانہ خبردار کرنے کے باوجود اُن کے سر قلم کرنے لگے۔ حضرت محمد ﷺ کو مکہ میں یہ خبر پہنچی تو روایت ہے کہ آپ نے اپنے دونوں ہاتھ اتنے اونچے اُٹھائے کہ آپ کی بغلیں نظر آنے لگیں اور

آپ نے تین مرتبہ بلند آواز سے کہا، ''اے اللہ! خالد نے جو کچھ کیا، میں تیرے سامنے اس سے برأت کا اظہار کرتا ہوں۔'' پھر آپ نے اپنے داماد حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ فوراً اُن لوگوں کے پاس جاؤ، معاملے کی پوری چھان بین کرو اور جاہلیت کی اس رسم کو اپنے قدموں سے روند ڈالو۔ حضرت علیؓ بہت ساری رقم لے کر اس علاقے میں گئے اور ان تمام لوگوں کے جان و مال کے نقصانات کا معاوضہ ادا کیا۔(۱۰) یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس واقعہ کے بیان میں کچھ آگے چل کر ایک شخص خالدؓ کے اس رویّے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے، ''تم نے اسلام کے زمانے میں جاہلیت کا کام کیا۔''

ان دونوں واقعات میں اس بات کا اہم اشارہ ہے کہ نبی علیہ السلام کے زمانے میں جاہلیت کے لفظ کا کیا مفہوم تھا۔ ان واقعات کے ذریعے ہمیں ان اخلاقی مقاصد کی اصل بصیرت سے آگاہی کا بھی موقع ملتا ہے جو تحریکِ اسلامی میں کارفرما تھی۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ آنحضرت ﷺ جاہلی رسوم کے خاتمے اور ان کے بجائے حلم کی روح پر مبنی طرزِ عمل کے رواج کے ذریعے لوگوں کی مکمل اخلاقی اصلاح چاہتے تھے۔

عربی زبان کی ضخیم لغات تاج العروس(۱۱) میں لفظ حلم کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے: ''اپنے نفس پر قابو رکھنے کا فعل اور اپنی طبیعت کو غیظ وغضب کے شدید جذبے سے روکنا۔'' البستانی(۱۲) نے اس کی تعریف یہ کی ہے، ''نفس کے پرسکون رہنے کی حالت، حتیٰ کہ غصہ اسے آسانی سے حرکت میں نہ لا سکے، اور کسی بھی آفت کے وقت پریشان نہ ہونے کی صفت۔ غصے کے حملے کے باوجود پرسکون رہنے کی حالت اور ظالم سے انتقام لینے میں سستی۔'' یاد رہے 'حلم' نبی علیہ السلام کی کوئی نئی دریافت نہیں تھی۔ بلکہ یہ ایک ایسی صفت تھی جسے مشرکینِ عرب بھی بہت اعلیٰ اقدار میں شمار کرتے تھے، صرف اس کی بنیاد مضبوط نہیں تھی۔ صحرا کے قدیم عرب باشندے اپنی جذباتیت کے لیے مشہور تھے۔ وہ ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر کسی بھی انتہا کو پہنچ سکتے تھے۔ نفس کا سکون جسے یونانی 'اتارکسیا'(۱۳) کہتے تھے، حاصل کرنا عربوں کے لیے سب سے مشکل کام تھا۔ اگر حاصل ہو بھی جاتا تو وہ اسے زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔ حلم کو صحیح

معنوں میں اخلاقی زندگی کا محور بنانے کے لیے ضروری تھا کہ اسے مضبوط بنیاد فراہم کی جائے۔ یہ بنیاد پوری کائنات کے واحد خالق اللہ تعالیٰ پر پُرخلوص ایمان کے ذریعے فراہم کی گئی۔ عقیدۂ توحید کی مضبوط بنیاد پر استوار یہ حلم و بردباری مذہبی لحاظ سے تہذیب یافتہ انسان کی اخلاقی سمجھ بوجھ--- وہ صفت تھی، جو جاہلیت کی عین ضد تھی۔ آیئے اب قرآن کی آیات کا مطالعہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان سے اس تعبیر کی تائید ہوتی ہے یا نہیں۔

قرآن کریم کی متعدد آیات میں جہل کے مختلف مشتقات استعمال ہوئے ہیں۔ جاہلیہ کا صیغہ چار بار استعمال ہوا ہے: ۱۴۸:۳، ۵۵:۵، ۳۳:۳۰ اور ۲۶:۴۸۔ ان میں سے آخری خصوصاً بے حد اہم ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَى وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا۔ (الفتح: ۲۶)

جب کہ ان کافروں نے اپنے دِلوں میں حمیہ یعنی جاہلیت کے غرور کو جگہ دی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مومنین پر اپنی طرف سے سکون نازل کیا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ضبطِ نفس کی بات پر جمائے رکھا اور وہ اس کے زیادہ مستحق اور اس کے اہل ہیں۔

ہم نے 'حمیة الجاهلية' کا ترجمہ جاہلیت کا غرور کیا ہے۔ یہ قبائلی انسان کی خود پسند اور مغرور رُوح کی طرف اشارہ ہے، اس انتہائی خودسری اور فخر و مباہات کا حوالہ ہے، جو قدیم عرب مشرکین کا خاصہ تھا۔ اس میں ان تمام باتوں کے خلاف ہٹ دھرم مزاحمت کا ذکر ہے، جن میں احساسِ عزت و وقار کے مجروح ہونے اور روایتی طرزِ زندگی کے خاتمے کے رجحان کا ذرا سا شائبہ بھی پایا جائے۔ اس آیت میں یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ جذباتی مزاحمت کی اس روح کو مومنین پر نازل ہونے والے روحانی سکون، نازک حالت میں اپنے پر قابو رکھنے کی روحانی طبیعت، اپنے

جذبات پر فتح پانے، پرسکون رہنے اور دین کے لیے صبر و استقامت کی عین ضد بتایا گیا ہے۔ اسلام کی نظر میں جاہلیت ایک اندھا اور وحشی جذبہ ہے جو ایسے لوگوں کا خاصہ ہے جو نیکی اور بدی میں تمیز کرنا نہیں جانتے، جو برے کام کرنے پر کبھی معذرت اور توبہ کے طلب گار نہیں ہوتے، جو نیکی کے سامنے بہرے اور سچائی کے سامنے گونگے اور ہدایتِ آسمانی کے سامنے اندھے ہیں۔[۱۴] یہی وہ تاریک اور اندھا جذبہ تھا جس نے لامتناہی خونی جھگڑوں کو جنم دیا تھا اور جو قبل از اسلام عرب تاریخ کے بے شمار مصائب و آفات کا سبب بنا تھا۔ مشرکانہ عہد کے تمام وحشیانہ رواجات کا اصل سرچشمہ یہی جذبہ تھا۔

لفظ 'جاہلیت' کے استعمال کی باقی تین مثالیں معانی کے نقطۂ نظر سے اتنی اہم نہیں۔ یہ آیات یا تو ان لوگوں کے اخلاقی رجحانات اور ظاہری رویوں کو بیان کرتی ہیں، جو عقیدۂ توحید کو نہیں مانتے تھے یا ان لوگوں کے بارے میں ہیں جو ظاہری طور پر تو اسلام لے آئے تھے، لیکن درحقیقت اللہ پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور پہلی آزمائش میں ہی ڈانواں ڈول ہونے لگے تھے۔

اب ہم اسی مادے کے دو اور مشتقات کے استعمال کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ایک مثال 'جہل' کے اسم فاعل 'جاہل' کی ہے، جو اکثر جمع سالم (جاہلون، جاہلین) کے طور پر استعمال ہوا ہے اور دوسری مثال جہل کے فعل کی ہے، جس کے مختلف صیغے استعمال ہوئے ہیں۔

۱۔ سورۂ یوسف (۱۲)، آیت ۳۳ میں ذکر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جو مصر میں عورتوں کی ترغیبات کے شدید حملے کے مقابلے میں خود کو بے بس پا کر خدا سے دعا کرتے ہیں:

> قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُن مِّنَ الْجَاهِلِينَ۔
>
> (۱۲:۳۳)
>
> یوسفؑ نے دعا کی کہ اے میرے رب جس کام کی طرف یہ عورتیں مجھے بلا رہی ہیں، اس سے تو جیل خانے میں جانا

مجھ کو زیادہ پسند ہے اور اگر آپ اُن کے داؤ پیچ کو مجھ سے دُور نہ
کریں گے تو میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔

یہ آیت ہمارے لیے خصوصاً قابلِ توجہ ہے کہ یہاں جاہل کا لفظ مذہبی سیاق میں استعمال نہیں ہوا اور جہل کے غیر مذہبی پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سیاق میں لفظ جاہل سے مراد ان لوگوں کا غیرمحتاط رویّہ ہے جو جسمانی خواہشات کے شدید جذبے کا با آسانی شکار ہو جاتے ہیں اور جانتے بوجھتے اندھے اور بہرے ہو کر نیکی اور بدی کی تمیز کھو بیٹھتے ہیں جو کہ بہت واضح طور پر حلم کے مزاج کی عین ضد ہے۔

۲۔ سورۃ النمل کی آیت ۵۴-۵۵ میں حضرت لوطؑ فرماتے ہیں:

وَلُوطاً إِذْ قَالَ لِقَومِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ وَأَنْتُمْ
تُبصِرُونَ۔ اَئِنَّكم لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِن دُونِ النِّسَاءِ۔ بَلْ
أَنتم قَوْمٌ تَجْهَلُونَ۔ (النمل: ٥٤-٥٥)

اور جب لوطؑ نے اپنی قوم سے کہا یہ تم کیا بے حیائی کا
کام کرتے ہو، حالانکہ تم دیکھ رہے ہو۔ کیا تم مردوں کے ساتھ
شہوت رانی کرتے ہو، عورتوں کو چھوڑ کر۔ تم تو ایسے لوگ ہو، جن
کے رویّے سے جہل ہی جہل ظاہر ہوتا ہے۔

اس آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ قومِ لوط یعنی اہلِ سدوم کے بارے میں یہ بیان ہوا ہے کہ اُن کا رویّہ خالصتاً جاہلانہ تھا۔ وہ عورتوں کی بجائے مردوں سے شہوت رانی کرتے تھے جو 'فاحشۃ' (ایک مکروہ گناہ) ہے۔ فاحش کا معنوی تجزیہ آگے چل کر کیا جائے گا، فی الحال یہ یاد رہے کہ اس آیت میں بھی جاہل کے استعمال سے جو معنی متبادر ہوتے ہیں اُن سے ایسا شخص مراد ہے، جو اپنے جذبات کے رحم و کرم پر ہوتا ہے اور کسی بھی انتہا کو چھو سکتا ہے اور یہ بات وہ لاعلمی میں نہیں کرتا۔ ''حالانکہ تم دیکھ رہے ہو'' --- یعنی پوری طرح جانتے بوجھتے ہو کہ یہ فعل ایک مذموم گناہ ہے۔ موضوعِ بحث کے سیاق میں یہ آیت خاص طور پر اہم ہے کہ اس سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ لفظ جاہل کا لاعلمی سے قطعاً تعلق نہیں۔ یہاں جان بوجھ کر حلم کے اخلاقی اصول سے

بے پروائی کا مفہوم ضرور نکلتا ہے۔

۳۔ سورۃ الانعام، آیت نمبر ۳۳-۳۵:

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَايُكَذِّبُونَكَ وَلَـٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ۔ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَ أُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا وَلَامُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ۔ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ نَبَإِ الْمُرْسَلِينَ۔ وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُم بِآيَةٍ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ فَلَاتَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ۔ (الانعام، ۶:۳۳-۳۵)

ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کو اُن کے اقوال مغموم کرتے ہیں، تاہم یہ لوگ آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتے بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں اور بہت سے پیغمبر جو آپ سے پہلے ہوئے ہیں، اُن کی بھی تکذیب کی جا چکی ہے۔ لیکن اُنھوں نے اس پر صبر کیا اور ان کو ایذائیں پہنچائی گئیں۔ یہاں تک کہ ہماری امداد ان کو پہنچی اور اللہ تعالیٰ کی باتوں کا کوئی بدلنے والا نہیں اور آپ کے پاس بعض پیغمبروں کی بعض خبریں پہنچ چکی ہیں اور اگر آپ کو ان کا اعراض گراں گزرتا ہے تو اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ لو پھر کوئی معجزہ لے آؤ تو کرو اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو ان سب کو راہ پر جمع کر دیتا۔ سو آپ جاہلوں میں سے نہ ہو جائیے۔

تفسیر بیضاوی میں آخری جملے کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ جو بات فطری طور پر ناممکن ہے، اس کے حصول کی خواہش کر کے اور ان حالات میں جہاں صبر

مناسب ہے، بے صبری کا اظہار کر کے جاہلوں میں سے نہ ہو جاؤ، کیونکہ یہ ان لوگوں کی خصوصیت ہے جو جاہل ہیں۔

یہ امر خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کی دلجوئی بھی کر رہا ہے جو اپنی قوم کے سرکش اعراض کی وجہ سے سخت دِل شکستہ اور مایوس ہیں اور مستقبل کے بارے میں نااُمید ہونے لگے ہیں۔ اور ان کے ساتھ انہیں فہمائش بھی کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ یاد دلا رہا ہے کہ آپ سے پہلے بہت سے ایسے پیغمبر گزرے ہیں جنھیں اسی طرح کے ناسازگار حالات کا سامنا تھا، لیکن اُنھوں نے انتہائی صبر سے ان کا مقابلہ کیا اور مشیتِ ایزدی پر مکمل بھروسہ کیا۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان انبیاء کی مثال پر عمل کرنے کو کہا ہے اور غیرضروری طور پر بے صبری سے احتراز کا حکم دے رہا ہے۔ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں بھی جاہل سے مراد وہ شخص ہے جس کا ذہن غیظ وغضب، رنج والم، یاس و نااُمیدی جیسے جذبات کے زیرِ اثر بہت آسانی سے اشتعال میں آ جاتا ہے۔

۴۔ سورۃ الانعام کی آیت ۱۱۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَا اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ۔ (الانعام: ۱۱۱)

اور اگر ہم اُن کے پاس فرشتوں کو بھیج دیتے اور اُن سے مردے باتیں کرنے لگتے اور ہم تمام موجودات کو اُن کے سامنے جمع کر دیتے، تب بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے، ہاں اگر خدا چاہے، لیکن اُن میں سے اکثر لوگ جہل کا ارتکاب کرتے ہیں۔

اس آیت کے بارے میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے ہم کہیں گے کہ اس میں اور اگلی آیت میں جاہل جن خاص معنوں میں استعمال ہوا ہے، اس کا تعلق ایمان یا عدمِ ایمان سے ہے۔ یہ لفظ واضح طور پر اُن لوگوں کو بیان کرتا ہے، جو اتنے سرکش اور خودپسند ہیں کہ وہ نئے دین کو قبول نہیں کر سکتے، کیونکہ اس دین کی روحانی اقدار کئی لحاظ

سے قدیم عرب مشرکین کے موقف سے کوئی مطابقت نہیں رکھتیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عرب مشرکین کے نقطۂ نظر سے یہ لوگ اس ثقافت کے صحیح نمائندے ہیں کہ خواہ کچھ ہو جائے، وہ اپنے ملک کی قبائلی اور روایتی اقدار سے غیر متزلزل وفاداری استوار رکھیں گے۔ یہ لوگ نبی علیہ السلام کی دعوت کا جواب صرف حقارت اور تمسخر سے دیں گے۔

اگلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کے معاملے میں مومنین کے لیے مثالی رویہ یہی ہے کہ اُن سے منہ پھیر کے بے تعلقی کی حکمتِ عملی اپنائیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کافروں کے بارے میں اسلام کا یہ رویہ ہمیشہ کے لیے تو نہیں ہو سکتا، لیکن یہ آیت اس لحاظ سے اہم ہے کہ زیرِ بحث مسئلے میں جہل اور حلم کے درمیان بنیادی تضاد کو بہت صراحت سے ظاہر کرتی ہے۔

۵۔ سورۃ القصص آیت ۵۵ میں ارشاد ہے:

وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَٰهِلِينَ۔

(القصص:۵۵)

اور جب وہ کوئی لغو بات سنتے ہیں تو وہ اُس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارے لیے ہمارے اعمال اور تمہارے لیے تمہارے اعمال۔ تم پر سلامتی ہو، ہم جاہل لوگوں سے الجھنا نہیں چاہتے۔

۶۔ سورۃ الزمر، آیت ۶۴-۶۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَأْمُرُونِّي أَعْبُدُ أَيُّهَا الْجَٰهِلُونَ۔ وَلَقَدْ أُوحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَٰسِرِينَ۔ بَلِ اللَّهَ فَاعْبُدْ وَكُن مِّنَ الشَّٰكِرِينَ۔ (الزمر:٦٤-٦٦)

کہہ دیجیے کہ اے جاہلو! کیا تم مجھے غیراللہ کی عبادت کی فرمائش کرتے ہو اور آپ کی طرف اور آپ سے پہلوں کی

طرف وحی آ چکی ہے کہ اگر آپ شرک کریں گے تو آپ کا عمل
غارت ہو جائے گا اور آپ خسارہ پانے والوں میں سے ہوں
گے، چنانچہ آپ صرف اللہ کی عبادت کریں اور شکرگزاروں میں
شامل رہیں۔

اس آیت میں جاہل کا لفظ ان لوگوں کے بارے میں استعمال ہوا ہے، جو اپنی مشرکانہ طرزِ زندگی میں بت پرستی کے رواج کے عادی ہیں، وہ اللہ کے ساتھ دوسرے خداؤں کو صرف شریک ہی نہیں کرتے، بلکہ دوسروں کو بھی ایسا کرنے کو کہتے ہیں۔ جملہ معترضہ کے طور پر ہم کہیں گے کہ یہاں جاہل ایسے شاکر کی ضد ہے جو شکر و احسان کے جذبے سے بھرپور ہو۔ کافر کی معنوی اصطلاح سے بحث کرتے ہوئے ہم پہلے ہی یہ ذکر کر چکے ہیں کہ دینِ اسلام میں ایمان کا بنیادی تصور اللہ کی نعمتوں پر شکر اور احسان مندی سے عبارت ہے۔ بالکل انہی معنوں میں جاہل کا لفظ مندرجہ ذیل آیت میں استعمال ہوا ہے، جہاں حضرت موسیٰ کے زمانے میں بنی اسرائیل کے ہاں بت پرستی کے رجحان کو بیان کیا گیا ہے۔

۷۔ سورۃ الاعراف، آیت ۱۳۸:

وَجٰوَزْنَا بِبَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ٱلْبَحْرَ فَأَتَوْا۟ عَلَىٰ قَوْمٍ يَعْكُفُونَ
عَلَىٰٓ أَصْنَامٍ لَّهُمْ قَالُوا۟ يَٰمُوسَى ٱجْعَل لَّنَآ إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ ءَالِهَةٌ قَالَ
إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ۔ (الاعراف:۱۳۸)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار اُتار دیا۔ ان
لوگوں کا ایک قوم پر گزر ہوا، جو اپنے چند بتوں کی عبادت میں
مبتلا تھے۔ بنی اسرائیل کہنے لگے کہ اے موسیٰ! ہمارے لیے بھی
ایک معبود ایسا ہی مقرر کر دیجیے، جیسے اُن کے یہ معبود ہیں۔ آپ
نے فرمایا کہ واقعی تم لوگوں کے رویے میں جہل ہی جہل ہے۔

۸۔ سورۃ ہود، آیت ۲۵، ۲۶، ۲۷ اور ۲۹:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِۦٓ إِنِّى لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ۔ أَن

لاتَعْبُدُوا اِلّا اللّٰه إِنِی أَخَافُ عَلَیْکُم عَذَابَ یَومٍ اَلِیمٍ۔ فَقَال
المَلاُ الَّذِینَ کَفرُوا مِن قَومِهٖ مَا نَرٰكَ إِلّا بَشَرا مِثْلَنَا وَمَا نَرٰكَ
اتَّبعكَ إلا الّذِینَ هُم اراذِلُنا بَادِی الرَّاىِ وَمَا نَرى لَكُم عَلَيْنَا مِن
فَضلٍ بَلْ نَظُنّکُم کٰذِبِینَ۔ قال یقوم ارءیتم ان کنتُ علی بینةٍ
من ربّی فعُمِّیَتْ علیکم۔ انلزِ مکموها وانتم لها کرهون۔
ویقوم لا اسئلکم علیه مالاً ان اجری الا علی اللّٰه و ما انا
بطاردِ الّذین امنوا انهم ملقوا ربهم وَلٰکِنی ارٰکم تجهَلُون۔
(هود: ۲۵-۲۹)

اور ہم نے نوحؑ کو اُن کی قوم کے پاس بھیجا۔ میں تمہارے لیے صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، میں تمہیں ڈراتا ہوں کہ دردناک عذاب ہے۔ اس کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا ہم تو تمہیں اپنے جیسا آدمی پاتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ تمہارا اتباع انہیں لوگوں نے کیا ہے، جو ہمارے رذیل ہیں۔ ہم تم میں کوئی چیز زیادہ نہیں پاتے بلکہ ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔ (حضرت نوحؑ نے کہا) میں تم لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ جہل کے سوا تم کچھ نہیں کرتے۔

اگلی آیت میں بھی آسمانی دین کے خلاف جاہلین کی مزاحمت کی شدت اور ہٹ دھرمی پر خاص طور پر زور دیا ہے۔

۹۔ سورۃ الاحقاف، آیت ۲۱-۲۳:

واذکر اخا عادٍ اذ أنذر قومَهٗ بالاحقافِ وقد خلت
النُّذُر مِن بَینِ یَدَیهِ ومِن خلفِهٖ اَلّاتَعْبُدُوا إِلّا اللّٰه إِنِی اَخافُ
عَلیْکُم عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیمٍ۔ قَالُوا أَجِئتَنَا لِتَافِکَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا فَأْتِنَا
بِما تَعِدُنَا إِنْ کُنتَ مِنَ الصّٰدِقِینَ۔ قَالَ إِنَمَا العلم عِنْدَ اللّٰهِ
وَابَلِّغُکُم مَا اُرسِلْتُ بِهٖ وَلٰکِنّی اَرٰکُم قَوْمًا تَجهَلُوْنَ۔

(الاحقاف:۲۱-۲۳)

اور آپ عاد کے بھائی (ہود) کا ذکر کیجیے، جب کہ انھوں نے اپنی قوم کو ریت کے مستطیل خمدار تودوں کے قریب ڈرایا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ان سے پہلے اور بعد میں بہت سے ڈرانے والے گزر چکے۔ مجھ کو تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے، وہ کہنے لگے کہ کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم کو ہمارے معبودوں سے پھیر دو۔ اگر تم سچے ہو تو جس کا تم سے ہم وعدہ کرتے ہو، اس کو ہم پر واقع کر دو۔ حضرت ہود نے کہا کہ پورا علم تو خدا ہی کو ہے، مجھ کو تو جو پیغام دے کر بھیجا گیا ہے، میں تم کو وہ پہنچا دیتا ہوں۔ لیکن میں تم کو دیکھتا ہوں کہ تم لوگ نری جہالت کی باتیں کرتے ہو۔

ہم پہلے جاہلیت کی حمیت کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہ وہ سرکش مزاج ہے، جو قبائلی طرزِ زندگی کی بنیادوں کو درپیش ہر خطرے کے خلاف مزاحمت کے لیے تیار رہتا ہے۔ یہ وہ شدید گھمنڈ ہے جو بقول آربری[۱۵] ماضی میں صحرائے عرب میں لاتعداد خونی جھگڑوں کا سبب بن چکا تھا اور اب صحرا اور شہروں میں بسنے والے مشرک عربوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہؓ کے خلاف سنگ دلانہ ایذا رسانی پر اُبھار رہا تھا۔ لفظ جہل میں مضمر معانی کا یہ پہلو ان آخری دو مثالوں سے بہت کھل کر سامنے آ گیا ہے۔

اس ساری بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہل کی معنوی شکل میں مرکزی خیال وہ خون خوار اور جذباتی مزاج ہے جو ذرا سی بات پر مشتعل ہو سکتا ہے اور انسان کو ہر قسم کے ناعاقبت اندیشانہ کام پر مجبور کر سکتا ہے۔ یہ جذبہ ایک مخصوص انداز سے عزت و وقار کے پرغرور احساس کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، جو مشرکینِ عرب خصوصاً صحرائی بدوؤں کا خاصہ تھا۔ آخری بات یہ کہ قرآنی آیات میں یہ لفظ خاص طور پر اسلام کے توحیدی عقائد کے خلاف دشمنی اور جارحیت کے مخصوص رویّے کے لیے استعمال ہوا

ہے، کیونکہ حضرت محمدﷺ کے اکثر معاصرین کے ذہن کے مطابق یہ عقائد اخلاق لحاظ سے بہت زیادہ سخت گیر تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ان کی برسوں پرانی رسموں اور عزیز ترین بتوں سے ترکِ تعلق کا مطالبہ کرتے تھے۔

مندرجہ بالا صفحات میں ہم نے جہل کے مادے سے مشتق الفاظ کا معنویاتی تجزیہ قدرے تفصیل سے پیش کیا۔ اس کے دو مقاصد تھے۔ اس سے اوّلاً تو یہ مقصود تھا کہ دینِ اسلام کے ظہور سے تھوڑی دیر پہلے عرب کی روحانی کیفیت کے بعض اہم خصائص کو کسی قدر ابتدائی انداز سے بیان کر دیا جائے۔

دوسرا مقصد یہ تھا کہ اپنے تجزیے کے طریقِ کار کی عمومی خصوصیات کی چند ٹھوس مثالیں آپ کے سامنے رکھ دی جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم نے بہت اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ ہمارا طریقہ سیاقی تعبیر کا طریقہ ہے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس تجزیاتی طریقے کے لیے جو مثالیں جمع کی جاتی ہیں، وہ سب ایک ہی نہیں ہوتیں۔ سیاق سے تعلق میں تفاوت کے لحاظ سے وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں، چنانچہ ان میں ہر ایک کا تجزیہ اور استعمال اس کی خصوصی نوعیت کے لحاظ سے کرنا ضروری ہے۔

سیاقی تعبیر:

اس سیاقی تعبیر کے عملی اصول کیا ہیں؟

ایک بہت ہی قیمتی کتاب ''لاترادکسیون دو لاتن'' (لاطینی سے ترجمہ) میں، جس کا مقصد ان لوگوں کو عملی ہدایت مہیا کرنا ہے، جو کلاسیکی لاطینی کے اچھے مترجم بننا چاہتے ہیں، جے ماروزو[۱۶] اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کسی مبہم لفظ کے معانی کے بارے میں وضاحت کے حصول کا بہترین طریقِ کار یہ ہے کہ سب سے پہلے ''اس لفظ کے مترادف، متضاد اور متشابہ کے ساتھ اس کا تقابلی مطالعہ، مقارنہ اور موازنہ کیا جائے۔'' اس کے ساتھ وہ یہ اضافہ کرتے ہیں کہ ''ہر اس لفظ کے لیے جو سمجھ میں نہ آ رہا ہو، ہم اس پورے پیرے سے مدد حاصل کریں گے، جہاں وہ لفظ استعمال ہوا ہے۔''

عملی ہدایت کے اس اصول میں جو پہلی نظر میں غیر ضروری اور عام سا دکھائی دیتا ہے، درحقیقت سیاقی تعبیر کے طریقِ کار کے تمام اہم نکات کا خلاصہ بہت مہارت سے پیش کر دیا گیا ہے۔ آئندہ ہم جب مزید مثالوں سے اس اصول کی وضاحت پیش کریں گے، تو اس کی افادیت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی۔ ان تمام الفاظ کو جو باہم مشابہ یا متضاد یا مطابق ہوں، جمع کرنا، موازنہ کرنا اور باہم مربوط کرنا، قرآنی آیات کے تجزیے کی اس کاوش میں اس سے بہتر کون سا اصول اختیار کیا جا سکتا ہے۔

اس قاعدے کے مطابق کسی عبارت میں ایک ہی اخلاقی اصطلاح کے بار بار استعمال کی معنویاتی نقطۂ نظر سے بذاتِ خود کوئی عملی اہمیت نہیں۔ معنویاتی لحاظ سے وہی عبارت اہم ہے جس کے سیاق میں مطلوبہ لفظ کی معنویاتی شکل کے ایک یا مختلف پہلوؤں کو پوری طرح واضح کیا گیا ہے۔ مثال کے طور سورۂ فاطر (۳۵) کی آیت نمبر ۳۹ میں کفر کے مادے سے مشتق مختلف الفاظ یکے بعد دیگرے چھ مرتبہ استعمال ہوئے ہیں۔ چونکہ کفر کے مادے کی بنیادی معنوی ساخت کی وضاحت ہو چکی ہے، اس لیے آسانی کے لیے اس کا ترجمہ ''بے دینی'' کرنے میں کوئی ہرج کی بات نہیں۔ آیت مندرجہ ذیل ہے:

> فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُه، وَلَايَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهم عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّامَقْتا وَلَايَزِيْدُ الكافِرِيْنَ كُفْرُهم اِلَّاخَسَارًا۔ (فاطر:۳۹)
>
> جو بھی بے دینی کرتا ہے، اس کی بے دینی کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ اللہ کے نزدیک بے دینوں کے لیے اُن کی بے دینی سے اللہ کی ناراضگی کے سوا کسی چیز میں اِضافہ نہیں ہوتا۔ بے دینوں کو بے دینی سے اُن کے گھاٹے میں اِضافے کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس آیت میں مادہ کفر سے مشتق تین الفاظ میں سے کوئی بھی لفظ کفر کے اصل معنی کے بارے میں قابلِ ذکر معلومات نہیں دیتا۔ یہ صحیح ہے کہ اس آیت سے یہ علم ضرور ہوتا ہے کہ اللہ کے غضب اور سزا کا سبب انسان کے کفر کا عمل

ہے، لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ قرآنِ کریم کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ اس مثال کے بغیر بھی یہ بات اظہر من الشمس ہے۔ چنانچہ جہاں تک معنویاتی تجزیے کا تعلق ہے۔ اس آیت سے مزید مدد نہیں ملتی۔ آئندہ جب ہم قرآن کریم کی اخلاقی اصطلاحات کا تجزیہ شروع کریں گے تو ہم اس قسم کی تمام مثالوں کا قصداً ذکر نہیں کریں گے۔ اس لحاظ سے ہماری تحقیق وتفتیش تمام آیات کا کلی تجزیہ نہیں کریں گی۔

سرسری انداز سے کہا جا سکتا ہے کہ معنویاتی تجزیے کے طریقِ کار کے لیے سات قسم کے نظائر زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کو ہم ایک ایک کر کے بیان کریں گے۔

۱۔ سیاقی تعریف:

معنویاتی اہمیت کے لحاظ سے سب سے سادہ مثال وہ عبارت ہے، جہاں کسی سیاق میں الفاظ کے ذریعے بہت واضح طور پر کسی لفظ کے معنی صحیح صحیح بیان کر دیئے جائیں، اسے ہم ''سیاقی تعریف'' کہہ سکتے ہیں۔ مندرجہ ذیل آیت اس کی عمدہ مثال ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ میں 'بر' کے معنی بیان ہوئے ہیں۔ اردو میں عام طور پر اس کا ترجمہ 'نیکی' کیا جاتا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔ (البقرۃ:۱۷۷)

نیکی یہ نہیں کہ تم مشرق یا مغرب کی طرف منہ پھیر لو،
بلکہ نیکی اس کی ہے جو اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر،

کتابوں پر اور نبیوں پر ایمان لائے اور اللہ کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں، سوال کرنے والوں اور قرضوں میں پھنسے ہوئے لوگوں پر مال خرچ کرے، نماز قائم کرے، زکوۃ دے، عہد کرے تو اس کی پابندی کرے، تنگی، بیماری اور جنگ میں صبر اور مستقل مزاجی کا ثبوت دے۔ یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہ لوگ ہیں جو متقی ہیں۔

اس آیت میں انتہائی تاکید کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ بر (سرسری طور پر ہم بھی اس کا ترجمہ نیکی کر لیتے ہیں) اپنے اصل معنی میں مذہبی ظواہر کے قواعد کی پابندی کا نام نہیں، بلکہ حقیقی نیکی اس سماجی بھلائی کو کہتے ہیں جو اللہ کے ایک ہونے پر پختہ یقین سے فطری طور پر ظہور پذیر ہوتی ہے۔

اس بات پر بھی غور کیجیے کہ آیت کے آخری حصے میں 'بر' کا 'صدق' (سچائی) اور تقویٰ کے تصور سے بہت گہرا تعلق دِکھایا گیا ہے۔ آگے چل کر ہم لفظ 'بر' کا تجزیہ بھی پیش کریں گے۔ فی الحال اس بات کی طرف توجہ دِلانا مقصود تھا کہ ہمارے تجزیے کے طریقِ کار میں اس قسم کی مثالوں کی کیا اہمیت ہے۔

۲۔ مترادف:

معنویاتی تجزیے کے لیے ہم معنی اور مترادف عبارت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جب ایک ہی پیرے میں یا اس سے بالکل ملتے جلتے سیاق میں ایک لفظ (الف) کے بدل کے طور پر دوسرا لفظ (ب) استعمال ہو تو انہیں مترادف عبارات کہیں گے، خواہ (ب) کے معانی کا دائرہ الف سے زیادہ وسیع یا تنگ ہو۔ ایک ہی قسم کے سیاق میں کسی لفظ کا ہم معنی یا اس کے مترادفات میں سے ایک کا بدل کے طور پر استعمال دونوں الفاظ یا اُن میں سے کسی ایک کے معنوی تجزیے کے لیے بے حد مفید ہوتا ہے، مثلاً سورۃ الاعراف کی آیات ۹۴-۹۵ ملاحظہ ہوں:

وَمَا اَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِن نَبِيٍ إِلَّا اَخَذْنَا اَهْلَهَا بَالْبَأْساءِ

وَالضَرِّاء لَعلّهُم یضرَّعُون۔ ثُمّ بَدَّلنَا مَکانَ السَّیِّئَۃِ الحَسَنۃ حَتّی عَفَوا وقَالُوا قد مس آباءَ نا الضَرَّاء و السّراء۔ (الاعراف: ۹٤-۹٥)

اور ہم نے کسی بستی میں جب بھی کوئی نبی بھیجا تو وہاں کے رہنے والوں کو تنگی اور بیماری میں مبتلا کر دیا تاکہ وہ لوگ ڈھیلے پڑ جائیں، پھر ہم نے بدی کو نیکی سے بدل دیا، حتیٰ کہ ان کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ وہ کہنے لگے کہ ہمارے آباؤ اجداد کو بھی تنگی اور خوشی پیش آئی تھی۔

آیات ۹۴ اور ۹۵ کے تقابلی مطالعے میں ایک ہی نظر میں دیکھا جا سکتا ہے کہ آیت ۹۴ میں جہاں باساء اور الضراء آیا، آیت ۹۵ میں معانی میں کسی تبدیلی کے بغیر سیئہ کا لفظ آیا ہے۔ اس سے یہ بات بالکل بدیہی معلوم ہوتی ہے کہ لفظ سیئہ جس کے قریبی معنی برائی اور بدی کے ہیں، بعض حالات میں 'مشکلات'، 'آفات'، 'مصائب' اور 'تنگی' کے معنوں میں بھی استعمال ہوسکتا ہے۔ مزید ہم دیکھ سکتے ہیں کہ آیت ۹۵ میں سیئہ کے متضاد کے طور پر حسنہ آیا ہے، جس کے معنی عام طور پر 'اچھائی' اور 'نیکی' کے آتے ہیں، جو خود اِسی عبارت میں سراء کے بدل کے طور پر آیا، جس کے قریب قریب معنی 'خوشی'، 'مسرت' کے ہیں۔

ایک اور مثال ملاحظہ ہو، سورۃ یوسف کی آیت ۲۸-۲۹ میں عزیزِ مصر اپنی اہلیہ سے، جو جواں سال یوسف کو سیدھے راستے سے بھٹکانے میں ناکام رہی ہے اور اُن پر ایک مکروہ کا جھوٹا الزام لگانے کی کوشش کر رہی ہے، کہتا ہے:

اِنَّهُ مِن کَیدِ کُنّ انّ کَیدَکُن عَظِیمٌ۔ یوُسف اَعرِض عَن هَذَا واسُتَغفِری لِذَنبكِ إنكِ کنتِ من الخَاطِئین۔ (یوسف: ۲۹)

یہ تم عورتوں کی چالاکی ہے۔ بے شک تمہاری چالاکیاں غضب کی ہیں، یوسف تم اس بات کو جانے دو، اور اے

عورت تو اپنی زیادتی کی معافی مانگ، بے شک سراسر تو ہی
قصوروار ہے۔

لفظ 'ذنب' جس کے معنی ہم نے یہاں عارضی طور پر 'زیادتی' کے کیے ہیں، اسی مفہوم کا ایک لفظ اگلے ہی جملے میں ایک مختلف عبارتی ترکیب 'تم قصوروار ہو' میں استعمال ہوا ہے، جس کا زیادہ لفظی ترجمہ یہ ہوسکتا ہے کہ 'تم خطا کاروں میں سے ایک ہو۔ یعنی تم ان میں سے ایک ہو جن سے قصور (خطیئہ) سرزد ہوا ہے۔ خطیئہ کا اُردو ترجمہ خطا یا قصور ہے۔ چنانچہ جہاں تک اِس آیت یا اس سے ملتے جُلتے سیاق کا تعلق ہے، ہم مساوات کی مندرجہ ذیل شکل ثابت کرنے میں حق بجانب ہیں:

ذنب = خطیئه

موجودہ سیاق میں کیا یہ دونوں لفظ مکمل طور پر ہم معنی ہیں؟ ہم ابھی اس سوال کا فیصلہ کُن جواب نہیں دے سکتے۔ ابھی یہ کہنا کافی ہے کہ مشہور مفسر بیضاوی فرماتے ہیں کہ معانی اور تصورات کی درجہ بندی میں ذنب، خطیئه سے بہت اوپر ہے۔ ذنب اور خطیئه میں امتیازی عنصر نیت اور ارادہ ہے۔[۱۷] چنانچہ ان کے نزدیک ذنب وہ ہے جو ارادۃً اور جان بوجھ کر کیا جائے اور خطیئه اس کی ذیلی قسم ہے۔

۳۔ تضاد:

وہ نظائر جہاں کسی لفظ کی معنویاتی تشکیل کی وضاحت تضاد کے ذریعے کی جاتی ہے۔ مثلاً اخلاقیات کے باب میں خیر کا قریب ترین اُردو لفظ 'نیکی' ہے، لیکن عربی زبان میں بہت سارے دوسرے الفاظ بھی ہیں، جو نیکی کے عمومی مفہوم میں خیر کے شریک نظر آتے ہیں۔ اس میں سے ایک حسنہ کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ خیر اور حسنہ میں فرق یہ بات جاننے سے بھی خاصی حد تک ظاہر ہو جاتا ہے کہ خیر عام طور پر شر کی ضد میں اور حسنه، سیئه کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے۔

اگر ہم کسی بھی طریقے سے ان چاروں الفاظ میں سے کسی ایک کے صحیح معنی یقینی طور پر معلوم کرسکیں تو باقی تین الفاظ کے معنی خود بخود واضح ہو جائیں گے۔

بعض اوقات ایک ہی لفظ کے مقابلے میں دو مختلف الفاظ متضاد کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، مثلاً 'کافر' جس کے بنیادی معنی متعین کرنے کے بارے میں ہم اوپر بات کر چکے ہیں، عام طور پر 'مومن' کا متضاد سمجھا جاتا ہے، لیکن ایک اور لفظ 'فاسق' بھی ہے جو اتنی ہی کثرت سے 'مومن' کے متضاد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

چونکہ ایک جانب تو لفظ 'فاسق' لفظ 'مومن' کے مقابل ہے، دوسری جانب یہ اسی حیثیت میں ہے جس میں لفظ کافر ہے، اس لحاظ سے 'فاسق' یقیناً انسان کی ایسی صفت کی نشاندہی کرتا ہے، جو دینی لحاظ سے قابلِ مذمت ہے اور غالباً یہ شخص ایسی خصوصیت کا حامل ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی مخالفت کا رجحان خاص طور پر پایا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے یا غلط ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔ یہاں ہم اس ذکر پر اکتفا کریں گے کہ بیضاوی کی رائے میں درحقیقت 'فاسق' اور 'کافر' ایک ہی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ 'فاسق'، 'کافر' کی ایسی قسم ہے، جو زیادہ ضدی اور سرکش ہے۔ (المتمرد فی الکفر)

یہاں ہم یہ ذکر کرتے چلیں کہ قرآن کے عہدِ نزول کے بعد لفظ 'فاسق' نے اصطلاحی شکل اختیار کر لی جو مومن اور کافر کے مابین ایک مستقل درجہ رکھتی ہے۔ فاسق سے مراد وہ مؤمن لیا جائے گا جس سے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب ہوا ہو، لیکن وہ شرک کا مرتکب نہ ہو۔

۴۔ سلبی مفہوم:

مندرجہ بالا تیسری قسم کی ایک ضمنی صنف وہ نظائر ہیں، جن میں ایک مبہم لفظ 'ب' کی معنوی ساخت اس کی سلبی شکل غیر 'ب' سے واضح کی جاتی ہے، اسے ہم چوتھی قسم کہیں گے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ 'ب' کے معانی سلبی طور پر بیان کرنے کا یہ طریقہ اکثر ناکام رہتا ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس سے 'ب' کے بارے میں ہماری معلومات میں بظاہر کوئی اضافہ نہیں ہوتا، کیونکہ منطقی طور پر غیر 'ب' کوئی بھی چیز ہو سکتی ہے، جو 'ب' نہ ہو۔ بہرحال خوش قسمتی سے یہ اعتراض ان نظائر پر وارد نہیں ہوتا، جہاں

لفظ کے حوالوں کا دائرہ بہت محدود ہو، یعنی جہاں اس لفظ کے امکانی حوالوں کی تعداد بہت زیادہ نہ ہو، اگر موضوعِ بحث ایسا پھول ہے جو یا سرخ ہو یا نیلا تو صرف یہ بات کہنا کہ زیرِ حوالہ پھول سرخ نہیں ہے، سننے والے کے لیے یقینی طور پر مثبت معلومات فراہم کر دیتا ہے۔ کسی بھی زبان میں اخلاقیات کے ذخیرۂ الفاظ پر تقریباً ہمیشہ یہی بات صادق آتی ہے۔ موضوعِ زیرِ بحث کے نقطۂ نظر سے اخلاقی جانچ کے حوالوں کے محدود دائرے میں یہ معلومات کہ کوئی چیز غیر 'ب' ہے۔ 'ب' کی معنوی تشکیل کے تعین کا بہت ہی مؤثر ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔ ''یہ اچھی بات نہیں ہے۔'' کے جملے کے حوالے سے کس قسم کے عمل ذہن میں آتے ہیں، ایک ماہرِ معنویات کے لیے یہ جاننا اتنا ہی اہم ہے، جتنا یہ جاننا کہ کس قسم کے اعمال کو 'اچھا' کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں منفی اقدار کے لیے جو اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں، ان میں 'استکبر' کا شمار اہم ترین الفاظ میں ہوتا ہے۔ سرسری طور پر اس کا ترجمہ 'فخر و غرور کی بنیاد پر بڑا بننا'، 'غرور اور حقارت سے پیش آنا' کیا جا سکتا ہے۔ یہ لفظ کافر (بے دین) کی خصوصی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ مندرجہ ذیل مثال میں یہ فعل منفی شکل میں آتا ہے اور ایک طرح سے یہ بیان کرتا ہے کہ 'غرور' سے پیش آنے والوں کے رویے کے پس منظر میں کیا ہے:

إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ۔ (السجدہ: ۱۵)

بس ہماری آیتوں پر وہ لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب ان کو وہ آیتیں یاد دِلائی جاتی ہیں تو وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرنے لگتے ہیں اور وہ لوگ غرور سے پیش نہیں آتے۔

جو لوگ غرور سے پیش نہیں آتے ہیں، وہ کون سا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں؟ جب وہ آیاتِ الٰہی کے روبرو ہوں تو ان کا کیا رویّہ ہوتا ہے؟ ان سوالات کا مثبت اور ٹھوس جواب 'غرور' کی اس خاص قسم کے بارے میں بہت سی باتیں بتلاتا ہے جو لفظ

'استکبر' کے معانی میں شامل ہے۔

۵۔ معنویاتی دائرہ:

کسی زبان کے بعض الفاظ کے معنوی روابط کا ایک مخصوص دائرہ ہوتا ہے۔ اُردو زبان میں اس کی بہت سادہ سی مثال 'پانی' اور 'بہنا' کے الفاظ کے مابین مخصوص معنویاتی ربط ہے۔ الفاظ کے ایسے معنویاتی مرکبات ہر زبان میں پائے جاتے ہیں۔ ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے کہ کوئی لفظ دوسرے الفاظ سے بالکل الگ تھلگ ہو اور اس کا وجود مستقل بالذات ہو، اس کے برعکس الفاظ میں ہمیشہ یہ رجحان ہوتا ہے کہ وہ جس سیاق میں استعمال ہوتے ہیں، وہاں دوسرے الفاظ سے جڑ جاتے ہیں۔ گویا ہر لفظ کے اپنے ساتھی ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ زبان کا سارا ذخیرۂ الفاظ ایسے معنویاتی مجموعوں پر مشتمل ہوتا ہے، جن کا باہمی تانا بانا بہت باریک اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ ماہرِ معنویات کا سب سے اہم کام اس تانے بانے کو علیحدہ کرنا ہے جو اس معنویاتی دائرے کی حدود متعین کرنے میں مفید ہو۔ قرآنِ کریم میں افتریٰ (گھڑنا) کے فعل کے ساتھ اکثر کذب (جھوٹ) اسمِ مفعول کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس طرح کذب اور افترا ایسے الفاظ ہیں جو شاذ و نادر ہی جدا جدا استعمال ہوں۔ اس ترکیب کے ساتھ 'ظالم' کا لفظ بھی مل جاتا ہے، جس کے بنیادی معانی ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، چنانچہ **من اظلم ممن افتری علی اللہ کذبا**۔ (اس شخص سے زیادہ برا... بے انصاف اور ظالم... کون ہوگا جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا)۔ قرآنِ کریم کا خاص لگا بندھا جملہ ہے۔ چنانچہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تین الفاظ افترا، کذب اور ظالم قرآنِ کریم میں ایک خاص مجموعہ یا ایسا 'معنویاتی دائرہ' ہیں، جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔

۶۔ ابدال:

اکثر ایک یا زیادہ الفاظ میں معنویاتی ربط کے وجود کا اظہار ابدال کی ابلاغی صنعت سے بھی ہوتا ہے۔ ماہرین جانتے ہیں کہ تورات کی عبرانی زبان اور کلاسیکی چینی زبان میں شعری اسلوب میں ابدال کی صنعت بہت سے الفاظ کے معانی کے لیے کلید کا

کام کرتی ہے، اس کے بغیر ان الفاظ کے معانی مبہم رہتے ہیں۔ قرآن کے بارے میں بالکل یہی بات تو نہیں کہی جا سکتی، تاہم بہت سی قرآنی آیات میں ابدال کے ذریعے بعض معنویاتی تراکیب کے خاص پہلو سامنے آتے ہیں۔ مثلاً سورہ العنکبوت میں مندرجہ ذیل دو آیات قریب قریب آتی ہیں:

وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الْكٰفِرُونَ۔ (العنکبوت:٤٧)

اور ہماری آیتوں سے بجز کافروں کے کوئی انکار نہیں کرتا۔

وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ۔ (العنکبوت:٤٩)

اور ہماری آیتوں سے بجز ظالموں کے اور کوئی انکار نہیں کرتا۔

ابدال کی ترکیب بذاتِ خود اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ کافر اور ظالم معنویاتی طور پر ایک دوسرے کے مساوی ہیں، کم از کم اس حد تک کہ دونوں آیاتِ الٰہیہ پر ایمان لانے سے انکار کرتے ہیں۔ اگر ہم ابدال کی ایک اور مثال کو سامنے رکھیں جو سورۃ المائدہ میں ملتی ہے تو کافر اور ظالم کے اس مجموعے میں ایک اور رُکن فاسق کا بھی اِضافہ کیا جا سکتا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ۔

(المائدہ:٤٤)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے کے موافق حکم نہ کریں وہ کافر ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔

(المائدہ:٤٥)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے کے موافق حکم نہ کریں وہ ظالم ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔

(المائدہ:٤٧)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے کے موافق حکم نہ

کریں وہ فاسق ہیں۔

اس مثال میں اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ کرنے کے حوالے سے تین الفاظ کافر، ظالم اور فاسق، جن سے قاری اب پوری طرح مانوس ہو گئے ہیں، معنویاتی طور پر ایک دوسرے کے متوازی استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ یہ واضح ہوگیا ہے کہ یہ تینوں الفاظ 'بے دینی' کے وسیع معنویاتی دائرے کے ایک مخصوص مرحلے کی حد بندی کرتے ہیں۔ ہم اس دائرے کی اساسی خصوصیات پر بعد میں بھی بحث کریں گے۔

۷۔ غیر اصطلاحی استعمال:

قرآنِ کریم میں تمام کلیدی اخلاقیاتی اصطلاحات گہرے دینی مفاہیم کے سیاق میں استعمال ہوئی ہیں۔ تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات قرآنِ کریم میں بعض اخلاقی اصطلاحات غیر مذہبی سیاق میں بھی استعمال ہوئی ہیں، اور ان الفاظ کے معانی کے خالص غیر مذہبی پہلوؤں کو اُجاگر کرتی ہے۔

ایسے نظائر اُن الفاظ کی معنویاتی ساخت کے مطالعے کی پیش رفت میں قدرتی طور پر ماہرِ معنویات کے لیے انتہائی بیش قیمت ہیں۔ موضوعِ زیرِ بحث کے تعلق سے لفظ جاہل کے تجزیے کے دوران ہم پہلے بھی ایک مثال پیش کر چکے ہیں۔ (سورۂ یوسف، آیت ۳۳)۔ علمِ معنویات کے لحاظ سے سورۂ یوسف، خاص طور پر بہت اہم ہے۔ کیونکہ اس میں الفاظ کے غیر مذہبی استعمال کی اور بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ یہاں ہم سورۂ الشعرا سے ایک اور مثال پیش کرتے ہیں۔ یہاں قابلِ غور لفظ ایک مرتبہ پھر کافر ہے۔

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ
سِنِيْنَ۔ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ۔

(الشعراء:۱۸-۱۹)

فرعون کہنے لگا کہ کیا ہم نے تم کو بچپن میں پرورش نہیں
کیا اور تم اپنی زندگی میں برسوں ہم میں رہا سہا کیے اور پھر بھی تم

نے وہ حرکت کی، تم بڑے ناشکرے ہو۔

یہ بات فرعون، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ رہا ہے جو یقیناً اس کے معانی کے غیر مذہبی سیاق ہونے کا ثبوت ہے۔ اور یہ اس وقت کہی جا رہی ہے جب حضرت موسیٰ نے فرعون کی مصری رعایا کے ایک فرد کو قتل کر دیا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، کفر کے لغوی مادے کی معنویاتی شکل پوری کی پوری 'ناشکری' پر مبنی ہے اور اس آیت سے زیادہ اس بنیادی عنصر کی وضاحت کہیں نہیں مل سکتی۔

حواشی:

(1) Gatte

(2) Husband

(3) Richard Robinson

(4) Humor

(5) Esprit

(6) Gemut

(7) R.A. Nicholson, *A History of the Arabs*, (Cambridge, 1953), p.79.

(8) Ignaz Goldziher, *Muhammadanische Studien*, (Halle, 1888), I, p.319.

مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ہماری تصنیف *God and Man in the Koran.*

(۹) ابن اسحاق، ابن ہشام، سیرۃ النبی (تحقیق Wustenfeld ،(Gottingen، ۱۸۵۹ء-۱۸۶۰ء)، ج ا، ص ۳۸۵-۳۸۶۔

(۱۰) سیرۃ النبی، ج ۲، ص ۸۳۴-۸۳۵۔

(۱۱) زبیدی، تاج العروس (قاہرہ، ۱۳۰۶ء-۱۳۰۷ء)، 'حلم'، صفحات ۳۵۵-۳۵۸۔

(۱۲) البستانی، محیط (بیروت، ۱۸۶۷ء-۱۸۷۰ء)، ص ۴۴۳-۴۴۴۔

(13) ataraxia

(۱۴) ابن اسحاق، سیرۃ النبی، ج ۲، ص ۱۰۳۔

(15) A.J. Arberry, *The Seven Odes*, (London, 1957), p.263.

(16) J. Marouzeau, *La Traduction de Latin*, (Paris, n.d.), p.38.

(۱۷) بیضاوی، انوار التنزیل و اسرار التاویل (قاہرہ، ۱۹۳۹ء)۔

قبائلی ضابطوں سے اسلامی اخلاقیات تک

باب سوم

دنیوی زندگی کا قنوطی تصور

قدیم عرب میں اخلاقی افکار کے ارتقاء کی تاریخ میں غالباً سب سے امتیازی بات یہ ہے کہ اسلام نے مطلق مشیت الٰہی کی بنیاد پر ایک نئی اخلاقیات کا اعلان کیا، جبکہ قبل از اسلام اخلاقی زندگی کا رہنما اصول قبائلی روایت تھی جسے قرآن کریم میں سنتِ آباء کہا گیا ہے۔

اس بات کو غلط نہ سمجھا جائے۔ یہ کہنا کہ قبل از اسلام عربوں کے ہاں اچھے بُرے کی پہچان یا نیک و بد میں کوئی تمیز نہیں تھی، اُن کے ساتھ صریح ناانصافی ہوگی۔ اس کے برعکس اگر ہم مشہور 'کتاب الاغانی' جیسی دستاویز کا بغور مطالعہ کریں تو اُس سے فوراً یہ بات سامنے آتی ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے عرب درحقیقت ایک بہت مضبوط اخلاقی حس کے مالک تھے۔ ان نام نہاد 'آزاد فرزندانِ صحرا' کے پاس ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ کے تفصیلی طور طریقے موجود تھے، جن کی رو سے وہ ہر ذاتی اور قبائلی عمل کے اچھے یا بُرے ہونے کا فیصلہ کرتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کے ہاں اچھے بُرے یا نیک و بد کا کوئی اصولی یا باقاعدہ نظام نہیں تھا۔ اُن کے نیک و بد کے معیار کی بنیاد محض اس منطقی تکرار پر مبنی تھی کہ ایک کام اس لیے اچھا ہے کہ وہ اچھا ہے۔ علاوہ ازیں ان اخلاقی خصائص کی بنیاد پر حقیقی بحران کے وقت کسی فرد کے ذاتی افعال کو قابو میں رکھنا ممکن نہیں تھا، خصوصاً اس صورت میں جہاں قبیلہ کے مفادات کو خطرہ ہو۔ مثلاً صحرا کا معروف اصول تھا کہ اپنے بھائی (ہم قبیلہ) کی ہر صورت میں مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

جاہلی عرب کا اگر کوئی استدلال تھا تو صرف یہ کہ ایک چیز اچھی یا جائز اس

لیے ہے کہ ہمارے آباء و اجداد ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔

وَ اِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللّٰهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا، أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ۔ (البقرة: ۱۷۰)

"جب اُن لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جو اللہ نے نازل فرمایا ہے، اس کی پیروی کرو، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا۔ بھلا اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ نہ سمجھتے ہوں اور سیدھے راستے پر نہ ہوں، تب بھی؟"

بَلْ قَالُوا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَى أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَى آثَارِهِمْ مُهْتَدُونَ۔ وَكَذَٰلِكَ مَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِنْ نَذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَى أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَى آثَارِهِمْ مُقْتَدُونَ۔ قَالَ أَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِأَهْدَى مِمَّا وَجَدْتُمْ عَلَيْهِ آبَاءَكُمْ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ۔ (الزخرف: ۲۲-۲٤)

"بلکہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک مذہب پر پایا اور ہم قدم بہ قدم انہی کے پیچھے چل کر سیدھے راستے پر رہے ہیں۔ اور اسی طرح ہم نے آپ سے پہلے بھی جس بستی میں کوئی ڈرانے والا بھیجا تو وہاں کے امیر لوگوں نے یہی جواب دیا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک مذہب پر پایا اور ہم تو انہی کے پیچھے چلیں گے۔ نبی نے کہا بھی کہ اگر تمہارے پاس اس سے بھی زیادہ ہدایت یافتہ طریقہ آ جائے جو تمہارے باپ دادا نے تمہیں دیا، تب بھی؟ انہوں نے کہا، تم جو کچھ دے کر بھیجے گئے ہو، ہم اسے نہیں مانتے۔"

فطری طور پر اس قسم کے طرزِ استدلال کی منفی جانب یہ ہے کہ ان کے

نزدیک ہر وہ چیز بُری ہے جو موجودہ سماجی نظام میں کوئی رخنہ ڈالے یا جو قبائلی آباء و اجداد کے موروثی عرف اور رواج کو کسی قسم کا نقصان پہنچاتی ہو یا اس کے احترام کو کمزور کرتی ہو۔ اسلام نے اخلاقی اصلاح کا جو نظام دیا، اس کا کام بعینہٖ یہی تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اخلاق کے جو اصول اتنی محنت اور جدوجہد سے قائم کیے، اُن کی بنیاد اللہ کی وحدانیت کے روشن عقیدہ پر تھی، جس کے نزدیک قبائل کے رسوم و رواج کی حیثیت معمولی دنیوی معاملات سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ ان میں کوئی چیز مقدس نہیں تھی۔ فطری طور پر اسلام کے لیے زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے اخلاقی افکار کے بنیادی اصولوں سے مکمل طور پر ناطہ توڑنا لازمی تھا۔

حمیتِ جاہلیت کی روح کے خصوصی مظاہر میں سے ہم مندرجہ ذیل دو اُمور کو خاص طور پر اہم سمجھتے ہیں: دنیوی زندگی کی اہمیت اور قابلیت۔

اس باب میں ہم پہلی خصوصیت سے بحث کریں گے۔ دوسری خصوصیت پر اگلے باب میں بات ہوگی۔

جن لوگوں نے عرب ثقافت کی خصوصیات کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ بدوی تصورِ کائنات کا خاصہ اس کی حقیقت پسندی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس خصوصیت کا تعلق اس سرزمین کی آب و ہوا سے ہے۔ حقیقتاً کچھ ایسی ہی بات ہے کہ اس تصور کے ساتھ ہی ہمارے ذہنوں میں فوری طور پر صحراؤں کی خشک ریت کی تصویر ابھر آتی ہے۔ عرب کے حقیقت پسند ذہن میں موجود دُنیا اپنی رنگارنگی اور بوقلمونی کے باوجود صرف یہی دُنیا ہے جو وجود رکھتی ہے۔ ایسے ذہن کے لیے ایک ابدی زندگی کا عقیدہ جو آنے والی ہے، ناقابلِ یقین ہے۔ اس دُنیا سے باہر وہ کسی وجود کو نہیں مان سکتا۔

قَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنيا نَمُوتُ وَنَحيَا وَمَا يُهلِكُنَا إِلَّا الدَّهر۔ (الجاثیہ:۲٤)

”وہ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو صرف دُنیا ہی کی ہے،
جس میں ہم مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں تو زمانہ مار دیتا ہے۔“

قَالُوٓا إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ۔

(الانعام:٢٩)

''وہ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو صرف دنیا ہی کی ہے، ہم مرنے کے بعد پھر زندہ نہیں کیے جائیں گے۔''

ان افکار کے مقابلے میں اسلام کی وحدانیت وجود کائنات کے اس قدیم جاہلی تصور سے لازمی طور پر متصادم نظر آتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہم وطنوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حشر اور آخری زندگی کا جو پیغام دیا، وہ طنز اور تمسخر کا نشانہ بنا۔

قَالُوٓا ءَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا ءَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ۔ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا هَٰذَا مِن قَبْلُ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ۔ (المؤمنون:٨٢-٨٣)

''وہ کہتے ہیں کہ جب ہم مر جائیں گے، اور مٹی اور ہڈیاں رہ جائیں گے تو کیا ہم پھر اٹھائے جائیں گے؟ یہ وعدہ تو ہم سے اور ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا سے بھی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ یہ تو صرف اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔''

فَقَالَ الْكَافِرُونَ هَٰذَا شَيْءٌ عَجِيبٌ ءَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا، ذَٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيدٌ۔ (ق:٢-٣)

''کفار کہنے لگے کہ یہ تو بڑی عجیب بات ہے، بھلا جب ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے تو یہ لوٹنا دور کی بات ہے!''

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يُنَبِّئُكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ۔ (سباء:٧)

''اور کافر کہنے لگے کہ تمہیں ایسا آدمی نہ دکھائیں جو تمہیں یہ خبر دیتا ہے کہ جب تم پارہ پارہ ہو جاؤ گے تو نئے سرے سے پیدا ہو گے؟!''

بلاشبہ زمانۂ جاہلیت کے بدو بھی ابدی زندگی [1] سے واقف تھے اور لفظ 'خلود' کا

استعمال بھی کرتے تھے۔ لیکن ان کے بے حد حقیقت پسند ذہن میں موجودہ زندگی سے بڑھ خلود کا تصور موجود نہیں تھا۔ دوسرے الفاظ میں ان کے ہاں خلود کا مطلب اسی دنیا کی لمبی زندگی تھا۔

قبل از اسلام شاعری میں جس ابدیت کا بہت زیادہ ذکر ملتا ہے اور جو یقیناً طلوع اسلام سے قبل زمانہ جاہلیت کے عربوں کا سب سے اہم موضوع نظر آتا ہے، دراصل اس سے مراد اسی زمین پر ابدی زندگی ہے۔ اس زمانے کے ادب پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات بہت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ وہ لوگ یہ جانتے تھے کہ دنیوی زندگی میں کتنے بھی خزانے جمع کر لیے جائیں اور کتنے بھی اچھے کام کر لیے جائیں، وہ بیکار ہیں۔ جب تک اس دنیوی زندگی کو کسی طرح سے لافانی نہ بنا لیا جائے۔ اس طرح کا لافانیت کا اصول یا مخلد ان کی تلاش اور جستجو کا محور رہتا تھا۔ تاہم یہ تلاش عبث تھی۔ قرآن کریم شدید طنزیہ اسلوب میں اس طرز فکر کو یوں بیان کرتا ہے:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ

يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ۔ (الہمزۃ: ۱ - ۳)

"بڑی خرابی ہے، اس شخص کی جو عیب جو تا ہے اور
غیبت کرتا ہے جو مال کو جمع کرتا رہتا ہے اور اسے گنتا رہتا ہے۔
وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ کی زندگی دے گا۔"

عرب شاعر الاعشیٰ کہتا ہے:

کبھی بھی یہ نہ سوچو کہ دولت اپنے مالک کو لافانی بنا دیتی ہے۔ (۲)

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جاہلی ادب میں اس خیال کو کہ دولت اس دنیا کی سب سے اہم چیز ہے اور یہ کہ دولت انسان کو لافانی بنا دیتی ہے، زیادہ تر خواتین خصوصاً بیویوں کی زبانی کہلوایا گیا ہے جبکہ مرد اسے بیہودہ اور احمقانہ خیال کرتے ہوئے طنز کا نشانہ بناتے ہیں یا قطع نظر انداز کر دیتے ہیں، کیونکہ یہ اخلاقی اصول "کرم" (فیاضی) کے خلاف ہے۔ مشہور شاعر المخبل (السعدی) کی بیوی خاوند کی فضول خرچی کی عادت پر تنقید کرتے ہوئے کہتی ہے:

إنّ الثراء هُو الخلودُ و
ان المرءَ يُقرِبُ يومه العدمُ(۳)

یقیناً دولت ہی خلود (ہمیشگی) کا نام ہے۔ آدمی کے پاس دولت نہ ہو تو وہ اس کا آخری وقت ہوتا ہے یعنی موت۔

شاعر اس کا جواب یوں دیتا ہے:

إنّی وَجِدّك ما تُخلّدُنی
مائةٌ یَطِیرُ عِفاؤُها ادمٌ(۴)

میں تمہاری قسمت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک سو فربہ اونٹ بھی جن کے بال ہوا میں اُڑ گئے ہوں، مجھے لافانی نہیں بنا سکتے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس دُنیا میں ابدیت حاصل کرنے کے قطعی ناممکن ہونے کا تلخ احساس ایک ایسا تاریک انجام تھا، جہاں جاہلیت کی فکری راہیں آ کر ختم ہوجاتی تھیں اور یہیں سے اسلام نے اپنے عروج کا راستہ اختیار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور جاہلیت دونوں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ انسانی زندگی ناکامی سے دوچار ہے۔ قرآنِ کریم اور جاہلی شاعری دونوں میں زندگی کے عبث اور بے ثبات ہونے کا احساس پایا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ یہ بات کس طرح بار بار دہرائی گئی ہے۔

إنّما الحیٰوةُ الدُّنیا لَعِبٌ ولَهو۔ (محمد: ۳٦)

''بے شک دنیوی زندگی تو محض کھیل تماشا ہے۔''

اعلَمُوا أنّما الحیٰوةُ الدُّنیَا لَعِب و لَهوٌ وَزِینَةٌ وَتفاخُرٌ بینکُم وَتکَاثُرٌ فِی الأموَالِ وَالأولادِ کَمثَلِ غَیثٍ أعجبَ الکُفّار نَبَاتُه ثُمّ یَهِیجُ فَتراه مُصفرًا ثُمّ یَکوُنُ حُطامًا وَفِی الآخِرَةِ عذَابٌ شَدِیدٌ وَ مَغفِرةٌ مِن اللهِ وَرِضوَانٌ وَما الحیٰوةُ الدُّنیَا إلّامَتاعُ الغُرُور۔ (الحدید: ۲۰)

''جان لو کہ دُنیا کی زندگی کھیل تماشا، زینت اور

تمہارے آپس میں فخر اور مال اور اولاد کی کثرت کے علاوہ کچھ نہیں ہے، جیسے کہ بارش اور کھیتی جو کسانوں کو بھلی لگتی ہے، پھر وہ خوب زور پر آتی ہے، پھر اُسے دیکھو تو زرد پڑ جاتی ہے، پھر چورا چور ہو جاتی ہے اور آخرت میں عذابِ شدید اور اللہ کی طرف سے بخشش اور خوشنودی ہے اور دُنیا کی زندگی تو متاعِ فریب ہے۔''

بظاہر دنیوی زندگی کا یہ قنوطی تصور اس تصور سے مختلف نہیں جو شاعروں کے ہاں پایا جاتا تھا۔ قنوطیت کا یہ تاریک سایہ پوری جاہلی شاعری پر چھایا ہوا ہے۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ جاہلی ادب میں یہ بنیادی اور فطری رجحان ہے۔ قبل از اسلام تمام ممتاز شاعروں کے ہاں انسانی زندگی میں اس خلا پر مایوسی کی تلخ آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر عبید بن الابرص کہتا ہے:

تذکرت اهلي الصالحين بملحوب
فقلبي عليهم هالك جد مغلوب

مجھے ملحوب میں موجود اپنے لوگ یاد آئے، میرا دِل ان کے لیے پھٹا پڑتا تھا، غم سے معمور۔

تذكرتهم ما ان تجف مدامعي
كان جدول يسقي مزارع مخروب

وہ مجھے یاد آئے تو میرے آنسو اس تیزی سے بہنے لگے جیسے کسی ویران اور برباد کھیت میں پانی کا نالہ رواں ہو گیا ہو۔

وبيت يفوح المسك من حجراته
تسديته من بين سر و محطوب

میں کئی خیموں میں جن کے کمروں سے مشک کی خوشبو آتی تھی، ایسی حالت میں گیا ہوں، جو گویا خفیہ اور خطبہ (منگنی کا پیغام) کے بین بین تھی۔

ومسمعة قد اصحل الشرب صوتها
تاوی الی اوتار اجوف محنوب

کئی گانے والیاں ہوتی تھیں، جن کی آواز شراب کی وجہ سے بھاری ہو جاتی تھی۔ وہ کھوکھلے بربط کے تاروں پر گایا کرتی تھیں۔

شهدت بفتیان کرام علیهم
حباء لمن ینتابهم غیر محجوب

میں ایسے ساتھیوں کے ساتھ جاتا تھا، جو سب عالی نسب تھے، وہ ایسے لوگ تھے کہ کوئی بھی انہیں مدد کو بلائے تو وہ بے دریغ ہر ایک کی مدد کو اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔

فاصبح منی کل ذلك قد مضی
فای فتی فی الناس لیس بمکذوب

اب یہ سب گذری ہوئی باتیں ہیں، لوگوں میں کون ایسا ہے، جسے جھٹلایا نہ گیا ہو۔

تری المرء یصبو للحیاة وطولها
وفی طول عیش المرء ابرح تعذیب(۵)

تو نے لوگوں کو زندگی سے پیار اور اس کی طوالت کی خواہش کرتے دیکھا ہوگا، لیکن لمبی زندگی غم واندوہ کے عذاب کے سوا کچھ نہیں۔

دیوان کی پہلی نظم میں اپنے عہد جوانی کی یادوں کے علاقے میں پھیلی ہوئی بدویت کی ایک بھرپور تصویر کھینچنے کے بعد یہی شاعر دنیا کی بے ثباتی پر اخلاقی تبصرہ کرتا ہے:

وکل ذی نعمة مخلوس
وکل ذی امل مکذوب

ہر صاحب نعمت سے نعمت چھین لی جاتی ہے اور ہر امید جھٹلا دی جاتی ہے۔

وکل ذی ابل موروث
وکل ذی سلب مسلوب

ہر صاحب مال کا مال وارثوں میں بٹ جاتا ہے اور جو بھی غنیمت حاصل کرتا ہے، وہ اپنی باری پر خود غنیمت بن جاتا ہے۔

والمرء ما عاش فی تکذیب
طول الحیاۃ لہ تعذیب(۲)

جتنی دیر ایک شخص زندہ رہتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو دھوکہ ہی دیتا ہے، عمر کی درازی عذاب میں اضافے کے علاوہ کچھ نہیں۔

لہٰذا جہاں تک زندگی کی بے مائیگی، خالی اور عارضی ہونے کا تصور ہے، اسلام اور جاہلیت دونوں مشترکہ طور پر ایک ہی بات کہہ رہے ہیں۔ لیکن دونوں بالکل مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں، کیونکہ جاہلیت موجودہ دنیا سے آگے نہ کسی زندگی کو مانتی ہے اور نہ ماننا چاہتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام ایک دین ہے جس کی بنیاد آخرت کے روشن عقیدے پر ہے۔ جب ہم یہ بات تسلیم کرلیں اور آنے والی زندگی پر ایمان لے آئیں تو اس دنیا میں ابدیت حاصل کرنے میں ناکامی کسی مایوسی کی طرف نہیں لے جا سکتی۔ چنانچہ ایک جاہل آدمی کے لیے ابدیت جتنا سنگین اور لاینحل مسئلہ تھا، اسلام نے اسے اتنا ہی آسانی سے ایک ایسی دنیا کی طرف منتقل کر دیا، جس کی سرحدیں موجودہ وجود کے آفاق سے پرے ہیں۔

بل تؤثرون الحیوۃ الدنیا والآخرۃ خیر وابقی۔

(الاعلیٰ: ۱۶-۱۷)

”مگر تم لوگ تو دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے۔“

تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الآخرۃ۔ (الانفال:۶۷)

”تم لوگ دنیا کے مال کے طالب ہو اور اللہ آخرت کو چاہتا ہے۔“

المال والبنون زینۃ الحیوۃ الدنیا والبقیٰت
الصٰلحٰت خیر عند ربک ثوابا و خیر املا۔ (الکہف:۴۶)

"مال اور بیٹے تو دنیا کی زندگی کی زینت ہیں اور
نیکیاں جو باقی رہنے والی ہیں، وہ ثواب کے لحاظ سے تمہارے
پروردگار کے ہاں بہت اچھی اور امید کے لحاظ سے بہت بہتر
ہیں۔"

اسلامی تعلیمات یہ ہیں کہ یہ دُنیا عارضی اور فضول ہے، اس لیے اس کا اعتبار نہیں۔ اگر آدمی لافانی بننا چاہتا ہے اور ہمیشہ کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنی زندگی میں بنیادی اصول کے طور پر آخرت کو شامل کرنا ہوگا۔ جاہلیت کی تعلیم تھی کہ یہ دنیا فضول ہے، اس سے باہر کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ اس عارضی زندگی کو بھرپور طریقے سے جینا چاہیے۔ جاہلی ذہن کے لیے حصول مسرت واحد علاج دکھائی دیتا ہے۔

طرفہ کے مشہور معلقہ کے مندرجہ ذیل دو اشعار سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس دنیا میں ابدیت کے ناممکن ہونے کا تعلق عیش اور مسرت کے اصول سے کس قدر اہم ہے۔

الا ایہذا لائمی احضر الوغی
وان اشہد اللذات ہل انت مخلدی؟

اے مجھے جنگ میں موجود رہنے اور لذات میں مشغول رہنے پر ملامت کرنے والے سن! کیا تو مجھے حیاتِ جاودانی دے سکتا ہے؟

فان کنت لاتستطیع دفع منیتی
فدعنی ابادرہا بما ملکت یدی

اگر تو ایسا نہیں کرسکتا اور مجھے موت سے نہیں بچا سکتا تو میرا پیچھا چھوڑ تاکہ میرے پاس جو مال ہے، اسے موت سے پہلے خرچ کرلوں۔ (۷)

جاہلی شاعری دنیوی لذات کے قصائد سے بھری پڑی ہے۔ اس معلقہ میں آگے چل کر یہی شاعر کہتا ہے:

فان تبغنی فی حلقۃ القوم تلقنی
وان تقتنصنی فی الحوانیت تصطد

اگر تو مجھے تلاش کرے گا تو اپنی قوم کی مجالس میں ملوں گا۔ اگر تو میرے پیچھے شراب کی دکانوں میں آئے گا تو وہاں مجھے پکڑ سکے گا۔

ندامای بیض کالنجوم وقینه
تروح علینا بین برد و مجسد

میرے شراب کے ساتھی ستاروں کی طرح روشن ہیں اور ایک مغنیہ سرِ شام دھاریدار چادر اور زعفرانی کپڑوں میں ہمارے پاس آتی ہے۔

رحیب قطاب الجیب منها رقیقة
بجس الندامی بضة المتجرد

اس مغنیہ کے گریبان کا چاک کھلا ہے۔ جب میرے دوستوں کی انگلیاں اسے چھیڑتی ہیں تو وہ بہت نرم خو ہے۔ اس کے عریاں بدن کا حصہ بہت نرم و نازک ہے۔

اذا نحن قلنا اسمعینا انبرت لنا
علی رسلها مطروقه لم تشدد

جب ہم اسے کہتے ہیں، کچھ سناؤ، تو وہ نہایت نرم آواز سے نیچی نگاہ کیے ہوئے کسی سختی کے بغیر ہمارے سامنے گاتی ہے۔ (۸)

ان اشعار میں شراب نوشی کی عادت کا ذکر ہے جو جاہلی لوگوں کے نزدیک مسرت کا سب سے اعلیٰ ذریعہ تھا۔ یہ بات کہ زندگی روز بروز کے اصول پر بتائی جائے اور اس کا جاہلی طرز کی اخلاقیات پر عملی طور پر کتنا اثر تھا، ان اشعار سے بہتر کہیں بیان نہیں ہوئی۔ ان لوگوں کی زندگی میں شراب قسمت کا سب سے بڑا تحفہ تھا۔ زمانۂ جاہلیت کے لوگ اکثر شراب کے رسیا تھے۔ وہ عادتاً بھی شراب پیتے تھے اور اسے فخر و مباہات کا ذریعہ بھی سمجھتے تھے۔ فیاض طبیعت کی سب سے واضح شہادت شراب کی دعوت سمجھی جاتی تھی۔ یاد رہے کہ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی ذاتی خوبیوں میں فیاضی سب سے بڑی خوبی تھی۔

كريم يروى نفسه في حياته
ستعلم ان متنا غدا اينا الصدى (۹)

میں ایسا شریف آدمی ہوں جو اپنی زندگی کو شراب سے سیراب کرتا ہے۔ جب ہم مر گئے تو تجھے معلوم ہوگا کہ ہم میں سے کون پیاسا ہے۔

عبید بن الابرص کہتا ہے:

بماء سحاب في الاباريق فضة
لها ثمن في البائعين ربيح (۱۰)

چاندی کے برتنوں میں بادلوں کا پانی تھا۔ قیمت اتنی کہ تاجروں کی چاندی تھی۔

یہی شاعر ایک اور جگہ کہتا ہے:

نغلي السباء بكل عا
تقة شمول ما صحونا

ہم یہ پرانی شراب کی اونچی بولی لگاتے تھے، جب تک ہوش میں ہوتے تھے۔

ونهين في لذاتها
حضم التلاد ذ التشنيا

اور جب ہم نشے میں ہوتے تو اس کی لذت میں اپنی موروثی دولت کا کوئی حساب نہیں رکھتے تھے۔ (۱۱)

ایک اور مشہور جاہلی شاعر لبید بن ربیعہ جس نے طویل عمر پائی اور بہت آخر میں قبول اسلام کا موقع ملا، اپنی جوانی کے زمانے میں شراب نوشی کے گیت گایا کرتا تھا۔ اس کے معلقہ میں سے مندرجہ ذیل اشعار اس بات کی گواہی دیتے ہیں، جن میں وہ اپنی محبوبہ نوار کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

بل انت لاتدرين كم من ليلة
طلق لذيذ لهوها و ندامها

بلکہ تو جانتی ہی نہیں کہ کتنی ہی راتیں ایسی گزریں جو کھیل کود اور شراب نوشی سے پر لطف تھیں۔

قدبت سامرها وغايه تاجر

وافيت اذ رفعت وعز مدامها

ان راتوں میں، میں قصے سناتا رہا، شراب کے تاجروں نے شراب کی قیمت بڑھانے کے لیے جھنڈے بلند کیے، مگر میں ان کی باتیں سنتا رہا۔

اغلى السباء بكل ادكن عاتق

او جونه قدحت وفض ختامها

میں ہر پرانے شراب کے مشکیزے کو کھول کر یا سیاہ مٹکے کی مہر کو توڑ کر اس میں پیالہ ڈال کر شراب کی قیمت بڑھا دیتا تھا۔

بصبوح صافيه و جذب كرينة

بموتر تاتاله ابهامها

میں صبح ہی صبح شراب پینے میں کتنی لذت محسوس کرتا تھا، جب کہ ساتھ ایک مغنیہ ہو جو اپنی نرم و نازک انگلیوں سے بربط بجا رہی ہو۔

بادرت حاجتها الدجاج بسحره

لاعل منها حين هب نيامها

میں صبح مرغ کے جاگنے سے پہلے اپنی حاجت پوری کر لیتا تھا، تاکہ جب سونے والے بیدار ہوں تو دوبارہ پی سکوں۔ (۱۲)

طرفہ جس کا ہم بار بار ذکر کر چکے ہیں، وہ بھی اسی قسم کا آدمی تھا۔ وہ اپنی نظم میں اپنی بے وقعت قسمت کا ذکر کرتا ہے، جس نے زندگی کی تمام مسرتیں چھین لی ہیں۔

وما زال تشرابي الخمور ولذتي

وبيعي وانفاقي طريفي ومتلدي

میں اسی طرح شراب پیتا رہا، مزے اڑاتا رہا اور اپنی ذاتی موروثی دولت بیچتا اور خرچ کرتا رہا۔

انی ان تحامتنی العشیرۃ کلھا
وافردت افراد البعیر المعبد(۱۳)

حالت یہ ہوگئی کہ تمام خاندان نے مجھے چھوڑ دیا اور میں خارش زدہ اونٹ کی طرح اکیلا رہ گیا۔

ایک قدیم روایت کے مطابق مشہور جاہلی شاعر اعشٰی اس عزم کے ساتھ روانہ ہوا کہ وہ حضرت محمد ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر اسلام قبول کر لے۔ راستے میں ایک جاہلی دوست ملا، جس نے سفر کی وجہ دریافت کی۔ شاعر نے بتایا کہ وہ قبولِ اسلام کے لیے پیغمبر کی طرف جا رہا ہے۔ دوست نے بتایا کہ اسلام زنا کو منع کرتا ہے، اس نے کہا مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ ہوتے ہوتے جب اس کے دوست نے کہا، کیا تم جانتے ہو کہ حضرت محمد ﷺ شراب بھی منع کرتے ہیں۔ تو اس نے کہا، یہ میں آسانی سے چھوڑ نہیں سکتا، اگر یہ بات ہے تو میں واپس جاتا ہوں، سال بھر خوب جی بھر کے شراب پیوں گا اور اگلے سال اسلام قبول کرلوں گا۔ وہ واپس گیا، لیکن اسی سال اس کی وفات ہوگئی۔ چنانچہ وہ پیغمبر کی بارگاہ میں حاضری نہ دے سکا۔(۱۴)

یہ بعینہٖ اسی قسم کے لوگ تھے، جن میں حضرت محمد ﷺ نے مستقبل کی زندگی کے اور یومِ حساب کے نئے عقیدے کا اعلان کیا۔ آپ نے محسوس کیا کہ ان کے اردگرد لہو ولعب، دُنیا داری اور بے مقصدیت کے سوا کچھ نہ تھا۔

وَفَرِحُوا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ۔ (الرعد:۲٦)

”یہ لوگ دنیوی زندگی پر خوش ہو رہے اور دنیا کی زندگی میں آخرت کے مقابلے میں بہت کم فائدہ ہے۔“

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (الانعام:۳۲)

”اور دُنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور شغل ہے۔ اچھا گھر تو آخرت کا گھر ہے، ان کے لیے جو خدا سے ڈرتے ہیں، کیا تم

سمجھ نہیں رہے۔''

یہ بے خدا اور بے پرواہ قوم جس کے نزدیک دنیاوی زندگی مکمل فریب تھی، مذہب کو کھیل اور تماشے کی چیز جانتے تھے۔ قرآن کریم کے نقطۂ نظر سے (۶:۶۹-۷۰، ۷:۴۹-۵۱) دنیوی عیش و عشرت اور دین کے سنجیدہ معاملات میں بے پروائی جاہلیت کی روحانی کیفیت کے رویے کی نمائندہ تھی۔ یہ بے فکرے لوگ جو ہنستے، ٹھٹھے اڑاتے اور مذاق کرتے تھے، انہیں پیغمبر خدا ﷺ نے آنے والے دوزخ کے عذاب کی خبر سنائی۔ آپؐ نے فرمایا کہ یوم حساب بے حد قریب ہے، اُس دن بے خدا لوگوں کو اس دنیا میں اپنی بے مقصد زندگی کا حساب چکانا ہوگا۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ۔ (الاحقاف: ۲۰)

''اور جس دِن کافر دوزخ کے سامنے کیے جائیں گے کہ تم اپنی دنیا کی زندگی میں لذتیں حاصل کر چکے اور اس سے متمتع ہو چکے، آج تم کو ذلت کا عذاب ہے، اس بات کی سزا کہ تم زمین پر ناحق غرور کیا کرتے تھے اور اس بات کی کہ تم بدکرداری کرتے تھے۔''

إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَنْ يَحُورَ بَلَى إِنَّ رَبَّهُ كَانَ بِهِ بَصِيرًا۔ (الانشقاق: ۱۳-۱۴)

''یہ شخص اپنے اہل و عیال میں خوش تھا اور خیال کرتا تھا کہ واپس نہیں جائے گا، ہاں اس کا پروردگار اس کو دیکھ رہا تھا۔''

ان حالات کے پیش نظر قرآنی نقطۂ نظر سے اس دنیا میں انسان کا بنیادی رویہ مایوسی کی بنا پر عیش پرستی نہیں ہونا چاہیے جو کہ قبل از اسلام عربوں میں رواج پا گئی

تھی۔ بلکہ اس کے برعکس یوم قیامت کی آمد کے شدید احساس کی بنیاد پر سنجیدہ طرز زندگی ہونا چاہیے۔ خوفِ خدا یعنی یوم حساب کے مالک کے سامنے ڈر کا رویہ ایک مذہبی جذبات رکھنے والے انسان کے ہر عمل کا بنیادی مقصد ہونا چاہیے بلکہ یوں کہیے کہ یہی رویہ انسان کی زندگی کے رُخ کو متعین کرتا ہے۔ اس ضمن میں بنیادی لفظ تقویٰ ہے۔ انسان کے صحیح معنوں میں شریف ہونے کا ثبوت دنیوی زندگی میں نہیں ملتا۔ صحیح شریف آدمی وہ نہیں جو اپنی دولت کو بے مقصد اور بے اختیار خرچ کرتا ہے۔ شریف وہ شخص ہے جو اخلاقی سنجیدگی سے زندگی گزارتا ہے اور جسے قیامت کی ہولناکی کا ہمیشہ احساس رہتا ہے۔ یہ بات انتہائی اہم ہے کہ قرآن کریم میں لفظ کریم کو تقویٰ یعنی خوفِ خدا کی عبارت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

إن أكرمكم عند الله أتقاكم۔ (الحجرات:۱۳)

''خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا سب سے زیادہ خوفِ خدا رکھنے والا ہے۔''

ہم اس بات کی اہمیت کے بارے میں مزید کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھتے کہ اسلام نے قدیم اخلاقی کائنات کو معنویاتی طور پر نئی قدریں عطا کر کے ایک انقلاب برپا کیا۔ زمانۂ جاہلیت میں کریم کا لفظ اعلیٰ ترین صفات کا حامل تھا۔ اس سے مراد وہ شخص تھا جو حسب و نسب اور فیاضی میں سب سے آگے ہو۔ تاہم اسلام سے پہلے کبھی اعلیٰ اور برتر کے تصور کو خوفِ خدا کے حوالے سے بیان نہیں کیا گیا۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ اس سیاق و سباق میں ''خوف'' کا مفہوم سزا کے ڈر سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ بہت سال پہلے تورآندرے نے ''خوفِ خدا'' کے تصور کا بطور گہری اخلاقی دینی قدر مطالعہ کیا تھا(۱۵) جس کی رو سے خدا یوم حساب کا مالک ہے۔ اس کی بحث کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ اس خوف سے مومن کے ذہن میں زندگی کے بارے میں انتہائی سنجیدگی کا شعور پیدا ہوتا ہے جو اسے اخلاقی متانت اور ذمہ داری کا احساس دلاتا ہے۔ ہمیشہ ایسے عمل کرو جیسے تم اب بھی اس خدا کے سامنے کھڑے ہو جو تمہارے ہر عمل کو جانچتا ہے، اس سے پہلے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال

کا حساب لے۔ اپنے ابتدائی دَور ہی میں اسلام نے انسانی رویّے کا یہ پہلا اور بنیادی اصول متعین کر دیا تھا۔(۱۶) لیکن یہ ساری باتیں اس وقت تک ناممکن اور بے معنی ہوں گی جب تک آخرت کا عقیدہ موجود نہ ہو۔ خوفِ خدا کا اخلاقی اصول صرف اس وقت استوار ہو سکتا ہے جب اس کی بنیاد توحید کے ایسے عقیدے پر ہو جس میں خدا کو یومِ حساب کا مالک مان لیا جائے۔

حواشی:

(۱) اس لمبی زندگی کی لمبائی اضافی چیز تھی۔ ہر شخص اس سے الگ مفہوم مراد لیتا تھا۔ مثلاً جاہلی شاعر عبید بن الابرص کے مندرجہ ذیل شعر میں خلد دو مرتبہ آگے پیچھے استعمال ہوا ہے، لیکن پہلی مرتبہ اس سے مراد دوسروں کے مقابلے میں زیادہ عمر پانا ہے یعنی جب دوسرے مر جائیں گے تب بھی زندہ رہنا، جبکہ دوسری مرتبہ ہمیشہ کی زندگی مراد ہے۔

فخلدت بعدهم ولست بخالد

فالدهر ذو غير و ذو الوان

ترجمہ: میں اُن کے بعد بھی زندہ ہوں، لیکن میں لافانی نہیں، کیونکہ وقت بدلتا رہتا ہے اور اس کے کئی رنگ ہیں۔

Sir Charles Lyall, *The Divans of Abid bin-al-Abras*... (Leyden: Brill, 1913), p.50.

(۲) مصنف نے شعر کا حوالہ نہیں دیا، ہمیں اس مفہوم میں اعشٰی کا صرف مندرجہ ذیل شعر مل سکا ہے:

الم تری الحضر اذ اهله

منعمی وهل خالد من نعم

ترجمہ: کیا تو نے حضر کے لوگوں کو نہیں دیکھا کہ نعمتوں میں زندگی گزارتے تھے، لیکن کیا دولت سے بھی کوئی لافانی ہوتا ہے۔

(دیوان الاعشٰی الکبیر، تحقیق ڈاکٹر محمد حسین، قاہرہ، مکتبۃ الآداب، ۱۹۵۰ء، ص ۴۳) (مترجم)

(۳) دیوان المفضلیات، تحقیق کارلوس لائل، بیروت، مطبعہ آباء الیسوعیین، ۱۹۲۸ء، ص ۲۲۳۔

(۴) دیوان المفضلیات، تحقیق کارلوس لائل، بیروت مطبعہ آباء الیسوعیین، ۱۹۲۸ء، ص ۲۲۳۔

(۵) دیوان عبید الابرص الاسدی، تحقیق چارلس لیال، لیڈن، برل، ۱۹۱۳ء، ص ۳۱-۳۳۔

(۶) دیوان عبید الابرص الاسدی، تحقیق چارلس لیال، لیڈن، برل، ۱۹۱۳ء، ص ۸-۹۔

(۷) المعلقات السبع، ترجمہ وتشریح مولانا قاضی سجاد حسین، کراچی، نور محمد کارخانۂ تجارت، ت۔ن، ص ۲۸۔ معلقہ طرفہ، تحقیق آرنلڈ (لائزنگ ۱۸۵۰ء)، ص ۵۶-۵۷۔

(۸) المعلقات السبع، ترجمہ وتشریح مولانا قاضی سجاد حسین، کراچی، نور محمد کارخانہ تجارت، ت۔ن، ص ۲۸، معلقہ طرفہ، تحقیق: آرنلڈ (لائزنگ ۱۸۵۰ء)، ص ۲۶-۲۷۔

(۹) المعلقات السبع، معلقہ طرفہ، محولہ بالا، ص ۲۹۔

(۱۰) دیوان عبید بن الابرص، محولہ بالا، ص ۲۹۔

(۱۱) دیوان عبید بن الابرص، محولہ بالا، ص ۲۸۔

(۱۲) المعلقات السبع، معلقہ طرفہ، محولہ بالا، ص ۵۵۔

(۱۳) المعلقات السبع، معلقہ طرفہ، محولہ بالا، ص ۲۷۔

(۱۴) ابن اسحاق: سیرۃ، جلد اول، ص ۲۵۶۔

(۱۵) تور آندرے: محمدؐ — حیات و افکار (جرمن)، گوٹنگن، ۱۹۳۲ء، باب سوم۔

Tor Andrae, *Mohammad Sein Leben und Sein Glaube* (Gottingen, 1932).

(۱۶) اولین صوفیا کے ہاں جو زہاد کے نام سے جانے جاتے ہیں، تقویٰ مرکزی نکتہ قرار پایا۔ اس رجحان کی نمایاں مثال حسن بصری ہیں۔ اس موضوع پر دیکھیے: ایچ۔ رٹر: ''اسلامی مذہبیت کی تاریخ کا مطالعہ''، در اسلام (جرمن) جلد ۲۱، (۱۹۳۳ء)، ص ۱-۸۳۔

H. Ritter, "Studien Zur Geschichte de islamischen Frommigkeit Der Islam", Vd.21 (1933), p.1-83.

باب چہارم

قبائلی حمیّت وعصبیت

اب ہم قبائلیت کے مسئلے کی طرف آتے ہیں۔ عام طور پر معلوم ہے کہ قبل از اسلام عرب کی معاشرت اپنی اصل میں قبائلی تھی۔ اکثر مصنفین لکھتے ہیں کہ قبیلے کے افراد میں ایک دوسرے کے ساتھ یکجہتی کا جذبہ ہی دراصل جاہلی اخلاقیات کی روحِ رواں تھا۔ زمانۂ جاہلیت کے عرب معاشرے میں قبیلہ یا بطن معاشرتی زندگی کی بنیاد اور واحد اکائی ہی نہیں تھا، بلکہ یہ سب سے پہلا اور سب سے اعلیٰ اخلاقی اصول بھی تھا جو انفرادی اور سماجی زندگی کے تمام شعبوں کے لیے ایک جامع طرزِ عمل مہیا کرتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسی جاہلی حمیت سے تمام اخلاقی تصورات کے سوتے پھوٹتے تھے، جن پر عرب معاشرت قائم تھی۔ معاشرے کے ہر مرد یا بالفاظِ دیگر گروہ کے ہر انفرادی رکن پر یہ مقدس فریضہ عائد ہوتا تھا کہ وہ قبیلے کی عظمت کے لیے جیے اور خونی رشتوں کے بندھن کی، دُنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزت کرے۔

قبائلی رشتے کے اس احساس کی گہرائی اور غیر عقلی نوعیت کا اظہار درید بن صمہ کے مندرجہ ذیل شعر سے زیادہ واضح کہیں نہیں ملتا۔ وہ کہتا ہے:

وما انا الا فی غزیه ان غوت

غویت و ان ترشد غزیه ارشد[1]

''میں غزیہ سے تعلق رکھتا ہوں، اگر غزیہ غلطی کرتا ہے تو میں بھی غلطی کروں گا، اگر غزیہ صحیح ہے تو میں بھی صحیح ہوں۔''

اس شعر سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ قبائلی عصبیت جاہلی عرب کے اعمال کا رُخ کس طرح متعین کرتی تھی اور قبائلیت کے احکام کی خواہ وہ غلط ہوں یا صحیح کس طرح

پابندی ضروری تھی۔ رائن ہارٹ ڈوزی لکھتا ہے: ''یہ لازوال اور نہ ٹوٹنے والا رشتہ جسے عصبیت کہا جاتا ہے، ہر جاہلی عرب اپنے ہم قبیلہ کے لیے محسوس کرتا تھا۔ اپنی اس معاشرت کے لیے جس میں ایک جاہلی عرب پیدا ہوا، زندگی گزاری اور جہاں اسے موت آئے گی، اس کے مفادات، خوشحالی، شان اور عزت کے لیے اپنے آپ کو مکمل طور پر وقف کر دینا عصبیت کہلاتا تھا۔ یہ جذبہ کسی طرح بھی ہمارے آج کل کے حب وطن کے رویّے سے مماثلت نہیں رکھتا، جو کہ ایک تند خو بدو کے لیے بہت ہی نرم جذبہ ہے۔ عصبیت ایک شدید اور انتہائی جذبہ ہے۔ یہ ایسا فریضہ ہے جو بیک وقت سب سے اوّل اور سب سے مقدس ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ ''صحرا کا اصل دین یہی ہے۔''(۲)
اگر اس بیان کو مبالغہ آمیز بھی قرار دیا جائے تب بھی یہ حقیقت ہے کہ عصبیت صحرا کے جاہلی مذہب سے زیادہ مضبوط اور مؤثر جذبہ تھا۔ جاہلی مذہب ابتدائی درجے کے ایسے مذہب سے کبھی آگے نہ بڑھ سکا، جس میں بہت سے دیوی دیوتاؤں کو مانا جاتا تھا۔ حضرت محمد ﷺ کی آمد کے زمانے تک اس میں مزید زوال آ چکا تھا اور یہ اب سحر اور جادو کی ایک شکل بن کر رہ گیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ عملی طور پر بعض اوقات دوسرے اخلاقی قوانین کی طرح قبائلی عصبیت کے اس قانون کی بھی خلاف ورزی ہوتی تھی۔ صحرا کی دُنیا میں بھی کبھی کبھی ایسے لوگ پیدا ہو جاتے تھے، جن کی انفرادیت اتنی شدید اور منہ زور ہوتی تھی کہ وہ قبائلی مفاد کے پابند نہیں رہ سکتے تھے۔ ایسا شخص فطری طور پر اپنے خطرناک کاموں کی وجہ سے قبیلے کے اندر اور باہر فساد کا باعث بنتا تھا۔ وہ بعض اوقات اپنے اعمال کی وجہ سے اپنے ہم قبیلہ لوگوں کو بھی نہایت خونریز جنگوں میں ملوث کر لیتا تھا، کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں ایک شخص کے شرمناک کاموں کی ذمہ داری اس کے پورے قبیلے یا بطن پر عائد ہو جاتی تھی۔ ایسی صورتِ حال میں اس کی ہر قسم کی ذمہ داریوں سے دست بردار ہونے کے لیے قبیلے کے لیے ایک ہی راستہ ہوتا تھا کہ اس شخص کو رسمی طور پر قبیلے سے باہر نکال دے۔ اس طرح نکالے ہوئے شخص کو خلیع کہا جاتا تھا۔ اس کاروائی کو تبرء(۳) کا نام دیا جاتا تھا۔ اس طرح کے قبیلے سے نکالے ہوئے بے گھر افراد صعالیک (واحد

صعلوک) کہلاتے تھے جو زمانۂ جاہلیت میں صحرا میں گھومتے پھرتے تھے۔ ان میں سے بعض کی حالت بے حد ناگفتہ بہ ہوتی تھی جبکہ دوسرے عزت و وقار کے ساتھ رہتے تھے اور انہیں آزادی اور خودمختاری کی مجسم علامت سمجھا جاتا تھا۔

عروہ بن الورد العبسی کی ایک نظم ایسی ہی آوارہ زندگی کا گیت ہے۔ وہ خود عرب صعالیک کی تاریخ کی ایک نمایاں شخصیت تھا۔ اپنی اس نظم میں اُس نے بھی ان دو قسموں کے صعالیک کا ذکر کیا ہے، جن کا بیان ہم اوپر کر آئے ہیں۔

لحا الله صعلوکا اذا جن لیله
مصافی المشاش آلفا کل مجزر

اللہ کی لعنت ہے، اس بے گھر آوارہ پر کہ جب رات آتی ہے تو وہ اندھیرے میں مذبح خانوں میں ہڈیوں کے سر تلاش کرتا پھرتا ہے۔

ینام عشاء ثم یصبح ناعسا
یحت الحصی عن جنبه المتعفر

رات آتی ہے تو تھک کر سو جاتا ہے۔ صبح اُٹھتا ہے تو ابھی تھکاوٹ نہیں اُتری ہوتی۔ اپنے پہلوؤں سے جو مٹی سے بھرے ہوتے ہیں، گرد جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

ولکن صعلوکا صفیحة وجهه
کضوء شهاب القابس المتنور

لیکن سچا صعلوک وہ ہے جس کا چہرہ اندھیرے میں دائیں سے بائیں کسی شہابِ ثاقب کی طرح دمکتا ہو۔

مطلا علی اعدائه یزجرونه
بساحتهم زجر المنیح المشهر

وہ پڑوس سے اچانک نمودار ہو کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑے اور دشمن اس کو گھروں سے اس طرح ہٹاتے ہیں جیسے جوئے کے تیر کو جس نے کچھ نہیں جیتا ہو۔

اذا بعدوا لا یامنون اقترابه
تشوف اهل الغائب المنتظر (۴)

وہ دشمن سے دور بھی ہو، تب بھی دشمن اسی طرح چوکنے رہتے ہیں، جیسے گھر والوں کو اپنے کسی پیارے کا انتظار ہو۔

شعراء کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربوں نے عقل و حکمت زندگی کے عملی تجربات سے سیکھی تھی۔ ایک شاعر کہتا ہے کہ ایک نازح (آوارہ اجنبی) اس قریبی رشتہ دار سے زیادہ اچھا دوست ہے جس نے رشتے منقطع کر لیے ہوں۔(۵)

بہر کیف یہ تمام مثالیں استثنائی ہیں اور تعداد میں بہت کم ہیں۔ صحرائی ماحول میں ان بے گھر لوگوں کی زندگی اور موت میں خواہ وہ فطری ہو یا انسانی دشمن کے ہاتھوں، بہت کم فاصلہ ہوتا تھا، کیونکہ صحرا کی موسمی اور سماجی صورتِ حال میں زندہ رہنا بہت دشوار تھا۔ اس کے لیے بہت اعلیٰ درجے کی قبائلی یکجہتی ہونا ضروری تھی۔ اگر کسی قبیلے میں باہر کے لوگوں کو شامل بھی کر لیا جاتا تھا اور وہ قبیلے سے نکالے ہوئے لوگوں سے بہتر زندگی گذار رہے ہوتے تھے، تب بھی ان کی حالت ناگفتہ بہ ہوتی تھی کیونکہ وہ بہر کیف قبیلے سے باہر کے لوگ تھے۔ قبیلے میں اس طرح شامل لوگوں کو زنیم کہا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات بے حد اہم ہے کہ اس لفظ کے ثانوی معنوی پیچ، بدکردار یا بے حیثیت لیے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ ابنِ اسحاق جب قرآنِ کریم کی اس آیت کا ذکر کرتے ہیں، جس میں لفظ 'زنیم' استعمال ہوا ہے،(۶) وہاں اس بات کی وضاحت ضروری محسوس کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں زنیم کا لفظ کسی نسبی عیب کے بیان کرنے کے لیے نہیں آیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کے نسب پر نکتہ چینی نہیں کرتا، بلکہ آیت کریمہ میں یہ لفظ اپنے اصلی معنوں میں آیا ہے، یعنی ایسا اجنبی جو کسی قبیلے نے اپنے میں شامل کر لیا ہو۔(۷) ایک جاہلی شاعر الخطیم التمیمی کہتا ہے: کہ قبیلے کی زندگی میں زنیم کو ایک بیکار اور فالتو شخص سمجھا جاتا تھا۔ اگر کوئی شخص اس اضافے کو اپنے خونی رشتہ داروں پر ترجیح دینے کی جرأت کرتا تو اُسے ملامتوں کے طوفان کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بعینہٖ یہی وجہ تھی کہ مدینہ کے جن عرب قبیلوں نے حضرت محمد ﷺ کی حمایت کی تھی، انہیں بے انتہا مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نفرت کا اظہار عصما بنت مروان کے مندرجہ ذیل اشعار میں بہت کھل کے ملتا ہے:

باست بني مالك والنبيت
و عوف و باست بني الخزرج

بنی مالک، بنی نبیت اور بنوعوف میں تم سے کتنی نفرت کرتی ہوں اور بنوخزرج میں تم سے کتنی نفرت کرتی ہوں۔

اطعتم اتاوی من غیرکم
فلا من مراد ولا مزحج[۸]

تم نے ایک باہر سے آئے ہوئے اجنبی کی اطاعت کر لی جو نہ مراد کے قبیلے سے ہے اور نہ مذحج کے۔

زمانۂ جاہلیت کا سماجی نظام اپنی اصل میں قبائلی تھا۔ ان کے لیے انسانی وجود کا حرفِ اوّل بھی قبیلہ تھا اور حرفِ آخر بھی۔ نسبی رشتوں کے بندھن اور عزت و آبرو کا شدید جذبہ خونی رشتوں کی اہمیت پر مبنی تھے اور جس کا یہ تقاضا تھا کہ انسان غلط یا صحیح اپنے ہم قبیلہ بھائیوں کا ساتھ دے، اپنے قبیلے سے محبت رکھے اور باہر کے لوگوں سے شدید حقارت کا برتاؤ کرے۔ یہی وہ چند اصول تھے، جن کی بنیاد پر زمانۂ جاہلیت کے لوگ ذاتی قدروں کو ناپتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں قبیلے سے باہر اچھائی کا کوئی معیار دکھائی نہیں دیتا تھا۔

حضرت محمد ﷺ نے جو مذہبی تحریک شروع کی، اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ آپ نے اس صورتِ حال میں جس کا ہم ذکر کر آئے ہیں، یہ اعلان کیا کہ خون کے رشتوں سے بڑھ کر مذہب کے رشتے ہیں۔ ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھنا، جو خدائے واحد کے عقیدے پر مبنی ہو، یقیناً ایک جرأت مندانہ کوشش تھی۔ پروفیسر گستاف فون گرونیبام[۹] کے الفاظ میں اس معاشرے میں لوگ خون کے نہیں، عقیدے کے رشتہ دار تھے۔ اسی پروفیسر کے بقول حضرت محمد ﷺ کے پیغام میں مذہبی سچائی کے علاوہ جو چیز لوگوں کو اسلام کی طرف زیادہ کھینچتی تھی، وہ درحقیقت اسلام میں ایک نئی معاشرتی سیاسی اکائی بننے کی واضح اہلیت تھی۔ لیکن اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے آپ کو بے شمار مشکلات سے گزرنا پڑا۔ حضرت محمد ﷺ کے جانی دشمن ابوجہل کی

نظر میں حضرت محمد ﷺ ایسے شخص تھے، جنھوں نے سب سے زیادہ خون کے رشتوں کو توڑا اور ناقابل معافی چیزوں کو رواج دیا۔ قریشِ مکہ کے شاعر حارث بن ہشام نے جنگ بدر کے بعد ان لوگوں کی شان میں قصیدہ لکھا، جو حضرت محمد ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے۔

اصيبوا كراما لم يبيعوا عشيرة
بقوم سواهم نازحي الدار والاصل
كما اصبحت غسان فيكم بطانه
لكم بدلا منا فيالك من فعل
عقوقا واثما بينا وقطيعه
يرى جوركم فيها ذو الرأى والعقل(۱۰)

''وہ عزت مند بہادروں کی طرح مارے گئے۔ اُنھوں نے اپنے خاندان کو ایسی قوم کے بدلے میں نہیں بیچا جو اجنبی ہیں، نہ گھر میں ایک ہیں نہ اصل میں۔ جب ہماری (قریش کی) جگہ تم نے غسان کو سچا دوست بنا لیا تو تم خاندان فروش بن گئے۔ تم سے یہ کیسا فعل سرزد ہوا۔ تم نے غداری کی ہے، کھلا جرم کیا۔ رشتے توڑ دیئے، ہر صاحبِ رائے اور صاحبِ عقل اس فعل میں تمہارے ظلم و ناانصافی کو دیکھ رہا ہے۔''

یہ بات یاد رہے کہ سیاسی طور پر حضرت محمد ﷺ نے بھی قبائلی عصبیت کے موجود اصول سے بہت فائدہ اُٹھایا۔ حتیٰ کہ شہرِ مکہ میں خصوصاً عہدِ نبوت کے ابتدائی سالوں میں اسی عصبیت نے آپ کو فائدہ پہنچایا۔ پروفیسر منٹگمری واٹ نے لکھا ہے(۱۱) کہ ''یہ بنو ہاشم کا جو قبیلہ قریش کی ایک طاقتور شاخ تھی، عصبیت کا جذبہ تھا، جس نے ہر قدم پر رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کی اور قریش کے سرکردہ لوگوں کی نفرت اور مخالفت کے باوجود پیغمبرِ خدا (ﷺ) مکہ میں تبلیغ کا کام سرانجام دے سکے۔'' روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ مکہ میں ہاشم کے پوتوں کے عظیم الشان خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

تاہم اس کے باوجود حضرت محمد ﷺ نے قبائلی عصبیت کے اس اصول کو ختم

کر کے عقیدۂ توحید کی بنیاد پر معاشرت کی نئی تنظیم کی بنیاد رکھی اور اسی دُنیا میں ایک ابدی نظام قائم کرنے کے لیے نئے قواعد وضوابط پر مبنی زندگی کا اعلان کیا۔ اس تبدیلی کو بجا طور پر انقلاب کہا جا سکتا ہے۔ یہ انقلاب پہلے پہل خالصتاً مذہبی بنیادوں پر برپا ہوا، لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، اس مذہبی رشتے پر بتدریج سیاسی رنگ غالب آتا گیا۔

بہر کیف یہ حقیقت ہے کہ اسلام نے عقیدے کی بنیاد پر ایک نئی قسم کے بھائی چارے کا آغاز کیا، جس میں تمام افراد ہم عقیدہ تھے اور اُن میں خون کے رشتوں سے زیادہ مضبوط رشتہ عقیدے کا تھا۔ اس کتاب کے نقطۂ نظر سے یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ عصبیت کے اس پرانے نظام کا خاتمہ دراصل آخرت کے خوف کے تصور کی وجہ سے ممکن ہوا۔ کیونکہ اس روز خون کے تمام رشتے جن کی آج اتنی اہمیت ہے، بالکل بے معنی اور بے وقعت ہو جائیں گے۔

فَإِذَا جَآءَتِ الصَّاخَّةُ۔ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ۔ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ۔ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ۔ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ۔

(عبس: ۳۳-۳۷)

اور جب (قیامت) کا شور برپا ہوگا، اس دن آدمی اپنے بھائی سے دُور بھاگے گا اور اپنی ماں اور باپ سے، اپنی بیوی اور بیٹے سے، ہر شخص اس روز اپنی فکر میں ہوگا جو اسے دوسروں سے بے تعلق کر دے گی۔

لَاتَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ۔ (المجادلہ: ۲۲)

جو لوگ خدا پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، تم انہیں خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی کرتے نہ پاؤ گے، خواہ وہ اُن کے باپ بیٹے یا بھائی یا خاندان کے لوگ ہی کیوں نہ ہوں۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَن يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ۔ (التوبہ:۱۱۳-۱۱۴)

پیغمبر اور مسلمانوں کے شایانِ شان نہیں کہ وہ مشرکین کے لیے بخشش مانگیں، خواہ وہ اُن کے رشتے دار ہی ہوں، جب اُن پر ظاہر ہوگیا کہ وہ اہلِ دوزخ ہیں۔ ابراہیم کا باپ کے لیے بخشش مانگنا تو ایک وعدے کے سبب تھا، جو وہ اس سے کر چکے تھے۔ لیکن جب اُن کو معلوم ہوگیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو اس سے بری[۱۲] ہوگئے۔

اخلاقیات کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ انفرادیت کے اصول کا کھلا اعلان ہے۔ قیامت کے دن لوگ انفرادی طور پر خدا کے سامنے پیش ہوں گے۔ ہر شخص کو اپنا بوجھ خود اُٹھانا ہوگا۔ اور یہ صورتِ حال ہر شخص کے لیے اس کی موت کے لمحے سے شروع ہو جاتی ہے۔ عمرو بن عبید کا قول تھا: ''اللہ سے ڈرتے رہو، کیونکہ تم اکیلے مرو گے۔ تمہیں اکیلے حساب دینا ہوگا۔ تمہیں قبر سے اکیلے اُٹھایا جائے گا، جو لوگ اس وقت تمہارے اردگرد ہیں، ان میں سے کوئی بھی اللہ کے سامنے تمہارے کام نہیں آئے گا۔''[۱۳]

تاہم یہ نیا اصول بیک جنبشِ قلم قبائلی اخلاقیات کے اس معیار کو ختم نہیں کر سکتا تھا جو رشتوں کے فطری بندھنوں پر قائم تھا، اور سالہا سال پرانے قبائلی جھگڑے اسی اصول پر طے کیے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ عہدِ اسلامی میں بھی کافی دیر تک یہ رواج قائم رہا۔ ہم نے دیکھا کہ مدینہ میں اوس اور خزرج کے دو متحارب قبیلے حضرت محمد ﷺ کے ماتحت ایمانی اخوت اور دوستی کے باوجود بہت نازک قسم کی یکجہتی کے رشتے میں بندھے تھے۔ ابوقیس ایک مشہور زاہد شخص تھے اور جنھوں نے حضرت محمد ﷺ کے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد اسلام قبول کیا تھا، ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے شعروں میں ابھی عصبیت

کی آواز سنائی دیتی ہے۔

یا بنی الارحام لاتقطعوھا
وصلوھا قصیرۃ من طوال (۱۴)

''اے میرے بیٹو! رشتوں کو نہ توڑو، تمہارے رشتے تنگ دل ہوں بھی تو اُن کو گلے لگاؤ۔''

عصبیت کا جذبہ انسان کے رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک میں رہنمائی کرتا تھا۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی کارفرما ہوتا تھا، جب رشتے دار کسی دشمن کے جھنڈے تلے جمع ہوں۔ ظہورِ اسلام کے بعد عرب میں یہ واقعات اکثر پیش آتے رہتے تھے۔ حضرت محمد ﷺ کے چند صحابہؓ نے جب مکہ سے ہجرت کر کے شاہِ حبشہ کے ہاں پناہ لی تو ایک قریشی ان تمام لوگوں کو ختم کرنے کے لیے خون پر اُتر آیا تھا، اس کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں ایک خداترس آدمی یہ الفاظ استعمال کرتا ہے:

''ایسا مت کرو، وہ ہمارے خون کے رشتہ دار ہیں، اگرچہ اس وقت وہ ہمارے مخالفین میں شامل ہیں۔''(۱۵)

جنگِ اُحد میں حضرت علیؓ مسلمانوں کا علم اُٹھائے ہوئے تھے اور ابوسعید مشرکین کا جھنڈا اُٹھائے ہوئے تھے۔ دونوں دوبدو لڑائی میں مقابل آنے تو حضرت علیؓ نے مقابل کو چت تو گرا لیا، لیکن انہیں قتل کرنے سے باز رہے۔ بعد میں جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے انہیں قتل کیوں نہیں کیا؟ تو آپ نے فرمایا، مجھے اس آخری لمحے میں خون کے رشتے نے کمزور دل بنا دیا تھ (۱۶)

جب حضرت محمد ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمائی تو آپ نے اپنے نئے اصول کے مطابق ایک اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی جو قبیلے کے اصولوں سے بالاتر تھا۔ آپ نے اعلان کیا کہ تمام مہاجر اور انصار آپس میں ایک دوسرے کو دینی بھائی سمجھیں۔ یہ بھائی چارہ پچھلے تمام رواجوں کو اور خون کے رشتوں کے قانون کو منسوخ کرتا ہے۔ مومن صرف مومنوں کے دوست ہوں گے اور کافر کافروں کے۔ حسب نسب اور خون کے تمام رشتے ناقابلِ اعتبار ہوں گے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو علاقے میں ناقابلِ تلافی

اخلاقی فساد برپا ہوگا۔ اس تمام کے باوجود آپ کے زمانے میں بھی جاہلیت کی طرح قبائلی جھگڑے اُٹھتے رہے۔ اگرچہ وہ پہلی انتہا کو نہیں پہنچے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ واضح ہوتا گیا کہ اس بارے میں کچھ رعایتیں دینا ہوں گی۔ قرآنِ کریم کی سورہ ۳۳، آیت ۶ میں اسی قسم کی رعایت کا اعلان ملتا ہے:

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُهٰجِرِیْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤی اَوْلِیٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا۔ (الاحزاب:٦)

پیغمبر ﷺ مومنوں پر اُن کی جانوں سے زیادہ حق رکھتے ہیں اور پیغمبر ﷺ کی بیویاں اُن کی مائیں ہیں۔ اور رشتہ دار آپس میں کتاب اللہ کی رُو سے مسلمانوں اور مہاجرین سے زیادہ ایک دوسرے کے حق دار ہیں، مگر یہ کہ تم اپنے دوستوں کے ساتھ احسان کرنا چاہو۔

اس آیت کا کلیدی نکتہ ''کتاب اللہ'' کی ترکیب کے معانی میں مضمر ہے۔ مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہاں اس سے مراد وراثت کا حق ہے۔ اگر یہ تاویل مان لی جائے تو اس پوری آیت کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ جو لوگ خون کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں، وہ وراثت کے معاملے میں ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں۔ یہ حکم فطری طور پر مسلمانوں کے درمیان اخوت کے اصول کو لامحدود سمجھنے پر ایک طرح کی پابندی لگاتا ہے۔ یعنی اب یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ آپس میں نسبی طور پر کیا رشتہ رکھتے ہیں۔ بہرکیف تاریخ اسلام میں اکثر اوقات قدیم قبائلی مفادات مذہبی رشتوں پر غالب نظر آتے ہیں۔

اس کے برعکس اس عبوری دَور میں دُنیائے عرب میں چند ایسی خصوصیات کا ظہور بھی ملتا ہے، جو قدیم قبائلی عصبیت کی مخالف ہیں۔ ماضی قریب میں قبائلی بندھنوں کے کمزور ہونے کے شواہد ملتے ہیں اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انفرادیت بتدریج مضبوط

ہوتی جا رہی تھی۔ پروفیسر واٹ لکھتے ہیں کہ ذاتی لافانیت یعنی خلود کے بڑھتے ہوئے شعور نے قبائلی انسان دوستی کے اصول کا خاتمہ کر دیا تھا۔ ہم اس مسئلے کو ایک مختلف زاویے سے گذشتہ باب میں بیان کر چکے ہیں۔ پروفیسر واٹ[۱۷] قبائلی انسان دوستی کو ایک اہم دینی قوت گردانتے ہیں، کیونکہ اُن کے بقول ایک انسان کی موت آخر ایک فرد کی تقدیر کا مسئلہ ہی تو ہے، جب کہ قبیلے کا وجود تو قائم رہتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قبائلی عصبیت کے جواب میں انفرادیت کی نشوونما غالباً مکہ میں تجارتی زندگی کے فروغ کے ماحول میں ہوئی تھی۔ تجارتی طرزِ زندگی کے اس مرکز میں قدرتی طور پر اقتصادی اور مادی مفادات نے انفرادیت پسندی کو جنم دیا۔ اس وقت کی سماجی زندگی پر اس کے گہرے اثرات پڑے، حتیٰ کہ اس میں ایک نئی معاشرت کی بنیاد ممکن نظر آنے لگی۔[۱۸] اگر ان دلائل کو تسلیم کر لیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس وقت کی فضا میں زندگی کے نئے تصور کے ساتھ ایک نئے عہد کا شعور موجود تھا، جس میں قبائلی انسان دوستی کی بجائے انفرادی انسان دوستی کی بنیاد پر ایک نئی مذہبی سیاسی معاشرت قائم ہو سکے۔

ہم نے اب تک جاہلی عصبیت کی ایک تفصیلی تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے، اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ پس منظر قارئین کے سامنے لایا جائے، جس کے برعکس اسلام کے اخلاقی تصورات کے خصائص واضح ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے سماجی طرزِ زندگی میں جہاں قبائلی اخلاقیات ہی اتحاد کا واحد ممکن اصول ہوں، جن کی بنیاد پر ایک متوازن اور بہتر نظام قائم کیا جا سکے، وہاں تمام اچھی خصوصیات قبیلے کے افراد کی بجائے خود قبیلے سے منسوب کی جاتی ہیں۔ آج کی دُنیا میں ہم یہ سمجھنے کے عادی ہیں کہ اخلاقی خوبیاں ذاتی صفات ہوتی ہیں، جو افراد میں موجود ہوتی ہیں۔ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے ہاں ایسا نہیں تھا۔ ان کے نزدیک اخلاقی خوبیاں دراصل ایسی مشترکہ اجتماعی دولت کا نام تھا، جو آباؤ اجداد سے وراثت میں ملی تھی۔ کسی بھی شخص کو عظمت اور شان (مجد) ہمیشہ اپنے قبیلے سے وراثت میں ملتی تھی۔ ہر شخص کو احساس تھا کہ اس قبائلی خصوصیت کو اگلی نسلوں تک کسی کمی کے بغیر پہنچانا اس کا مقدس فریضہ ہے، بلکہ ہو سکے تو اس میں

مزید اضافہ کرے۔

ورثنا المجد من آباء
نا فنمی . بنا صعدا[19]

''ہم نے عظمت اپنے آباء سے میراث میں پائی ہے، ہمارے پاس آ کر یہ بلندیوں تک جا پہنچی۔''

ایسے سماجی نظام میں ذاتی صفات کو قبیلے کے شرف سے علیحدہ کر کے سوچنا ممکن نہ تھا۔ استثنا تھی بھی تو چند ایسے افراد کے حوالے سے جنھوں نے اپنی ذاتی بہادری اور کوشش سے شہرت حاصل کی تھی اور اس سلسلے میں انہیں کسی نامور خاندان سے کوئی مدد نہیں ملی تھی۔ ایسے افراد خارجی[20] کے نام سے جانے جاتے ہیں، تاہم اس طرح کے لوگ شاذ و نادر اور اتفاق سے پیدا ہوتے تھے۔ عام طور پر کسی شخص کی عمدگی کی غیر مشکوک ضمانت اس کے حسب و نسب سے وابستہ تھی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی شاعری میں اپنے قبیلے کے آباؤ اجداد کی خصوصیات پر اتنا فخر کیوں کیا جاتا تھا۔ حضرت ابوطالب قریش کی مدح میں فرماتے ہیں:

''اگر ہم تمام لوگوں کا موازنہ کریں تو تم ایک موتی ہو۔ تم لوگوں کو ایک قابلِ احترام نسب کی بنیاد پر ذی وجاہت اور افضل حالت میں قائم رکھتے ہو، جن پر اخلاط کا کوئی دھبہ نہیں۔''[21]

قبائل کے شاندار کارنامے بڑے عزت و احترام کے ساتھ سینہ بہ سینہ روایت کے ذریعے ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے ہیں اور اس عمل کے دوران ان میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ قبائلی عظمت کا اس طرح جو نقشہ بنتا ہے، اسے لفظِ حسب سے یاد کیا جاتا ہے، جس کا قریب قریب ترجمہ ''عظمتِ اسلاف'' کیا جاتا ہے۔[22] ہر ممتاز خاندان کا اپنا ایک حسب ہوتا ہے، جس پر وہ فخر کرتے ہیں۔ حسب وہ حتمی پیمانہ ہے جس کے ذریعے ایک قبیلے کی اقدار اور بالآخر اس قبیلے کے ہر فرد کی اعلیٰ صفات کو ناپا جاتا ہے۔ قدرے مختلف زاویے سے دیکھا جائے تو قبائلی طرزِ معاشرت میں اخلاقی برتاؤ کے لیے حسب ہی واحد اور ممکن رہنما نظر آتا ہے۔ کیونکہ

قبیلے کا ہر فرد اپنے شاندار حسب کو جو اس نے آباؤ اجداد سے ورثے میں پایا ہے، اعلیٰ ترین مثالی اقدار کا مجموعہ سمجھتا ہے۔ برتاؤ کا ایسا کامل نمونہ جس کی تقلید زندگی کے ہر حال میں ضروری ہے، اس کے تمام افعال و اعمال پر اسی کی حکمرانی نظر آتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے تمام اعمال کے درست یا غلط جانچنے کا صرف یہی ایک پیمانہ ہے۔ یہی اقدار اس کے لیے ایک غیر تحریر شدہ ضابطہ اور قانون بن جاتی ہیں۔ (۲۳)

من معشر سنت لهم آباؤهم

و لكل قوم سنة و امامها

''اس کا تعلق ایسے قبیلے سے ہے، جس کے اسلاف نے ان کے لیے سنت (ضابطے) طے کر دی ہے۔ ہر قوم کی اپنی سنت اور (قابلِ تقلید) امام ہوتا ہے۔''

اس طرح کا ضابطہ قانون یا طرزِ زندگی یا یوں کہیے کہ اسلاف کی عزت و وقار کا دستور سنت کہلاتا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ قدیم عرب میں سنت کو اتنا محترم مقام کیوں حاصل تھا اور اسے تقریباً مقدس کیوں سمجھا جاتا تھا۔

ظہورِ اسلام کے بعد بھی ایسے کئی واقعات ملتے ہیں، جن میں حسب کا یہ غیر معمولی جذبہ اپنے اسی زور شور کے ساتھ مسلسل موجود نظر آتا ہے۔ غالباً اس کا سب سے دلچسپ مظہر شعوبیہ کی تحریک ہے، جو عہدِ عباسی کے اوائل میں اُبھری۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ قبائل کے مابین جو قدیم عداوت موجود تھی، وہ اسلامی معاشرت میں عرب اور غیر عرب کے درمیان ایک بہت بڑے پیمانے پر مخالفت میں تبدیل ہو گئی۔ شعوبیہ ایسی تحریک تھی جو تمام مسلمانوں کے درمیان مکمل مساوات کی دعویدار تھی، جس میں نسل، قوم یا حسب نسب کی تفریق نہ ہو۔ ابنِ عبدربہ کی کتاب العقد الفرید کے مطابق اس دعویٰ کا مطلب یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں فخر و مباہات سے منع کیا۔ تاہم عرب اپنے عالی نسب ہونے پر مستقل فخر کا اظہار کرتے رہے اور غیر عرب کو ہمیشہ جاہلیت کے مخصوص رویّہ کے ساتھ حقارت سے دیکھتے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم منطقی اور حقیقی طور پر ثابت کر سکتے ہیں کہ ہمارے پاس فخر و مباہات کے لیے بہتر بنیادیں موجود ہیں۔

شعوبیہ اپنے اس استدلال کی حمایت میں رسول اللہ ﷺ کے وہ مشہور الفاظ نقل کرتے تھے جو آپ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمائے تھے:

''اے بنی آدم! اللہ تعالی نے تمہارے دلوں سے اپنے آباء پر فخر و مباہات کے جذبے کو نکال دیا ہے، جو جاہلیت کے لوگوں کا خاصہ تھا۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنا تھا۔

یہ نکتہ اخلاقی معاملات میں اسلام کے موقف کو صحیح سمجھنے کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ عرب شرفاء میں اپنے آباء کی عزت کے جذبہ سے وابستگی بہت گہری تھی۔ اسلام کے لیے ان اقدار کے بے وقعت ہونے کا اعلان صرف اس عقیدہ کی وجہ سے ممکن ہوا کہ یہ فخر و مباہات بے بنیاد دھوکہ ہے، یہ دنیوی زندگی کی ظاہری شان و شوکت کا پیدا کردہ سراب ہے اور یہ قیامت کے روز اللہ تعالی کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اس ہیبت ناک دِن کو جب ہر شخص کو اس کی قبر سے نکالا جائے گا اور حساب کے لیے اسے بالکل عریاں پیش کیا جائے گا تو اس کے ذاتی ایمان اور نیک اعمال کے سوا جو اس نے دُنیا میں محض مذہبی نیت سے کیے ہوں گے، کچھ کام نہیں آئے گا۔

اب تک ہم نے دیکھا کہ زمانۂ جاہلیت کے عربوں میں عصبیت کے اصول کی بنیاد زیادہ تر فخر و مباہات کے اس احساس پر رکھی گئی تھی جو ایک اعلیٰ نسل سے وابستہ ہونے کے شعور سے پیدا ہوا تھا۔ اعلیٰ ذاتی خصوصیات کسی شخص میں تبھی نشوونما پا سکتی تھیں جب اس کی رگوں میں شریف خون دوڑ رہا ہو۔ یقیناً عزت و آبرو قبل از اسلام معاشرت کا کلیدی تصور تھا۔ یہ یاد رہے کہ اس زمانے میں عزت کو قائم رکھنے اور داغدار ہونے سے بچانے کے لیے شجاعت اور بہادری ضروری تھی۔ جو خود جذبۂ اِباء یعنی انکار کے ذریعے ہی ممکن تھی۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اِباء اور بغاوت کا جذبہ انسانی یا الٰہی اقتدار کے سامنے جھکنے سے انکار کا نام ہے۔ مختصراً یہ کہ مکمل آزادی کا جذبہ مغلوبیت سے شدید نفرت، خود پسندی اور اپنی قوت اور بل بوتے پر مبنی فخر کے احساس کا نام ہے۔ ایسا جذبہ صرف شریف لوگوں سے ہی متوقع تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں

عصبیت کے بطورِ دین مؤثر ہونے کی وجہ بھی یہی تھی کہ یہ شرفا کا مذہب تھا۔ کمزور، غریب، کم نسب اور بے خاندان شخص یا غلام--- یا دوسرے الفاظ میں عام لوگ--- اس مذہب میں کسی طرح بھی شریک نہیں تھے۔

ایسے شریف اور آزاد شخص کے لیے غلامی سے بڑھ کر ذلت کی کوئی شکل نہیں تھی کیونکہ غلام کا کام اپنے آقا کی اطاعت کرنا تھا۔ ایک شریف عرب کے لیے اس قسم کی اطاعت انسان کی ہو یا خدا کی ناقابلِ برداشت تھی۔ جب کہ اسلام کا مطالبہ بعینہٖ یہی تھا کیونکہ قرآنی تعلیمات میں اللہ تعالیٰ آقا ہیں اور انسان کی حیثیت اس کے ایک ماتحت غلام سے زیادہ کچھ نہیں۔

پچھلے باب میں یہ ذکر ہو چکا کہ قرآن کریم خدا خوفی کو ایک ایسے منصف کا ڈر قرار دیتا ہے جو کبھی غلطی نہیں کرتا اور کسی سے نرمی نہیں کرتا اور خدا خوفی کو انسانی وجود کا بنیادی رویّہ قرار دیتا ہے۔ ہم نے اس سے قبل اس قرآنی آیت کا ذکر بھی کیا، جس میں شرافت کی تعریف خدا خوفی کے لفظ سے کی گئی ہے۔

إِنَّ أَكْرَمَكُم عِندَ اللّٰهِ أَتْقَاكُم۔ (الحجرات:۱۳)

تم میں سب سے زیادہ عزت والا، اللہ کے نزدیک وہ ہے، جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو۔

ہم اسی آیت کے بارے میں اب ایک اور نکتہ بھی بیان کرنا چاہیں گے۔ اس آیت میں اسلام کا جو موقف بیان ہوا ہے، وہ زمانۂ جاہلیت کے قدیم تصور کے ساتھ براہِ راست دو طرح سے متصادم ہے۔ اوّل تو یہ آیت ذاتی خوبیوں کو قبیلے کی بجائے فرد میں مرکوز کرتی ہے۔ دوسرے یہ ایک ایسی بات کو خوبی کے طور پر بیان کرتی ہے، جسے زمانۂ جاہلیت کے مغرور جنگجو کمزوری اور ذلت سمجھتے تھے۔ پہلے نکتہ پر تو بات ہو چکی ہے، اب ہم دوسرے نکتے یعنی اسلام کے اخلاقی تصورات میں عجز و انکساری کو ایک بنیادی عنصر قرار دینے کے بارے میں بات کریں گے۔ اس مسئلے کے دو مختلف لیکن ایک دوسرے سے وابستہ پہلو ہیں۔ ایک معاشرتی اور دوسرا روحانی۔

جاہلی معاشرتی نظام میں کمزور، مظلوم، کم نسب اور غلاموں کا اس عظمت و

شان میں کوئی حصہ نہیں تھا، جو نسل در نسل منتقل ہوتی تھی۔ اس کے برعکس اسلام نے شروع سے ہی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم کے عالمگیر ہونے پر زور دیا۔ وہ خدا جو قیامت کے روز اپنی پوری ہیبت کے ساتھ جلوہ گر ہوگا، وہ انتہائی مہربان اور رحیم خدا بھی ہے جو غریب اور امیر، طاقت ور اور کمزور میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس خدا کے سامنے تمام انسان برابر ہیں، خواہ ان کا معاشرے میں کوئی بھی درجہ اور کوئی بھی حسب و نسب ہو۔ یہی نہیں بلکہ وہ کمزور اور بے وقعت لوگوں کو مغرور شرفا کے مقابلے میں ترجیح دیتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ اپنی دُعا میں فرمایا کرتے تھے، اے سب سے مہربان تُو جو مظلوموں کا خدا ہے، تُو ہی میرا رب ہے۔[۳۴] اب یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ مومنوں کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ غریبوں اور کمزوروں کے ساتھ نہایت رحمدلی کا سلوک کریں۔ قرآنِ کریم میں ایسے احکام اور اوامر لاتعداد ہیں، جن میں اِسی جذبے کا اظہار ہے:

مَا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهلِ القُرى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِى الْقُرْبَى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَ ابنِ السَّبِيْلِ كَي لَايَكُونَ دُوْلَةً بَيْنَ الأَغْنِيَاءِ مِنكُم وَمَا أتاكُم الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا وَاتَّقُوا اللّٰهَ۔ (الحشر:۷)

جو مال اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو بستیوں سے دِلوایا ہے، وہ خدا، پیغمبر، رشتہ داروں، حاجت مندوں اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ تم میں جو لوگ دولت مند ہیں، مال انہیں کے ہاتھوں میں نہ پھرتا رہے۔ سو جو چیزیں تم کو پیغمبر دے، لے لو اور جس سے منع کرے، اس سے باز رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔

جو لوگ یتیموں کی عزت نہیں کرتے اور غریبوں اور محتاجوں کی معمولی مدد سے بھی انکار کرتے ہیں، اس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ وہ کنجوس ہیں، اسلام کے نقطۂ نظر سے اس کا سبب اس سے کہیں گہرا ہے۔ اس مخصوص بے رحمی کے رویّہ کا اصل منبع ان کا کفر کا رویّہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور فضل کا شکریہ نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ

اس لیے بخیل ہیں کہ وہ اندر سے ناقابلِ اصلاح کافر ہیں۔

أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ۔

(الماعون:۱-۵)

کیا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے، یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لیے ترغیب نہیں دیتا۔ تو ایسے نمازیوں کے لیے خرابی ہے، جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں اور برتنے کی چیزیں بھی عاریتاً نہیں دیتے۔

مندرجہ ذیل آیت میں کافروں کے اس رویّے پر براہِ راست تنقید کی گئی ہے:

كَلَّا ۖ بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا۔ (سورۃ الفجر:۱۷-۲۰)

نہیں بلکہ تم لوگ یتیموں کی عزت نہیں کرتے اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہو۔ تم میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال کو بہت ہی عزیز رکھتے ہو۔

قرآن میں یہ ذکر بھی ملتا ہے کہ ایک مرتبہ رسولِ خدا ﷺ نے ایک غریب نابینا شخص سے بے توجہی برتی تو خود رسولِ خدا ﷺ کو اللہ کی طرف سے فہمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ جس سورہ میں اس واقعہ کا ذکر ہے، اس کا عنوان ''عبس'' اس بات کی گواہی دیتا ہے۔ ایک روز ایک نابینا صحابی ابنِ ام مکتومؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ قریش کے سرداروں سے بات چیت کر رہے تھے۔ ابنِ ام مکتوم نے اسلام کے بارے میں چند غیر اہم سوال پوچھنا شروع کر دیئے۔ حضرت محمد ﷺ اس دخل اندازی پر ناراض ہوئے اور ان سے منہ پھیر لیا۔ فوراً وحی

نازل ہوئی، جس میں اس رویّے پر آپ پر تنقید کی گئی کہ امیر اور طاقتور لوگوں کے ساتھ عزت سے پیش آنا اور غیر اہم لوگوں کو نظر انداز کرنا کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں۔

عَبَسَ وَ تَوَلّٰی اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّه یَزَّكّٰی اَوْ یَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَه تَصَدّٰی وَمَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰی وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰی وَهُوَ یَخْشٰی فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی۔ (سورۃ عبس:۱-۱۰)

وہ ترش رو ہوئے اور منہ پھیر بیٹھے کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا۔ تم کو کیا خبر شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا یا سوچتا تو سمجھانا اسے فائدہ دیتا۔ جو پرواہ نہیں کرتا تم اس کی طرف تو توجہ دیتے ہو، حالانکہ اگر وہ نہ سنورے تو تم پر کچھ نہیں اور جو تمہارے پاس دوڑتا ہوا آیا اور وہ اللہ سے ڈرتا ہے، اس سے تم بے رُخی اختیار کرتے ہو۔

اور بھی متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ حضرت محمد ﷺ کو بہت نرم الفاظ میں فہمائش کرتے ہیں اور بعض اوقات لہجہ ذرا سا سخت بھی ہو جاتا ہے کہ وہ غریب لوگوں کو دھتکاریں نہیں اور نہ ہی انہیں حقارت سے دیکھیں کیونکہ بہر کیف یہی لوگ ہیں جو اسلام اور اطاعت کی تعلیم کو سب سے زیادہ قبول کر سکتے ہیں۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَه وَلَا تَعْدُ عَیْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِیْدُ زِیْنَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا۔ (الکہف:۲۸)

جو لوگ صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں، ان کے ساتھ صبر سے کام لو، تمہاری نگاہیں اُن سے نہ ہٹیں کہ تم آرائشِ زندگی کے خواستگار ہو جاؤ۔

ایک اور سورہ میں اللہ تعالیٰ پیغمبر کو فرماتے ہیں کہ وہ یتیموں پر ظلم نہ کریں اور مانگنے والوں کو دھتکاریں نہیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ لہجہ بہت ہی قربت کا ہے۔

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوٰى وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى
وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَاَغْنٰى فَاَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ وَاَمَّا السَّائِلَ
فَلَاتَنْهَرْ۔ (سورة الضحیٰ:٦-١٧)

بھلا اس نے تمھیں یتیم پایا تو ٹھکانا نہیں دیا۔ تمھیں راستے سے ہٹا پایا تو ہدایت نہیں دی۔ تمھیں تنگ دست پایا تو غنی نہیں کر دیا۔ تو تم بھی یتیم پر ستم نہ کرنا اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔

یاد رہے کہ ان آیات میں حضرت محمد ﷺ کی بچپن کی زندگی کے ناخوشگوار ذاتی حقائق کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے تاکہ انہیں یہ یاد دِلایا جائے کہ وہ خاص طور پر اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہے اور چنانچہ اِسی وجہ سے اُنھیں غریبوں اور محتاجوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا چاہیے۔ وسیع تر مفہوم میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان کو نرم خو اور نرم دِل ہونا چاہیے کیونکہ خدا بھی رحمان اور رحیم ہے اور انتہائی محبت کرنے والا خدا ہے۔ انسان کی نیکی اللہ تعالیٰ کی نیکی کا پرتو ہے۔ اگرچہ یہ کسی بھی صورت میں نہ اس کی برابری کر سکتی ہے، نہ اس سے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ انسانی نیکی بہرکیف ناقص اور نامکمل پرتو رہے گی۔ ایک اور آیت میں اس بات کو یوں کہا گیا ہے:

وَاَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ۔ (القصص:٧٧)

لوگوں سے بھلائی کرو جیسا کہ اللہ نے تمھارے ساتھ بھلائی کی ہے۔

اس موقع پر یہ بات خاص طور پر ذہن نشین رہنی چاہیے کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی انتہائی فیاضی کی بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں، جن میں یتیم بچوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا اور کمزوروں کی مدد کرنا بہت اہم سمجھا گیا ہے۔ بظاہر جاہلی ذہن مسلمانوں سے زیادہ وسیع القلب اور خیرات کی طرف زیادہ مائل نظر آتا ہے، تاہم دونوں کے بنیادی مقاصد بالکل مختلف ہیں۔ جاہلی ذہن ذاتی خوشی اور فخر وغرور کے لیے کام کرتا ہے اور مسلمان ذہن اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں کرتا ہے۔

چنانچہ اس بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عاجزی اور انکساری کا عنصر جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مقابلے میں انسانی خصوصیت ہے، یہ اسلامی اخلاقیات کا بنیادی نکتہ بنا دیا گیا ہے۔ اسلام میں تمام نہیں تو اکثر واجبات دراصل اسی نیک جذبے کی پیداوار ہیں۔ مومنوں کے لیے ہر ممکن موقع پر نرم دِلی کا حکم دیا گیا ہے۔ خاندان کے معاملات ہوں یا معاشرے کے، تمام انسانی معاملات میں نرم دِلی کو بنیادی اصول ٹھہرایا گیا ہے۔ چنانچہ انسان کو اپنے والدین کے سامنے عاجزی اور نرمی سے پیش آنا چاہیے اور ان سے ہمیشہ نیک سلوک کرنا چاہیے:

وَقَضَى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاه وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ احَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍ وَلَاتَنْهَرْ هُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا۔ (الاسراء:۲۳-۲٤)

اور تمہارے پروردگار نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا تم کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو اُن کو اُف تک نہ کہنا اور نہ اُنہیں جھڑکنا اور ان سے اَدب سے بات کرنا۔ اور عجز و نیاز سے ان کے آگے جھکے رہو۔ اور ان کے حق میں دُعا کرو کہ اے پروردگار جس طرح اُنہوں نے مجھے بچپن میں شفقت سے پرورش کیا ہے، تو بھی اُن پر رحمت فرما۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْه أُمُّه كُرْهًا وَ وَضَعَته كُرهًا وَحَمْلُه وَفِصٰلُه ثَلٰثُونَ شَهْرًا۔ (الاحقاف:۱۵)

اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دِیا۔ اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ پیٹ

میں رکھا اور تکلیف سے جنا۔ اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ
چھوڑنا، تیس مہینوں میں ہوا۔

اسلام نے سالہاسال سے جاری خون کے بدلے خون کا رواج ختم کرنے کے لیے جو حکمتِ عملی اختیار کی، وہ بھی اِسی اصول کا کھلم کھلا مظہر ہے۔ یہ بات محتاجِ بیان نہیں کہ خون کا بدلہ صحرائی زندگی کا سب سے اعلیٰ قانون تھا۔ اس کا عرب کے تصورِ شرف سے گہرا تعلق تھا۔ مروّہ (مروّت) کے تصور کا بنیادی عنصر یہ تھا کہ بدلہ لینے میں مستقل مزاجی لازمی ہے۔ بدوؤں کا سب سے اعلیٰ اخلاقی معیار یہی مروّت کا تصور تھا، جس کا ہم پہلے مختصراً ذکر کر چکے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں انسان کی ایک اہم ذاتی صفت مروّت تھی۔ نکلسن نے بدلے کے بارے میں عرب جذبات کی تصویر کشی کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:

''یہ ایسی تکلیف دہ پیاس تھی، جسے صرف خون ہی بجھا سکتا تھا۔ یہ عزت و شرف کی اِک بیماری تھی، جسے دیوانگی کہا جا سکتا ہے۔''(۲۵)

زمانۂ جاہلیت کی عرب روح میں یہ جذبہ اتنی گہرائی میں جاگزیں تھا کہ اس سے باہر نکلنا ناممکن تھا۔ اسلام نے اس ہولناک دیوانگی کو کم کرنے کے لیے چند سخت پابندیوں کا اعلان کیا۔ چنانچہ یہ حکم ہوا کہ بدلے کے سلسلے میں انصاف کا مطالبہ صرف مجرم کی ذات سے کیا جائے گا اور یہ کہ ایک جان کے بدلے میں ایک جان ہی لی جائے گی۔ آزاد کے بدلے میں آزاد، غلام کے بدلے میں غلام اور عورت کے بدلے میں عورت اور یہ کہ اگر مقتول کے رشتہ دار خون بہا قبول کر لیں اور اس معاملے میں صلح کا طریقہ اختیار کر لیں تو بہتر ہوگا۔(۲۶)

اس ضمن میں ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے، اسلام میں بدلے کا حق انسان سے لے کر اللہ کے ہاتھوں میں دے دیا گیا۔ زمانۂ جاہلیت میں خون کا بدلہ انسان ہی انسان سے لیتا تھا۔ بدلہ انسانی رشتوں اور انسانی سطح پر ہی ہوتا تھا۔ اسلام میں بدلے کا رُخ عمودی کر دیا گیا۔ یا یوں کہیے کہ ایک نئی عمودی سمت ظاہر ہوئی جو افقی خط کو کاٹنے لگی۔ زمین پر کی گئی تمام برائیوں اور زیادتیوں کے لیے اللہ تعالیٰ کو سب سے

بڑا انتقام گیر قرار دیا گیا۔ قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں واضح طور پر دوزخ کے عذاب کو بہت بڑے پیمانے پر انتقامِ خداوندی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔[۲۷] دو قرآنی آیات میں اللہ تعالیٰ کو ذوانتقام کہا گیا۔[۲۸] چنانچہ اللہ ایسا ہے جو کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ وہ انسانوں کے تمام اعمال سے باخبر ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ جن لوگوں نے زیادتیاں کی ہیں، اُن سے وہ بدلہ لے گا۔ چنانچہ اس صورتِ حال میں انسان کے لیے اس سے بہتر اور کیا طریقۂ کار ہو سکتا ہے کہ وہ ان تمام معاملات کو مشیتِ الٰہی کے سپرد کر دے۔ اگرچہ عملی طور پر بدلے کے مسائل میں ابھی بہت سی مشکلات باقی تھیں، تاہم کم از کم اصولی طور پر یہ نتیجہ بہت صریح اور واضح تھا اور یہاں بھی انسانی عمل کا رہنما اصول محبت اور رحمدلی ہی تھا۔

یہ ساری صورتِ حال ایک طرح سے حلم کے اصول کو اسلام میں اخلاقی نظام کا بنیادی نقطہ بنا کر کی گئی۔ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ عربی زبان میں حلم کا تصور قدیم یونانی اتارکسیا کے مترادف ہے، جس کا مطلب تھا کہ معمولی سے بہانے پر برانگیختہ ہونے اور حرکت میں آنے کی بیماری سے افاقہ۔[۲۹]

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا
وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔ (الفرقان:۶۳)

اور خدا کے بندے تو وہ ہیں، جو زمین پر آہستگی سے
چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ سلام
کہتے ہیں۔

اسلام کی طرف سے حلم کے اصول کو اپنانے کا مطالبہ اور اس کے اعلیٰ ترین تصور کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش زمانۂ جاہلیت کے عرب کو جو کہ پیدائشی طور پر بہت جذباتی اور بھڑک اُٹھنے والی طبیعت کا مالک تھا، انتہائی مشکل دِکھائی دیتی ہوگی۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں اس طرزِ زندگی کی تشبیہ عقبہ یعنی پہاڑی راستے پر سب سے مشکل چڑھائی سے دی گئی ہے، تاہم اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اس کی تمام مشکلات پر قابو پالیں گے، وہ قیامت کے دِن دائیں ہاتھ والے لوگوں کے ساتھ ہوں

گے یعنی وہ جنت میں جائیں گے اور اس کی ابدی نعمتوں سے فیضیاب ہوں گے، جبکہ بائیں جانب کے ساتھی آگ کے ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے۔

وَمَا اَدْرٰاكَ مَا الْعَقَبَةُ۔ فَكُّ رَقَبَةٍ۔ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ۔ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ۔ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ۔ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ۔ (البلد: ۱۲-۱۷)

اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے؟ کسی گردن کا آزاد کرنا یا بھوک کے دن کھانا کھلانا، ایسے یتیم رشتہ دار اور مسکین کو جو مٹی میں مل گیا ہو۔ پھر ان لوگوں میں داخل ہونا، جو ایمان لائے، صبر کی تلقین کی اور لوگوں سے نرم سلوک کی نصیحت کرتے رہے۔

اب تک تو ہم نے رحم دِلی کے مسئلے کے سماجی پہلو کا ذکر کیا تھا۔ اب ہم اس کے روحانی پہلو کی طرف آتے ہیں۔ شروع میں ہی یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ عاجزی اور انکساری کا تصور صحرائی عرب کی آزاد روح کے احساسِ شرف اور اس کے تند و تیز غرور کے جذبات سے براہِ راست متصادم ہے۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ حمیتِ جاہلیہ بدوی ذہن کا خاصہ ہے۔

اسلام جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے، سب سے پہلے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان پورے طور پر عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے سرنگوں ہو جائے۔ مسلم کا لفظی معنی اطاعت گزار، سپرد کر دینے والا یعنی ایسا شخص جس نے اپنے آپ کو اور اپنے دِل و دماغ کو مشیتِ الٰہی کے سپرد کر دیا ہے۔ اسلام میں نیکی کی پہلی شرط اور اس کی بنیادی خصوصیت مکمل اور ارادی اطاعت ہے، چنانچہ اس بات پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں کہ یہ بات جاہلیت کے طنز کا خصوصی نشانہ بنی۔ ایک مسلمان کی تمام بنیادی خوبیاں مثلاً عاجزی، صبر، خوف، غرور سے اجتناب، ایک بے باک جاہلی عرب ذہن کے لحاظ سے کمزوری اور عاجزی کا کھلم کھلا اظہار تھا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ

جَهَنَّم وَلَبِئسَ المِهَاد۔ (البقرة:۲۰۶)

اور جب اُسے کہا جاتا ہے کہ خدا کا خوف کرو، تو عزت (۳۰) اور غرور اسے گناہ میں پھنسا دیتا ہے، سو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ قرآنِ کریم میں خوفِ خدا یعنی تقویٰ کو دین کا بنیادی رویّہ قرار دیا گیا ہے۔ ایک سچے مومن کی بہترین تعریف یہ ہے کہ وہ اللہ کے سامنے ڈر سے کانپتا ہے۔ اے لوگو! اللہ کا خوف کرو (سورۃ الحج:۱) اے ایمان والو! خدا کا خوف کرو۔ ہر نفس کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے کل کے لیے آگے کیا بھیجا ہے۔ اللہ سے ڈرو، کیونکہ یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے ہر فعل کو جانتا ہے۔ (سورۃ الحشر:۱۸) پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو قربانیاں تم کرتے ہو، اس کا گوشت اور خون اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچتا، یہ صرف تمہارا تقویٰ ہے جو اس تک پہنچتا ہے۔ (سورۃ الحج:۳۷) ان تمام آیات پر غور کرنے سے بہت آسانی سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں خوف قریب قریب عقیدے اور عبادت کے مترادف ہے۔ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دینے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی عاجزی سے پابندی کرنا جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، دراصل اِسی جذبے کا ایک پہلو ہے۔

وَقَالُوا لَنْ يَدخُلَ الجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصٰرٰى تِلْكَ أَمَانِيُّهُم قُلْ هَاتُوا بُرهَانَكُم إِنْ كُنْتُم صٰدِقِينَ بَلٰى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ۔ (البقرة: ۱۱۱-۱۱۲)

وہ کہتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے سوا کوئی بہشت میں نہیں جائے گا۔ یہ ان لوگوں کے اپنے خیالات ہیں، ان سے کہہ دو، اگر سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔ ہاں جو شخص خدا کے آگے گردن جھکا دے اور وہ نیکی کرے تو اس کا صلہ اللہ کے پاس ہے۔

یہی بات اس مکمل اعتماد پر بھی صادق آتی ہے جو ایک سچے مومن کو اللہ کے احسان پر ہوتا ہے۔ اللہ پر مکمل توکل کا جذبہ کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے، ایک انسان کا اللہ پر اعتماد کمزور نہ ہو، ایک سچے مسلمان کی بنیادی خوبی بتائی گئی ہے۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ۔ (یوسف:۶۷)

بے شک حکم صرف اللہ کا ہے، میں اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور توکل کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ وَمَا لَنَا أَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدَانَا سُبُلَنَا وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَى مَا آذَيْتُمُونَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ۔ (ابراهيم:۱۱-۱۲)

اور مومنوں کو خدا پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے اور ہم کیوں نہ خدا پر بھروسہ رکھیں، جب اس نے ہمیں سیدھے راستے دکھائے اور جو تکلیفیں تم ہمیں دیتے ہو، ہم ان پر صبر کریں گے اور توکل کرنے والوں کو خدا پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ۔ (المائدہ:۲۳)

اور اگر تم مومن ہو تو اللہ پر ہی بھروسہ رکھو۔

آخری آیت خاص طور پر بے حد اہم ہے، کیونکہ اس میں قرآن کریم میں ایمان اور توکل کے مابین معنویاتی رشتے کو بہت واضح اور صریح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح اگلی آیت میں خوفِ خدا اور انکساری کے مابین قریبی رشتے کو دِکھایا گیا ہے:

وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ۔

(الحج:۳۴-۳۵)

اور گردن جھکا دینے والوں کو خوشخبری سُنا دیجیے، جب اللہ کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں۔

یہاں خوف کے لیے لفظ تقویٰ استعمال نہیں ہوا، بلکہ وجل کا فعل کا صیغہ آیا ہے، جس کا مطلب ہے خوف سے دل کا دھڑکنا یا انتہائی خوف محسوس کرنا۔ جہاں تک انکساری اور عاجزی کا تعلق ہے، اس کے لیے لفظ مُخبِت آیا ہے، جو اخبات کا اسمِ صفت ہے۔ اِسی طرح اور بھی بہت سے الفاظ ہیں، جو قریب قریب انہی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ ہم یہاں دو مثالیں دے رہے ہیں، جن کے عمومی سیاق و سباق سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ عاجزی کی صفت کے لیے کِس قسم کا انسانی برتاؤ درکار ہے:

وَاسْتَعِيْنُوا بِالصَّبرِ وَالصَّلٰوةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ أَنَّهُم مُلٰقُوا رَبِّهِم وَأَنَّهُم إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ (البقرة:٤٥-٤٦)

اور صبر اور نماز سے مدد لو، بے شک یہ دشوار ضرور ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو ڈرنے والے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور اِسی کی طرف لوٹنا ہے۔

قُلْ آمِنُوا بِهٖ أَوْ لَاتُؤمِنُوا اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖ إِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِم يَخِرُّوْنَ لِلاَذْقَانِ سُجَّدًا۔ وَيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَا إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلاً۔ وَيَخِرُّوْنَ لِلاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُم خُشُوْعًا۔ (الاسراء:١٠٧-١٠٩)

کہہ دیجیے تم اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، بے شک جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا، جب یہ ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں اور کہتے ہیں، ہمارا رب پاک ہے، ہمارے رب نے جو وعدہ کیا، وہ اُسے ضرور پورا کرتا ہے، وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں، روتے ہیں اور اس سے ان کا ڈر اور بڑھ جاتا ہے۔

عاجزی کے لیے ایک اور لفظ تضرع (ت ض ر ع) بھی استعمال ہوا ہے۔ مندرجہ ذیل آیت ہمارے موضوع کے لحاظ سے انتہائی اہم ہے، کیونکہ اس لفظ کو اس کے متضاد معنی الفاظ کے ساتھ استعمال کر کے اس آیت سے اس کی معنوی ساخت پر روشنی پڑتی ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَى أُمَمٍ مِنْ قَبْلِكَ فَأَخَذْنٰهُم بِالْبَاسَاءِ
وَالضَّرَاءِ لَعَلَّهُم يَتَضَرَّعُونَ فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُم بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا
وَلٰكِن قَسَتْ قُلُوبُهُم وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔
(الانعام:۴۲–۴۳)

ہم نے آپ سے پہلی اُمتوں میں رسول بھیجے پھر ان کو تنگدستی اور بیماری نے آ پکڑا تا کہ وہ عاجز آ جائیں سو جب ان کو ہماری سزا نے آ پکڑا تھا، تو وہ عاجزی اختیار کر لیتے، مگر ان کے تو دل سخت رہے اور شیطان ان کے اعمال کو ان کے خیال میں سجا کر دکھاتا رہا۔

''دل سخت ہونا''، قرآنِ کریم میں بار بار استعمال ہونے والی عبارت ہے، جس کے ذریعے کافر کے مخصوص ذہنی رویّے کی عکاسی کی گئی ہے۔ ہم آئندہ ایک باب میں مزید تفصیل کے ساتھ کفر کے تصور پر بحث کریں گے، وہاں اس بات کے لیے مزید شہادتیں بھی سامنے آئیں گی۔ اس بحث سے معنوی تضاد کا ایک اہم فارمولا سامنے آیا یعنی تضرع (عاجزی)، کفر یعنی ناشکرے پن کا متضاد ہے اور جیسا کہ ہم پہلے ہی جانتے ہیں کہ قرآنی تصور میں ناشکرا پن کفر کی بنیاد ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عاجزی ایمان کی بنیاد ہے۔

اس ضمن میں یہ ذکر نہایت اہم ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کا حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کے بارے میں جو عمومی رویّہ تھا، قرآنِ کریم نے اسے بیان کرنے کے لیے **استکبر** کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ **استکبر** کا لفظ ک ب ر کے مادے سے نکلا ہے، جس کے قریب قریب معنی یہ ہیں کہ اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، مغرور اور خود پسند

ہوتا۔ ہم اس کی معنویاتی ساخت کے منفی پہلو کا ذکر کر چکے ہیں۔ اس پر مزید بات آئندہ بھی ہوگی۔ تاہم یہاں یہ کہنا کافی ہے کہ جہاں تک عاجزی کے تصور کو طرزِ زندگی کے طور پر اپنانے کی بات ہے، اس میں اسلام اور جاہلیت دونوں ایک دوسرے کے بالکل مخالف سمتوں میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ساری اسلامی خوبیاں جو اس اصول سے اخذ کی گئی ہیں، وہ ان تمام بنیادی صفات کے برعکس ہیں، جن پر صحرائے عرب کے لوگ فخر کرتے رہے۔ درحقیقت زمانۂ جاہلیت کے عرب سے عاجزی اور اطاعت کی قطعاً توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ ایک شاعر کہتا ہے:

نأبی على الناس المقادة كلهم
حتى نقودهم بغير زمام(۳۱)

''ہم تمام انسانوں کی اطاعت سے انکار کرتے ہیں، اس وقت تک جب وہ خود ہماری اطاعت کریں گے، بغیر لگام کے۔''

وہ خدا کی بارگاہ میں بھی اپنے اس رویّے کو تبدیل کرنے سے بھی ہٹ دھرمی سے انکار کرے گا، کیونکہ اس کا ذہن جو بتوں یا خداؤں کی بے دِلی سے عبادت کا عادی تھا، اس کے لیے خدا جو نہ تو مطلق ہستی ہے، نہ ہوسکتا ہے، وہ انسانوں سے مکمل طور پر بالاتر نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک عاجزی کی صفت کا تصور ہے، جاہلی عرب کے لیے یہ کمزور دِلی کی علامت تھی۔ اس کی نظر میں صرف ایسے لوگ عاجز ہو سکتے ہیں، جن کا نسب اعلیٰ نہ ہو اور جنہیں فخر وغرور کا کوئی فطری حق نہ ہو۔

صحرا کی زندگی میں توکل ایک اعلیٰ صفت ضرور تھی، لیکن یہ اسلام کی طرح کسی اعلیٰ ہستی کی بارگاہ میں عاجزانہ انکساری کا نام نہیں تھا۔ بلکہ یہ انسانی قسم کی انکساری تھی جو قبیلے کے افراد تک محدود تھی، لیکن اس میں سب سے زیادہ انسان کو خود پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ خود انحصاری شرافت کا نشان تھا۔ یہ وہ بنیادی رویّہ تھا جس کے بارے میں توقع کی جاتی تھی کہ وہ انسان کے کردار کے ہر پہلو میں ظاہر ہو۔ اس کے لیے لفظ استغناء بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ ایک ایسے مادے سے نکلا ہے، جس کا معنی ہے ہر ضرورت سے بے نیاز ہونا اور اس سے انسان کا وہ رویّہ مراد ہے، جس میں وہ اپنے تمام اعمال

میں اپنے آپ کو مکمل آزاد سمجھے جو ہر طرح سے خود مختار ہو اور صرف اپنے بل بوتے پر زندہ رہے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے ایسی خود اعتمادی خود پسندی کی انتہائی شکل ہے جو دراصل انسان کے مخلوق ہونے کا انکار کرتی ہے۔ قرآنِ کریم میں بار بار اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اگر کسی کو مکمل طور پر آزاد اور خودمختار ہونے کا مکمل اختیار ہے تو وہ صرف خدا کی ذات ہے۔ اس نکتے پر گفتگو آئندہ پھر کسی موقع پر ہوگی۔

حواشی:

(۱) کتاب الحماسة للبحتری، بیروت، المکتب الشرقی، ص ۷۸، (الباب السابع والاربعون) مصنف نے نکلسن کا حوالہ دیا ہے۔ مترجم۔

R.A. Nicholson, *Literary History of the Arabs* (Cambridge, 1956), p.83.

(2) R.Dozy, *Histoire des Musulmans d'Espagne*, 2nd edition, Ed. Levi Provencal (Leiden, 1932), 1, 7.

(۳) تبرء یا تبرا کا مطلب خود کو کسی دوسری شے یا کسی دوسرے فعل سے بری قرار دینا ہے۔ بری کا مطلب ہے کسی ناپسندیدہ چیز سے مکمل طور پر آزاد ہونا، اس چیز سے کوئی واسطہ نہ ہونا۔ نہایت دلچسپ بات ہے کہ یہ قدیم لفظ جو جاہلی معاشرتی زندگی سے مخصوص تھا، بعد میں اسلامی دور میں علم الکلام کی اصطلاح بن گیا، جس کا مفہوم مسلم برادری سے باہر کر دینا ہے۔ اسلام کے اوّلین متکلمین خوارج نے اس تصور کو بہت غلط معنوں میں استعمال کیا، اُنہوں نے مسلمانوں کی اکثریت سے اپنے کو بری الذمہ قرار دیا، یعنی اپنے علاوہ دوسروں کو کافر قرار دیا۔

(۴) ابو تمام، حماسہ (بولاق، ۱۲۹۶ھ)، جلد اوّل، ص ۲۱۹-۲۲۰۔

(۵) قد یوصل النازح (النائی) وقد يقطع نوالسهمه القريب

(دیوانِ عبید بن الابرص، بحوالہ بالا، ص ۸، مترجم)

(۶) قرآنی آیت ہے: مناع للخير معتد اثيم عتل بعد ذلك زنيم ان كان ذا مال وبنين۔ (القلم: ۱۲-۱۴) ترجمہ: ''بھلائی سے روکنے والا، حد سے بڑھ جانے والا، گناہگار، سخت مزاج اور پھر اجنبی، صرف اس لیے کہ وہ مال دار ہے اور بیٹوں والا ہے۔

قرآن کے اُردو تراجم میں ''زنیم'' کا مطلب عام طور پر ''بےنسب'' اور ''بدذات'' کیا گیا ہے، جو ابنِ اسحاق کی وضاحت کے برعکس ہے۔ (مترجم)

(۷) ابنِ ہشام، سیرۃ النبی (قاہرہ، دارالفکر ۱۹۸۱ء)، تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید، جلد اوّل، ص ۳۸۴۔

(۸) سیرۃ ابنِ ہشام، جلد ۴، ص ۳۱۴۔

(۹) جی ای فان گرونے بام، اسلام، ایک ثقافتی روایت کی نوعیت اور فروغ پر مضامین (انگریزی)، نیویارک، ۱۹۶۱ء، ص ۳۱۔

G.E. Von Grunebaum, *Islam, Essays in the Nature and Growth of Cultural Tradition*, (New York, 1961).

(۱۰) ابن ہشام، جلد ۲، ص ۳۲۷۔

(۱۱) پروفیسر منٹگمری واٹ: محمد، مکہ میں (آکسفورڈ، ۱۹۵۳ء)، ص ۱۸۔

W. Montgomery Watt, *Muhammad at Mecca*, (Oxford, 1953).

(۱۲) بری یا تبرء کے تصور پر اس باب کے شروع میں گفتگو گذر چکی ہے۔

(۱۳) عمرو بن عبید مشہور معتزلی تھے، جنھوں نے واصل بن عطا کے ساتھ مل کر معتزلہ مکتب فکر کی بنیاد رکھی۔ یہ الفاظ انھوں نے خلیفہ منصور کو تنبیہ کرتے ہوئے کہے۔ ملاحظہ ہو، شریف المرتضی: الامالی (قاہرہ، ۱۹۵۴ء)، جلد اول، ص ۱۷۵۔

(۱۴) سیرۃ ابن ہشام، جلد ۲، ص ۱۳۲۔

(۱۵) سیرۃ ابن ہشام، جلد اول، ص ۳۶۰۔

(۱۶) سیرۃ ابن ہشام، جلد ۳، ص ۱۹۔

(۱۷) منٹگمری واٹ، محولہ بالا، صفحات ۱۹، ۲۵۔

(۱۸) ایضاً، ص ۲۷۔

(۱۹) سیرۃ ابن ہشام، جلد ۱، ص ۱۶۳، شاعر کا نام مخافر بن ابی عامر تھا۔

(۲۰) مثلاً دیکھیے: مفضلیات (تحقیق کارلوس لایل، ۱۹۲۰ء)، ص ۱۰۶، حصین بن حمام کا شعر:

لدن غدوة حتى اتى الليل ماترى من الخيل الا خارجيا مسوما

خارجی ایسے گھوڑے کو کہتے تھے جو نسب کے بغیر بھی عمدہ ہو۔

(۲۱) ہمیں ابن ہشام (جلد اول، ص ۲۹) میں صرف مندرجہ ذیل شعر اس مفہوم میں ملا ہے:

رجال كرام غير ميل نماهم الى الخير اٰباء كرام المحاصل

(۲۲) مثلاً دیکھیے: المفضلیات، محولہ بالا نمبر ۳:۲۵ جو حسب کے تصور کے عناصر ترکیبی کی وضاحت کی عمدہ مثال ہے۔ (ہمیں المفضلیات میں ایسا کوئی شعر نہیں ملا، مترجم)۔

(۲۳) معلقہ لبید بن ربیعہ، کتاب شرح قصائد العشر تالیف خطیب تبریزی، تحقیق کارلوس لایل، کلکتہ، ۱۸۹۴ء، ص ۸۸۔

(۲۴) نکلسن، محولہ بالا، ص ۹۳۔

(۲۵) نکلسن، محولہ بالا، ص ۹۳۔

(۲۶) القرآن سورۃ بقرۃ: ۱۷۸، الحر بالحر والعبد بالعبد والانثى بالانثى فمن عفى له من اخيه شيء فاتباع بالمعروف و اداء اليه باحسان۔

(۲۷) مثلاً دیکھیے، سورۃ الحجر، آیت ۷۹، الروم:۴۷، الدخان:۱۶۔ (ان تمام آیات میں اللہ تعالیٰ کے منتقم ہونے کا ذکر ہے۔ پہلی دو مثالوں میں اللہ تعالیٰ کے اسی دُنیا میں ظالموں سے انتقام لینے کا ذکر ہے۔ آخری مثال کا تعلق آخرت سے ہے۔

(۲۸) سورۂ ابراہیم:۴۷ اور الزمر:۳۷۔

(۲۹) قرآن حکیم کی تعلیمات میں حلم کے تصور کو بے انتہا اہمیت حاصل ہے۔ تاہم اس کے باوجود قرآن میں اس لفظ کا استعمال اتنی اہمیت کا حامل نہیں، ہم نے اس سوال کا جواب اپنی ایک اور کتاب ''خدا اور انسان، قرآن میں'' میں بہت تفصیل سے دیا ہے۔

(۳۰) دیکھیے: تفسیر بیضاوی، جہاں عزت کا معنی حمیتِ جاہلیت بتایا گیا ہے۔

(۳۱) دیوان عبید بن الابرص، محولہ بالا، ص ۲۲۔

باب پنجم

قدیم عرب اقدار اور اسلام

ابھی تک ہم زندگی کے بنیادی اصولوں کے بارے میں اسلام اور جاہلیت کے مابین جو اساسی تضاد موجود ہے، اس کو واضح کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تاہم یہ بڑی ناانصافی ہوگی کہ جاہلی دور اور خود اسلام کے موقف کے بارے میں بھی اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ اسلام نے قبل از اسلام عرب کی تمام اخلاقی اقدار کو عقیدۂ توحید کے ناموافق قرار دیتے ہوئے، بلاتفریق رد کر دیا تھا۔ قدیم عرب تصورِ کائنات اور قرآن کے نقطۂ نظر میں ایک قسم کا تسلسل یقیناً دکھائی دیتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے کہ ان دونوں میں فرق بہت واضح ہے۔ یہ بات خاص طور پر اخلاقی صفات کے میدان میں بہت عیاں ہے۔ اس باب میں ہم اِسی مسئلے پر غور کریں گے۔

یہ صحیح ہے کہ بہت سے اہم پہلوؤں میں اسلام کا راستہ قدیم مشرکانہ جاہلیت سے بالکل الگ تھا، لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جاہلی بت پرستانہ رسوم و رواج پر شدید تنقید کے باوجود قرآنِ کریم نے زمانۂ جاہلیت کی بہت سی ممتاز اخلاقی اقدار کو اپنایا اور انہیں ایک نئی شکل میں دوبارہ زندہ کیا جو عقیدۂ توحید کے تقاضوں کو پورا کرتی تھیں۔ کسی حد تک ہم یہ کہنے میں بھی حق بجانب ہوں گے کہ اسلام کا اخلاقی پہلو قدیم عرب اقدار اور بدوی فضائل کی بحالی ہے جو طلوعِ اسلام کے وقت ملک کے دولت مند تاجروں کے ہاتھوں زوال پذیر ہو چکے تھے۔

اس سلسلے میں یہ ذکر بے حد اہم ہے کہ بعد کے مسلم سیرت نگاروں کے ہاں حضرت محمد ﷺ کی جو تصویر ملتی ہے، وہ اکثر صحرائے عرب کے مثالی بطلِ جلیل کی ہے۔ یہ بات بھی بے حد دلچسپ ہے کہ کتبِ حدیث میں حضرت محمد ﷺ کے جو ذاتی فضائل بیان

ہوئے ہیں، وہ قبل از اسلام شعراء کے دیوانوں کے ممدوح کی صفات کے عین مطابق ہیں جو بدوی اقدار کے حامل ہیں۔ مثلاً حضرت ابوطالب کی زبانی رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کا بیان جسے ابن ہشام نے اپنی سیرۃ میں نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

اجود الناس کفا و اجرء الناس صدرا واصدق الناس لهجةً واوفى الناس ذمةً والينهم عريكه واكرمهم عشيرةً من رأه بديهةً هابه ومن خالطه احبهٔ يقول ناعته: لم ارقبنه و لا بعده مثله۔(۱)

"وہ انسانوں میں سب سے زیادہ فیاض ہیں، سب سے مضبوط دل والے، سب سے زیادہ زبان کے سچے، اپنے وعدوں کے پورا کرنے میں سب سے زیادہ پکے، بے حد متین اور سنجیدہ اور دوستانہ گفتگو میں بہت زیادہ شریف ہیں۔ جو آپ کو پہلی دفعہ دیکھتا وہ خوف کھاتا لیکن جو ان سے بہت زیادہ ملتا جلتا، وہ ان سے محبت کرنے لگتا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے ایسا شخص کبھی نہیں دیکھا۔"

غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک ایسے مثالی شخص کی تصویر کشی ہے، جس میں عرب جاہلیہ کی اعلیٰ اقدار کے خلاف کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔

بہرکیف قرآنِ کریم میں صحرا کی بہت سی اخلاقی اقدار کا ذکر ملتا ہے، جن کو نیا اسلامی رنگ دے دیا گیا ہے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں سب سے اعلیٰ اخلاقی قدر مروّہ (مروّت، مردانگی) تھی اور یہ بھی ذکر ہو چکا ہے کہ فیاضی، بہادری، حوصلہ، صبر، اعتماد اور سچائی جیسی صفات اسی ایک قدر سے وابستہ تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں بہت تاکید کے ساتھ مسلمانوں کو انہی صفات کی تلقین کی گئی ہے۔ تاہم سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسلام نے ان صفات کو بطور بدوی صفات کے دوبارہ زندہ یا بحال نہیں کیا، بلکہ ان صفات کو اخلاقی تعلیمات کے ایک نظام میں ڈھال کر اسلام نے زیادہ پاکیزہ بنایا اور تازہ زندگی دی تاکہ ان سے حاصل شدہ قوت ان نئے مقاصد میں صرف کی جا سکے جو اسلام نے متعین کیے تھے۔ علم اللغات کی رو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جاہلی زمانہ کی کلیدی

اخلاقی اصطلاحات ایک خاص معنویاتی تغیر کے عمل سے گزریں۔

معنویاتی تجزیے کے لحاظ سے ان الفاظ میں سے بعض کے معانی میں بہت زیادہ وسعت پیدا ہو گئی، بعض کے معنی محدود کر دیئے گئے اور بعض کو کلیتاً نئی جہت دی گئی۔ بہرصورت قرآنی تعلیمات کی رُو سے مروّت کے قدیم تصور میں سے اس کی ایسی تمام اضافی شکلوں کو خارج کر دیا گیا، جو نقصان دہ تھیں اور اب اسے ایک بہتر اور مزید مہذب شکل دے دی گئی۔ نئی مسلم معاشرت میں اس تبدیلی سے نئی اخلاقی قوت پیدا ہوئی اور یقیناً اس سے اسلامی ثقافت کو ایک مخصوص رنگ ملا۔

فیاضی:

ہم بحث کے آغاز کے لیے فیاضی کی صفت سے بات شروع کرتے ہیں، جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ فطری طور پر صحرائی زندگی میں اعلیٰ انسانی صفات کی فہرست میں خیرات کا جذبہ اور فیاضی انتہائی اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔ صحرا میں جہاں زندگی کی بنیادی ضرورتیں بھی بے حد کمیاب ہیں، مہمان نوازی اور باہمی تعاون یقیناً زندگی کی بقا کی جدوجہد کا ایک بنیادی عنصر ہیں۔ لیکن بات اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ جاہلی عربوں کے ذہن میں فیاضی کا تعلق جاہلی عزت اور آبرو کے تصور سے وابستہ تھا۔ زمانۂ جاہلیت کا شاعر زھیر بن ابی سلمیٰ کہتا ہے:

ومن یجعل المعروف من دون عرضه
یفره ومن لا یتق الشتم یشتم (۲)

''جو احسان کو اپنی آبرو کے لیے آڑ بنائے گا، تو اس کی عزت و آبرو میں اضافہ ہوگا اور جو دوسروں کو گالی دینے سے نہ بچے گا، اُسے بھی گالی دی جائے گی۔''

فیاضی کے کام انسان کی عالی نسبی کا ثبوت سمجھے جاتے تھے۔ کوئی شخص فیاضی کے معاملے میں جتنا زیادہ اسراف اور بے سوچے سمجھے خرچ کرنے کا مظاہرہ کرتا تھا، اس کی اتنی ہی زیادہ تعریف ہوتی تھی۔ ایک جاہلی عرب کے لیے خیرات اس کی عصبیت کے جذبے کا فطری اظہار ہی نہ تھا، بلکہ خیرات ان لوگوں کے لیے بھی تھی، جو اس کے قبیلے کے افراد نہ

ہوں، حتیٰ کہ ایسے غیر لوگ بھی جو خیرات کے وقت سامنے موجود ہوں۔ نہ ہی فیاضی محض نرم دلی اور رحم کے جذبے کا مظاہرہ تھا۔ یہ اوّل اور آخر مردانگی کا مظاہرہ تھا۔ جو شخص فیاضی کا شاہانہ مظاہرہ کرتا، وہ صحرا کا سب سے زیادہ محبوب شخص سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ فیاضی ان معنوں میں عربوں کا سب سے غالب جذبہ تھا۔ یہ ایک اخلاقی خوبی سے زیادہ ایک ایسا اندھا اور بے اختیار جذبہ تھا، جو عربوں کے دل کی گہرائیوں میں موجزن تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، زمانۂ جاہلیت کے شاعر بہت زیادہ شراب نوشی کی عادت کو فخریہ خالص فیاضی کی ایسی صفت کے طور پر بیان کرتے تھے جو کہ عالی نسبی کا ثبوت سمجھی جاتی تھی۔ ان کے اشعار میں ایک عالی نسب شخص کبھی کل کی فکر نہیں کرتا۔ اس تعریف کا صحیح مطلب یہ نکلتا ہے کہ کسی شخص کو فیاضی محض شہرت کی خوشی کے لیے کرنی چاہیے تاکہ دیکھنے والوں کے دلوں میں اس کے لیے انتہائی تعریف کے جذبات اُبھریں۔ یہ تعریف صرف مہمان ہی نہیں بلکہ دوسرے بھی کریں۔ چنانچہ فطری طور پر یہ فیاضی بے سوچے سمجھے شاہ خرچی کے مترادف تھی۔ حاتم طائی جس کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور ہیں، یقینی طور پر بدوی فیاضی کی مجسم مثال ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قدیم عربی زبان میں کریم صفت عالی نسبی اور فیاضی دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں کریم وہ شخص ہے، جسے ہر شخص اس لیے عالی نسب اور شریف مانتا ہو کہ اس نے بے حد وحساب فیاضی کے ذریعے اپنی عالی نسبی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ قرانِ حکیم نے کریم کے اسمِ صفت میں سے اس معنویاتی عنصر (اسراف) کو کس طرح جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے، اور اسے خوفِ خدا اور تقویٰ کے حوالے سے کس طرح نئے معنی عطا کیے ہیں۔

بنیادی طور پر اسلام کا نقطۂ نظر وہی ہے جو قدیم جاہلی عربوں کا تھا۔ یعنی زمانۂ جاہلیت کی طرح اسلام بھی خیرات کو ایک اعلیٰ قدر تسلیم کرتا ہے۔ دونوں یکساں طور پر فیاضی کو ایک اہم صفت گردانتے ہیں۔ البتہ اسلام نے اس صفت کو نئی مذہبی سیاسی معاشرت کا معاشی اصول بنا کر صریحاً یہ ثابت کر دیا کہ یہ خوبی اسلام میں زیادہ اعلیٰ قدر کی حامل ہے۔ علاوہ ازیں بدوی فیاضی کی قدر میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی، جو اسلامی عقیدے کے خلاف یا ناموافق ہو۔

ولست بحلال التلاع مخافة
ولكن متى يسترفد القوم ارفد(۳)

''میں کسی کے ڈر سے ٹیلوں پر فروکش ہونے والا نہیں ہوں، مگر جب قوم مجھ سے مدد مانگتی ہے تو میں اس کی مدد کرتا ہوں۔''

یہ شعر جاہلی شاعر طرفہ کے فخر کا اظہار ہے۔ یہاں ڈر کا اشارہ دراصل مہمانوں کا ڈر ہے، جو اس کے خیمے میں مہمان نوازی کی توقع سے آئے ہوں۔ مسلمانوں کی نظروں میں بھی ایسا رویہ اتنا ہی قابلِ احترام اور قابلِ تعریف ہے۔ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدح گو حضرت حسان بن ثابت بھی آپ کی تعریف میں کہتے ہیں کہ وہ ایسا شخص ہے جو اپنے اموال کو بے حد فیاضی سے خرچ کرتا ہے، خواہ وہ اس کے اپنے ہوں یا موروثی۔ تنگی کے زمانے میں بھی جب بہت زیادہ فیاض شخص بھی اپنے مال کو روک لیتا ہے، آپ فیاضی سے کام لیتے ہیں۔(۴)

ان دونوں مثالوں میں صرف ایک بنیادی فرق ہے، وہ یہ کہ اسلام نے فیاضی کے ایسے تمام اعمال جو دکھاوے کے لیے کیے جائیں رد کر دیے۔ مردانگی یا شہرت جو کسی مقصد کے بغیر ہو وہ محض ایک شیطانی حرص و ہوس ہے۔ فیاضی بجائے خود اہم نہیں بلکہ اہمیت اس جذبے کو ہے جو فیاضی کو جنم دیتا ہے۔ فیاضی کے ایسے تمام کام جو فخر و غرور کے لیے کیے جائیں، بے قیمت ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَى كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا۔ لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ۔ (البقرة: ۲٦٤)

مومنو! اپنے صدقات کو احسان رکھنے اور ایذا دینے سے اس شخص کی طرح برباد نہ کر دینا جو لوگوں کے دکھاوے کے لیے مال خرچ کرتا ہے اور خدا اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، تو اس کی مثال

اس چٹان کی سی ہے، جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو اور اس پر زور کا مینہ برس کر اسے صاف کر ڈالے۔ یہ لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کر سکیں گے اور خدا ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ فیاضی ایک اخلاقی صفت ہے، لیکن یہ اخلاقی صفت جب اسراف کی حد کو پہنچے تو برائی بن جاتی ہے۔ اس آیت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جو شخص ایسا کرتا ہے، اُسے واضح طور پر کافر کہا گیا ہے۔ ایک اور آیت میں شاہ خرچ کو بڑی صراحت سے شیطان کا بھائی بتایا گیا ہے۔

إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهِ كَفُوراً۔ (الاسراء:۲۷)

بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

کنجوسی یقیناً قابلِ مذمت ہے اور ایک اخلاقی نقص یا برائی ہے، لیکن حد سے زیادہ خرچ کرنا بھی ایک اخلاقی نقص ہے۔ ہمیشہ درمیان کا راستہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ مومنوں میں سے ان کے ذاتی اموال کے بارے میں یہی ضابطہ اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُوراً۔ إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ۔ إِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا۔ (الاسراء:۲۹-۳۰)

اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے باندھ لو اور نہ بالکل ہی کھول دو کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ، بے شک تمہارا پروردگار جس کی روزی چاہتا ہے، فراخ کر دیتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے، وہ اپنے بندوں سے خبردار ہے اور دیکھ رہا ہے۔

وَالَّذِيْنَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا۔ (الفرقان:۶۷)

اور وہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بے جا اُڑاتے ہیں اور
نہ کنجوسی کرتے ہیں، بلکہ اعتدال کے ساتھ، نہ ضرورت سے زیادہ نہ
کم۔

فیاضی کو صحیح معنوں میں اسلامی قدر بنانے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ بے سوچے سمجھے کام کرنے کا داعیہ جو زمانۂ جاہلیت کا مخصوص روّیہ تھا، ختم کر دیا جائے۔ ایسا شخص جو اپنے تمام اونٹوں کو فوراً (دعوت کے لیے) ذبح کر دے اور ایک لمحہ رُک کر بھی نہ سوچے کہ اسے یا اس کے خاندان کو کس طرح افلاس یا غربت کا مستقبل میں سامنا ہو سکتا ہے۔ ایسا شخص زمانۂ جاہلیت میں مروّہ اور کرم کی مثال تو ہو سکتا ہے، لیکن اسلام میں اس کا فعل صحیح فیاضی کا عمل نہیں سمجھا جا سکتا۔ صحیح فیاضی یہ ہے کہ انسان اللہ کے راستے میں اپنا مال صرف کرے، یعنی اس کا فیاضی کا جذبہ نیک ہو۔(۵) نیکی کے جذبے پر بنیاد رکھنے کی یہ ایسی صفت بن جاتی ہے جو ضبط اور قابو میں رہتی ہے۔ اسلام کا جذبۂ فیاضی زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے شیخی اور اسراف کی فیاضی کے عمل سے بے حد مختلف ہے۔ چنانچہ اسلام نے مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کی تاکہ وہ فیاضی کے فطری جذبے کو نہایت مناسب طریقے سے اپنا سکیں۔ اور فخر و غرور اور اسراف کے شیطانی جذبات سے بچ سکیں۔ فیاضی کا جذبہ جو عرب کی روح کی گہرائیوں میں موجود تھا، زکوٰۃ و خیرات نے اس کے لیے ایک ایسا مصرف فراہم کیا جو ایک بہتر بدل بھی تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی فاضل قوت کو منظّم کرنے کا بہت بڑا وسیلہ بھی۔

یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسلامی حکومت میں خیرات بہت جلد ایک قانونی ٹیکس کی شکل اختیار کر گئی جو زکوٰۃ کے نام سے معروف ہے۔ یہ بات بھی ثابت ہے کہ یہ نظام آنحضرت ﷺ کی زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ تاہم قرآنِ کریم میں ہمیں کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا کہ زکوٰۃ کتنی اور کس طرح ادا کی جائے۔ قرآنِ کریم میں مومنوں کو خیرات کی بار بار تلقین کی گئی ہے جو ایک نیکی کا کام ہے، لیکن یہ حکم ذاتی اخلاقیات کے دائرے میں آتا ہے اور سماجی فرائض کی شکل اختیار نہیں کرتا۔ بالفاظِ دیگر یہ ایک مذہبی فریضہ ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جن

آیات میں مومنوں کو خیرات کا حکم دیا گیا ہے، اور یہ آیات کثیر تعداد میں ہیں، ان سب میں ہمیشہ ایمان کو بطور مصدر اور آخرت میں انعام بطور نتیجہ بیان کیا گیا ہے۔

آمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَانْفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِيْنَ فِيهِ فَالَّذِيْنَ آمَنُوا مِنْكُم وَأَنْفَقُوا لَهُم أَجْرٌ كَبِيْر۔ (الحديد:۷)

خدا پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جس مال میں اس نے تمہیں اپنا نائب بنایا ہے، اس میں سے خرچ کرو، تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور خرچ کرتے رہے، ان کے لیے بڑا ثواب ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُم فِي سَبِيلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ انبَتَت سَبعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضْعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ۔ اَلَّذِيْنَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُم فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَايُتبِعُونَ مَآأَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى لَهُم أَجرُهُم عِندَ رَبِّهِم وَلَا خَوفٌ عَلَيهِم وَلَاهُم يَحزَنُونَ۔ (البقرة:۲٦۱- ۲٦۲)

جو لوگ اپنا مال خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں، اُن کی مثال اس دانے کی سی ہے، جس سے سات بالیں اُگیں اور ہر ایک بال میں سو سو دانے ہوں اور خدا جس کو چاہتا ہے، زیادہ کرتا ہے۔ وہ بڑی کشائش والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ جو لوگ اپنا مال خدا کے راستے میں صرف کرتے ہیں، پھر اس کے بعد نہ اس خرچ کا کسی پر احسان رکھتے ہیں اور نہ تکلیف دیتے ہیں، ان کا صلہ ان کے پرودگار کے پاس ہے اور ان کو نہ کچھ خوف ہوگا نہ غم۔

قرآنِ کریم کی مندرجہ بالا آیات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ صحرانشین عربوں میں خاص طور پر بعض لوگ ایسے تھے جو بظاہر اچھے مسلمان تھے، لیکن صدقات کو ایک طرح کا جرمانہ یا جبری ٹیکس سمجھتے تھے۔ جبکہ وہ لوگ جو صحیح معنوں میں مسلمان تھے، وہ ان صدقات و خیرات کو اللہ کے قرب کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

اَلأَعرابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا وَأَجْدَرُ أَلَّا يَعْلَمُوا حُدُودَ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلىٰ رَسُولِهِ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ۔ وَمِنَ الاَعرَابِ مَنْ يَتَّخِذُ مَا يُنفِقُ مَغرَمًا وَيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَائِرَ عَلَيهِم دَائِرَةُ السَّوءِ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيم وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُؤمِنُ بِاللّٰه وَاليَومِ الآخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنفِقُ قُرُبٰتٍ عِندَاللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُولِ أَلا إِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُم، سَيُدخِلُهُم اللّٰه فِيْ رَحْمَتِهِ۔ (التوبہ:۹۸-۹۹)

بدوی عرب سخت کافر اور سخت منافق ہیں اور اس لائق ہیں کہ جو احکام خدا نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں، ان سے واقف ہی نہ ہوں اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ بعض بدوی عرب ایسے ہیں کہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں، اسے تاوان سمجھتے ہیں اور تمہارے حق میں مصیبتوں کے منتظر ہیں، انہی پر بری مصیبت ہو اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اور بعض بدوی عرب ایسے ہیں کہ خدا پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں، اُسے خدا کی قربت اور پیغمبر کی دُعاؤں کا ذریعہ سمجھتے ہیں، بے شک یہ ان کے لیے قربت ہے اور خدا عنقریب ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔

تاہم یہاں بھی یعنی اللہ کی راہ میں بھی، بے سوچے سمجھے خرچ کرنے سے بچنے کے لیے کہا گیا ہے۔ زکوٰۃ ہر مسلمان کے لیے ایک مذہبی فریضہ ہے، لیکن اپنے تمام اثاثے کو بے سوچے سمجھے اس طرح خیرات کر دینا کہ آدمی اپنے آپ کو اپنے ہی ہاتھوں افلاس کا شکار بنا ڈالے، یہ بعینہٖ زمانۂ جاہلیت کی بے خدا معاشرت والی غلطی کا ارتکاب ہے۔ ہمارے خیال میں سورۃ بقرہ کی مندرجہ ذیل آیت اِسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اگرچہ قدیم مفسرین نے اس کے بہت سے دوسرے مطالب بیان کیے ہیں۔

وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُم إِلَى التَّهْلُكَةِ(۶) وَأَحْسِنُوا(۷) إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ۔

(البقرۃ:۱۹۵)

اور اللہ کی راہ میں خرچ کیا کرو اور اپنے آپ کو اپنے ہی ہاتھوں سے ہلاکت میں نہ ڈالو اور احسان کرو۔ بے شک اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اگر اپنے آپ کو اپنے ہی ہاتھوں ہلاکت میں ڈالنا قابلِ مذمت ہے تو کنجوس کہلانا اس سے بھی زیادہ مذموم بات ہے۔ بخل فیاضی کی صفت کا عین متضاد ہے۔ اسے بے حیائی اور بدنامی کا واضح ثبوت سمجھا جاتا ہے۔ جس طرح فیاضی کو سب سے اعلیٰ قدر سمجھا جاتا تھا، اسی طرح فطری طور پر زمانۂ جاہلیت اور اسلام دونوں میں بخل کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ بخل کا ذرا سا شبہ بھی مردانگی کے تصور کے لیے قابلِ شرم تھا۔ مشہور شاعر زہیر کے معلقہ کا مندرجہ ذیل شعر صحرائی اخلاقیات کا خلاصہ ہے۔

ومن یك ذا فضل فیبخل بفضله

علی قومه یستغن عنه ویذمم[۸]

”جس شخص کے پاس ضرورت سے زیادہ مال ہو، اور وہ اپنے زائد مال میں بخل کرے تو اس سے بے پروائی کی جائے گی اور اس کی مذمت کی جائے گی۔“

روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت محمد ﷺ نے قبیلہ بنو سلمہ کے لوگوں سے پوچھا کہ ان کا رئیس کون ہے؟ اُنہوں نے جواب دیا، الجد بن قیس، اگر چہ وہ بخیل ہے۔[۹] رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بخل سے بڑھ کر کوئی موذی مرض نہیں ہے۔[۱۰]

یہ ممکن ہے جیسا کہ پروفیسر واٹ کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مکہ کے امیر لوگ خاص طور پر اس مذموم عادت کا اظہار کرنے لگے ہوں۔[۱۱] اس بات کا بھی امکان ہے کہ قرآنِ کریم میں مکے کے تاجروں کو طعن و تشنیع کا نشانہ اس لیے بنایا گیا ہے کہ وہ بخل میں انتہائی پست درجے تک چلے گئے تھے۔ تاہم ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی صحرا میں ایسے لوگوں کی بہت بڑی تعداد نظر آتی ہے جو اپنے بخل اور لالچ میں مشہور تھے۔ یہ بات کہ بہت سے شاعروں نے اپنے اشعار میں بہت زور دے کر یہ کہا ہے کہ وہ لالچ سے پاک ہیں، خود اس بات کی شہادت ہے کہ معاشرے میں یہ برائی

موجود تھی۔

ایک ہم عصر عرب مصنف [۱۴] زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے ایک بہت ہی عجیب وغریب نکتہ سامنے لایا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی شاعری کی ''کتاب الاغانی'' اور دوسری روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ بخل کے بارے میں عورتیں خاص طور پر بدنام تھیں۔ شواہد کی کثیر تعداد کی بنیاد پر وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ عام طور پر عورتیں بہت کنجوس تھیں یا کم از کم مردوں کے مقابلے میں زیادہ کنجوس تھیں، کیونکہ معاشرے میں اور گھر میں ان کی حیثیت اسی بات کا تقاضا کرتی تھی۔ ان کی نظروں میں لامحدود فیاضی قابلِ تعریف صفت نہیں تھی، بلکہ اس کے برعکس یہ مردوں میں ناقابلِ علاج خرابی تھی۔ یہ اس لحاظ سے بھی قابلِ مذمت تھی کہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ہی یہ خاندان کی خوشی کے لیے نقصان دہ اور تباہ کن تھی۔ خواتین کے نقطۂ نظر سے فیاضانہ مہمانداری خصوصاً جب اس میں افراط ہو محض بے وقوفی تھی۔ درحقیقت قدیم شاعری میں بیویوں کو ہمیشہ اپنے خاوندوں کی برائی کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ وہ اپنے قیمتی اموال کو بے پروائی سے خرچ کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف مرد حضرات اپنی فضول خرچی اور فیاضی کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان کے پاس محض ایک عذر تھا کہ صرف فیاضی کے ذریعے ہی وہ ابدی شہرت حاصل کر سکتے ہیں، جبکہ دولت عار اور مذمت کا باعث ہے۔

یہ بات انتہائی دلچسپ ہے کہ طلوعِ اسلام کے وقت امیر تاجروں کا بالکل یہی نقطۂ نظر تھا جو ہم نے زمانۂ جاہلیت کی خواتین کا بیان کیا ہے۔ مکے کی اس آبادی میں جو بنیادی طور پر تاجر پیشہ تھی، مروت کی قدر اپنا اثر و رسوخ کھو چکی تھی۔ عزت و آبرو کا قبائلی احساس اب زندگی کا اصول نہیں رہا تھا۔ عزت اور آن کی بجائے اب دولت زندگی کا مقصود بن چکی تھی۔ وہی دولت جس کے بارے میں صحرائی عرب حقارت آمیز الفاظ استعمال کرتے تھے، جن سے شرم اور مذمت کا اظہار ہوتا تھا، اب عزت وشہرت کا واحد ذریعہ وہی دولت سمجھی جانے لگی تھی۔ بخل برائی نہیں بلکہ طاقت کا اصلی ذریعہ قرار پا چکا تھا۔ فطری بات تھی کہ مکہ کے امیر لوگ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی قرآنی الفاظ میں اپنی مٹھیاں بند

رکھے ہوئے تھے، اور فرض شدہ زکوٰۃ اور صدقات ادا کرنے میں سستی سے کام لیتے تھے، بلکہ بعض اوقات کھل کر انکار کر دیتے تھے۔ چنانچہ فطری طور پر قرآنِ کریم انہیں بخل کا طعنہ دیتا ہے۔

وَمِنْهُم مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتَانَا مِن فَضْلِه لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُونَنَّ مِنَ الصَّالِحِيْنَ۔ فَلَمَّا اٰتٰهُم مِّن فَضْلِهٖ بَخِلُوا بِهٖ وَتَوَلَّوا وَّهُم مُّعْرِضُون۔ (التوبہ: ۷۵-۷٦)

ان میں سے بعض ایسے ہیں، جنہوں نے خدا سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنی مہربانی سے مال عطا فرمائے گا، تو ہم ضرور خیرات کریں گے اور نیکوکاروں میں سے ہو جائیں گے، لیکن جب خدا نے ان کو اپنے فضل سے دیا تو اس میں بخل کرنے لگے اور روگردانی کر بیٹھے۔

قرآنِ کریم میں ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں انتہائی خوفناک سزا کی وعید سنائی گئی ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُونَ بِمَا ءَاتٰهُمُ اللّٰهُ مِن فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُم بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُم سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَة۔ (آلِ عمران: ۱۸۰)

جو لوگ اللہ کے دیئے ہوئے فضل میں کنجوسی کرتے ہیں، وہ اسے اپنے حق میں اچھا نہ سمجھیں، بلکہ یہ اُن کے لیے بُرا ہے۔ قیامت کے دن اس کا طوق بنا کر اُن کے گلے میں ڈالا جائے گا۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُم وَجُنُوبُهُم وَظُهُورُهُم هٰذَا مَا كَنَزْتُم لِاَنفُسِكُم فَذُوقُوا مَا كُنتُم تَكْنِزُوْنَ۔ (التوبہ: ۳٤-۳۵)

جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ

میں اسے خرچ نہیں کرتے تو ان کو بڑے دردناک عذاب کی خبر سنا دیجیے، جس روز ان کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا۔ پھر ان سے ان لوگوں کی پیشانیوں، کروٹوں اور پشتوں کو داغا جائے گا، یہ ہے وہ جس کو تم نے اپنے لیے جمع کر رکھا تھا، سو جو تم نے جمع کیا تھا، اس کا مزہ چکھو۔

ہم یہاں اس آیت میں مذکور فی سبیل اللہ کی ترکیب پر مزید گفتگو کرنا چاہیں گے۔ یہاں پھر یہ دکھایا گیا ہے کہ بخل اپنے عمومی معنوں میں مذمت کا ہدف نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مخصوص مذہبی عمل کے حوالے سے قابلِ مذمت ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایسے لوگ جو اللہ کی راہ میں بخل سے کام لیتے ہیں، جو زکوٰۃ کی ادائیگی میں کنجوس طبیعت کا اظہار کرتے ہیں، انہیں دوزخ کے ابدی عذاب کی وعید سنائی گئی ہے، کیونکہ یہی کفار حضرت محمد ﷺ کی نئی دینی تحریک کے خلاف مدد کرنے اور خرچ کرنے میں بہت خوشی سے دولت صرف کرنے کے لیے تیار تھے۔ قرآنِ کریم کی بہت سی آیات میں اس کی شہادت ملتی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ۔ (الانفال: ٣٦)

جو لوگ کافر ہیں، اپنا مال خرچ کرتے ہیں کہ (لوگوں کو) خدا کے رستے سے روکیں۔

اسلام کی جانب سے بخل کی برائی کی پُرزور مذمت اور اس پر شدید عذاب کی وعید اس وقت کے معاشرتی حالات میں کوئی غیر مانوس یا نئی چیز نہیں تھی۔ خصوصاً صحرائی عرب بھی بخل کو برا جانتے تھے۔ بعض لحاظ سے تو یہ ایک اہم قدیم بدوی قدر کا احیاء نظر آتا ہے۔ اگر ہم جاہلی خواتین کے کنجوسی کے رویّے کو سامنے رکھیں تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ جاہلی مروّت کی قدر کے خاص مردانہ پہلو کی بحالی کی کوشش تھی۔ لیکن یہ محض اس قدیم بدوی جذبے کی بحالی نہیں تھی جو لوگوں کو شاہ خرچ فیاضی سے روکنے والے تمام عناصر سے نفرت کا نام ہے۔

اسلام کی یہ خاص بات ہے کہ اس نے اس جذبے کو اپنی پرانی شکل میں بیدار نہیں کیا، بلکہ ایسی شکل دی جو اس کے اپنے تقاضے کے لیے نہایت مناسب تھی۔ عرب ذہن میں بخل کے خلاف جو بے مقصد نفرت موجود تھی، اس کی بجائے اسلام نے اسے ایک نیا داعیہ دیا، جس سے اسے ایک نیا رُخ ملا، اور ایک نئے مثالی تصور کے لیے نیا عزم ملا۔

تاہم یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اللہ کے راستے میں بخل کی یہ مذمت انسانی مزاج کی بنیادی خصوصیت کے گہرے مشاہدے پر مبنی ہے۔ انسان فطری طور پر کنجوس اور لالچی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اللہ کے راستے میں کنجوسی انسانی روح کے اس بنیادی رویّے کے اظہار کے علاوہ کچھ نہیں۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّىْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا۔ (بنی اسرائیل: ۱۰۰)

آپ فرما دیجیے کہ اگر تم لوگ میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک بھی ہوتے تو خرچ کرنے کے اندیشے سے ضرور ہاتھ روک لیتے اور آدمی تو ہے ہی بڑا تنگ دِل۔

اس آیت میں کنجوسی کے لیے لفظ قتور آیا ہے، جس کے معنی بھی بخیل ہیں۔ یعنی ایسا شخص جو بخل کی صفات سے جانا جاتا ہے۔ ق ت ر کا مادہ فعل کی شکل میں قرآنی سورۃ نمبر ۲۵، آیت نمبر ۶۷ میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہاں یہ اسراف کے بالمقابل استعمال ہوا ہے۔ یعنی بے پروائی سے اپنی دولت کو خرچ کرنا۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَ كَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا۔ (الفرقان: ۶۷)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور نہ ہی کنجوسی کرتے ہیں، ان کا خرچ کرنا اعتدال پر ہوتا ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ قتر فضول خرچی کے مخالف دوسرا انتہائی سرا ہے۔ یعنی یہ کنجوسی کی انتہائی شکل ہے۔

اِسی موضوع پر قرآنِ کریم میں ایک اور اہم لفظ شح بھی استعمال کیا گیا ہے، جس سے مراد انتہائی درجے کی کنجوسی یا لالچ ہے۔ اس لفظ میں ناپسندیدگی اور مذمت کے انتہائی عناصر شامل ہیں۔ یہ لفظ بخل کو ذہنِ انسانی کی انتہائی مذموم حالت بیان کرتا ہے۔ شح اور بخل میں فرق بیان کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ بخل کنجوسی کے عمل کو ظاہر کرتا ہے، جبکہ شح اس ذہنی کیفیت کا نام ہے، جو بخل کے فعل کا تقاضا کرتی ہے۔[۱۳] قرآنِ کریم میں اس لفظ کے استعمال سے اس تفسیر کی تصدیق ہوتی ہے۔ بہرکیف یہ بات بے حد اہم ہے کہ قرآنِ کریم میں شح کا لفظ روحِ انسانی کی بنیادی فطرت کے حوالے سے مذکور ہوا ہے۔

وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ وَإِن تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۔ (النساء:۱۲۸)

کنجوسی اور لالچ تو نفوس کے اندر موجود ہے۔ اگر تم اچھے کام کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيْعُوا وَانْفِقُوا خَيْرًا لِّأَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُّوقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (التغابن:۱۶)

اللہ سے جہاں تک ہو سکے ڈرتے رہو، سنو، کہنا مانو اور خرچ کرو تو تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ جو شخص نفسانی حرص سے بچا رہے، وہی کامیاب ہے۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْإِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوْتُوا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (الحشر:۹)

جو لوگ ان سے پہلے سکونت اور ایمان سے مالا مال تھے، جو کوئی ان کے پاس ہجرت کر کے آئے، اس سے محبت کرتے ہیں اور انہیں جو کچھ ملتا ہے، اس پر اپنے دلوں میں کوئی ضرورت محسوس

نہیں کرتے اور ان لوگوں کو اپنے پر ترجیح دیتے ہیں، خواہ خود فاقے سے ہوں۔ جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے بچا رہا، وہی کامیاب رہا۔

شجاعت:

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآنِ کریم نے فیاضی کی پرانی قدر کو نومولود مسلم معاشرت کے مذہبی ماحول میں دوبارہ زندہ کرتے ہوئے، اس مخصوص عرب جذبے کو کس طرح ایک اصلی اسلامی قدر میں تبدیل کر دیا۔ بالکل یہی بات شجاعت کی صفت پر بھی صادق آتی ہے۔ فطری طور پر صحرائی حالات میں شجاعت اور بہادری کو سب سے اعلیٰ صفت کا درجہ حاصل تھا۔ یہ مروّہ کا سب سے بنیادی عنصر تھا۔ عرب سرزمین میں جہاں کی آب و ہوا اور قدرتی حالات انسانی زندگی کے لیے شدائد و مصائب کا باعث تھے، اور جہاں لوٹ مار جرم و گناہ کی بجائے اکثر موت سے بچنے کا ایک ہی راستہ تھا، وہاں جسمانی قوت اور فوجی طاقت سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں ہو سکتی۔ عرب لوگوں میں قبائلی عزت جس کے بارے میں ہم کافی تفصیل سے بیان کر چکے ہیں، زیادہ تر طاقت اور قوت پر مبنی تھی۔ صحرا کے عربوں کے لیے خونخوار لڑائیاں خواہ ذاتی ہوں یا قبائلی، زندگی اور عزت کا دارومدار تھیں۔ یہ زمانہ بزدلوں اور کمزوروں کے لیے انتہائی مشکل کا وقت تھا۔

وما انتميت الى خور ولا كشف
ولا لئام عذاه الباس اوراع

''میں کمزوروں اور نہتوں کی اولاد میں سے نہیں، نہ ہی کسی ادنیٰ درجے کے پست ہمت بزدلوں کی۔''

بل ضاربين جيك البيض اذ لحقو
ثم العرانين عند الموت لذاع (۱۴)

''میں تو ان جنگجوؤں کی اولاد ہوں کہ جب ان کا سامنا ہو تو زرہوں کی قطاریں کاٹتے جاتے ہیں، جو لمبی میانوں کے ساتھ تیزی سے موت کی طرف بڑھتے تھے۔''

یہ اشعار ضرار بن خطاب کے ہیں، ان میں بہت واضح طور پر فخر و غرور کا اظہار ہے، اسی طرح زہیر کہتا ہے کہ صحرا میں جو شخص اپنے پانی کا دفاع ہتھیاروں سے نہیں کر سکتا، وہ تباہ ہو جاتا ہے اور جو دوسروں کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا، وہ خود زیادتی کا شکار ہو جاتا ہے۔[۱۵] ان حالات میں بہادری اور شجاعت صرف دفاعی ہتھیار ہی نہیں بلکہ یہ ایک زیادہ مثبت اور جارحانہ قدر کا نام تھا۔ اپنے اخلاقی اصولوں کے بارے میں یہ بیان کرتے ہوئے زہیر کو کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی، جب وہ کہتا ہے کہ ''ایک جنگجو شخص کے لیے جو شیر کی طرح خونخوار ہے، اپنے دشمن پر جوابی حملہ کرنا اور اس کو سزا دینا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کو پہل کر کے جارحانہ حملہ کرنا چاہیے، خواہ کسی نے بھی اس کے ساتھ زیادتی نہ کی ہو۔''[۱۶] چنانچہ جاہلی عرب لوگوں میں بہادری اور شجاعت اکثر بے رحمانہ ظلم اور خون خواری کا دوسرا نام تھا، جس سے وہ قبائلی جھگڑوں میں نبرد آزما ہوتے تھے۔ ہم پہلے اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ جاہلیہ درحقیقت حلم کی عین متضاد کیفیت کا نام ہے۔

جاہلیت کی طرح اسلام میں بھی شجاعت قابلِ تعریف ہے اور بزدلی شرمناک۔ زمانۂ جاہلیت کی طرح اسلام میں بھی ایک انسان کے لیے یہ انتہائی شرف کی بات تھی کہ اس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ:

> ''خطرات میں اس کے قدم نہیں ڈگمگاتے، وہ کمزوری
> نہیں دکھاتا، جنگ کے میدان میں وہ دشمن کے خلاف بہادر اور دلیر
> ہے۔'' (کعب بن مالک)

اسی طرح اگر کسی کے بارے میں مندرجہ ذیل بات کہی جائے کہ ''وہ موت سے ڈر کر پیچھے ہٹے، اسی لیے ان کی ذاتی چراگاہیں مالِ غنیمت بن گئیں۔ انہوں نے بہت ہی ذلیل اور پست ہمت بزدلوں کا کام کیا۔'' تو زمانۂ جاہلیت کی طرح مسلمانوں کے ہاں بھی یہ کم تحقیر آمیز بات نہیں تھی۔ تاہم فیاضی کی صفت کی طرح اسلام نے بہادری میں سے بھی انتہاپسندی کی جاہلی صفات کو نکال دیا اور اسے خاص اسلامی صفت بنایا۔ زمانۂ جاہلیت میں گویا بہادری کا اظہار صرف بہادری کے لیے تھا۔ زمانۂ جاہلیت کی شاعری کے عمومی جائزے سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ اس زمانے کے جنگجو محض اپنے بے قابو جذبے کی تسکین

کے لیے جنگوں میں بے جگری سے لڑتے ۰۰رندر بہادری کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اس زمانے میں بہادری ایک ناقابلِ ضبط جذبہ تھا۔ اسلام نے اس میں ایک مخصوص تبدیلی کی۔ تاہم اس کی اصل قوت میں ذراسی بھی کمی نہیں کی۔ اب بہادری ایک اندھا اور بے قابو جذبہ نہیں تھا، بلکہ ایک محترم اور منضبط شجاعت کا نام تھا، جس کا مقصد اعلیٰ مذہب حقہ کی خدمت تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ شجاعت اللہ کے راستے میں بہادری دِکھانے کا نام تھا۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُونَكُم مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيْكُم غِلْظَةً، وَاعْلَمُوا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ۔ (التوبہ:۱۲۳)

اے ایمان والو! ان کفار سے لڑو جو تمہارے آس پاس ہیں، وہ تمہارے اندر سختی پائیں، جان رکھو کہ اللہ متقین کے ساتھ ہے۔

اَلاَ تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَكَثُوا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِاِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُمْ بَدَءُوكُم اَوَّلَ مَرَّةٍ اَتَخْشَوْنَهُم فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُؤمِنِيْنَ۔ قَاتِلُوهُم يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُم وَيُخْزِهِم وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَومٍ مُؤمِنِيْنَ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِم وَيَتُوبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔ (التوبہ:۱۳-۱۵)

کیا تم ایسے لوگوں سے نہیں لڑو گے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا اور رسول کے جلا وطن کرنے کی تجویز کی اور انہوں نے تم سے پہلے خود چھیڑا۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو، اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو، ان سے لڑو۔ اللہ تعالیٰ ان کو تمہارے ہاتھوں سزا دے گا اور ان کو ذلیل وخوار کرے گا اور تمہیں ان پر غالب کرے گا اور مسلمانوں میں سے بہت سوں کے دلوں کو شفا دے گا۔ ان کے دلوں سے غصے کو دور کرے گا اور جسے

منظور ہوگا، توجہ دے گا۔ اللہ تعالیٰ بڑے علم و حکمت والے ہیں۔

صحرا میں افواہیں ناقابلِ یقین تیزی سے پھیلتی ہیں۔ ایک جاہلی جنگجو کے لیے یہ ناقابلِ برداشت شرم کی بات تھی کہ اس کے بارے میں کہا جائے کہ اس نے جنگ کے میدان میں پشت دِکھائی اور دشمن کے سامنے سے بھاگ نکلا۔ کیونکہ یہ صرف اس کی ذات کے لیے شرمساری کا باعث نہیں تھا، بلکہ پورے قبیلے کے لیے عار کی بات تھی۔ ایک مسلمان کے لیے بھی اللہ کے راستے میں لڑتے ہوئے دشمن کے سامنے سے بھاگ جانا، اللہ کے دین کے خلاف سب سے مکروہ گناہ کا ارتکاب تھا۔ بھگوڑا کہلوانا اخلاقی داغ تھا جو آسانی سے مٹایا جا نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ ۸ھ میں جنگِ موتہ میں مسلمانوں کو اپنے کثیر تعداد دشمن سے بہت بڑی شکست کا سامنا ہوا۔ خالد بن ولید جو سیف اللہ کے لقب سے معروف ہیں، وہ ایک بہت اچھے سپہ سالار تھے۔ اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ بے مقصد مسلمانوں کا خون بہانے سے بہتر ہے کہ پسپائی اختیار کی جائے۔ تاہم جب فوج شہرِ مدینہ میں داخل ہوئی تو لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہوگیا جو ان پر مٹی پھینک کر چیخ رہے تھے کہ تم بھگوڑے ہو۔ تم نے اللہ کے راستے میں بھاگنے کی جرأت کیسے کی؟(۱۷) خود رسول اللہ ﷺ بھی اپنے جذبات کو نہ روک سکے۔(۱۸) سلمہ بن ہشام کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ گھر سے ایک قدم باہر نہیں نکال سکتے تھے۔ جب ان کی بیوی سے پوچھا گیا کہ ان کے خاوند دوسرے مومنین کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے کیوں نہیں آتے؟ تو اُنہوں نے جواب دیا کہ خدا کی قسم ان کا باہر نکلنا ناممکن ہے۔ کیونکہ جب بھی وہ گھر سے باہر نکلتے ہیں، لوگ شور مچاتے ہیں، بزدل تم اللہ کے راستے سے بھاگ آئے ہو، وہ اتنا شور مچاتے ہیں کہ وہ گھر میں قید ہو کر رہ گئے ہیں۔(۱۹) ہمیں قرآن کریم میں بھی اِسی کیفیت کا اظہار ملتا ہے۔ اگرچہ اس میں کسی قدر رعایت بھی موجود ہے، تاکہ مسلمان جنگی تدبیر کے مقاصد کے لیے پسپائی کا جواز قائم رکھ سکیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا
تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ
مُتَحَيِّزًا إِلَى فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ

الْمَصِيْر۔ (الانفال:۱۵-۱۶)

اے ایمان والو! جب تم کافروں سے دو بدو مقابل ہو تو پیٹھ نہ دکھانا۔ جس نے اس دن پیٹھ دکھائی سوائے اس لیے کہ لڑائی کے لیے پینترا بدلنا ہو یا جو اپنی جماعت کی طرف پناہ لینے آیا ہو، تو وہ اللہ کے غضب میں آئے گا، اس کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا، اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔

جو لوگ اللہ کے راستے میں آگے بڑھنے سے ہچکچاتے ہیں، وہ گویا اس رویّہ کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ سچے مسلمان نہیں ہیں۔

وَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَاهُمْ مِنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُوْنَ۔ (التوبہ:۵۶)

یہ لوگ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں، حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں، یہ بزدل لوگ ہیں۔

ذیل کی آیات میں بہت واضح طور پر اس کی تائید کی گئی ہے کہ سچا مومن وہ ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔ اپنے انسانی دشمن سے نہیں ڈرتا اور اپنی جان و مال کے ساتھ پوری طرح لڑنے کے لیے تیار ہے، جو شخص اللہ سے نہیں ڈرتا، وہ اللہ کے راستے میں لڑائی سے بھی ڈرتا ہے۔

لَا يَسْتَاذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ۔ اِنَّمَا يَسْتَاذِنُكَ الَّذِيْنَ لَايُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِىْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ۔ (التوبہ:۴۴-۴۵)

جو لوگ اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، وہ آپ سے اپنے جان و مال کے ساتھ جہاد سے رخصت نہیں مانگیں گے۔ رخصت وہی مانگتے ہیں جنہیں نہ اللہ پر ایمان ہے نہ یومِ آخرت پر، ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں، وہ خود شک میں

پڑے ہیں، اس لیے وہ تردد کر رہے ہیں۔

مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ اب ایک سچے مومن سے ایسی بہیمانہ شجاعت کا تقاضا نہیں کیا جاتا، جس کے بارے میں جاہلی شعراء اتنے فخر و غرور کا اظہار کرتے تھے، بلکہ ایک بالکل نئی قسم کی فوجی قوت کا مطالبہ کیا جاتا ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان کی بنیاد پر قائم ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں بہادری کی نہ کوئی نظریاتی بنیاد تھی اور نہ کوئی مقصد اور جہت۔ قرآنِ کریم نے اسے ایک متعین سمت مہیا کی اور جیسا کہ اسلامی سلطنت کے بعد کی تاریخ سے بہت واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کو اس بارے میں کامیابی بھی ہوئی کہ اللہ کے دشمنوں کے خلاف لڑائی میں مومنوں کے ہاتھ میں یہ نئی قسم کی شجاعت ایک بہت ہی کارگر ہتھیار بن گئی۔

وفاداری:

زمانۂ جاہلیت کی شاعری اور رسم و رواج کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ وفاداری اور بھروسہ کا بھی صحرا کی اعلیٰ اور مخصوص صفات میں شمار ہوتا تھا۔ قدرتی طور پر جاہلی وفاداری کا دارومدار زیادہ تر خونی رشتے پر تھا۔ اس پر عمل زیادہ تر قبیلے کے حوالے سے ہوتا تھا اور اس محدود میدان میں وفاداری غیر مشروط اور بالاتر قدر تھی۔ اپنے رشتہ داروں کے لیے اپنی ذات کو بغیر کسی غرض کے قربان کر دینا، اپنے دوستوں کے لیے بغیر کسی لالچ کے وفاداری کا اظہار کرنا اور اپنے وعدے کی پاسداری کے لیے زیادہ سے زیادہ قربانی دینا، سب اِسی کے مختلف اظہار تھے۔ بعض اوقات ایک معاہدے کے اثرات کا دائرہ قبیلے کی حدود سے باہر تک پہنچ جاتا تھا۔ یہ بات سموئل بن عادیا کے مشہور واقعہ سے ثابت ہوتی ہے۔ یہ واقعہ اتنا معروف ہے کہ یہاں اسے بالتفصیل دہرانے کی ضرورت نہیں۔ [۲۰] ایک موقع پر سموئل بن عادیا محصور ہو گیا تو محاصرہ کرنے والے ظالم سردار نے سموئل سے کہا کہ وہ امرؤ القیس کا زرہ بکتر اسے دے دے۔ سموئل اگرچہ امرؤ القیس کا رشتہ دار نہیں تھا، لیکن اس نے وعدہ توڑنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اس کا اپنا بیٹا اس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کر دیا گیا، لیکن وہ اپنے وعدے پر قائم رہا۔ سموئل کا نام عربوں کی زبان پر بدوی وفاداری

کی مجسم مثال کے طور پر آج تک زندہ ہے۔ زہیر نے جو اشعار اس وفاداری کے بارے میں کہے، وہ ضرب المثل بن چکے ہیں۔ (۲۱)

ومن یوف لا یذم ومن یهد قلبه
الی مطمئن البر لا یتجمجم

''جو شخص وعدہ پورا کرتا ہے، اُس کی مذمت نہیں کی جاتی اور جس کے دل کو نیکی کے اطمینان کی ہدایت ہو، وہ باتوں میں لڑکھڑاتا نہیں۔''

وفاداری کی یہ عزت و تکریم جاہلیت سے اسلام میں پہنچی تو اس میں اصل بدوی جوش و جذبہ پوری طرح موجود رہا۔ قرآنِ کریم اور حدیثِ نبوی ﷺ سے بہت واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ وفاداری کی صفت جو صحرائی عربوں سے مخصوص تھی، اسلام نے بھی ایک اعلیٰ اخلاقی ضابطے کے طور پر اپنائی، بلکہ اسے زیادہ شرف و تکریم کا رتبہ دیا۔ تاہم دوسری بدوی اقدار کی طرح اسلام نے اس صفت کو جوں کا توں نہیں اپنایا، بلکہ اس قدیم صفت کو ایک مخصوص طریقے سے مزید ترقی دی اور اسے بہت کامیابی کے ساتھ عقیدۂ توحید کے نظام میں سمو دیا۔ وفا کی اس بدوی صفت کو دو واضح لیکن باہم مربوط جہات سے اسلامی رنگ دیا گیا۔ ایک تو خود مومنین کے باہمی لین دین کے حوالے سے عام سماجی معاملات میں اور دوسرے اللہ اور بندے کے درمیان عمودی تعلق کے حوالے سے مذہبی میدان میں۔

پہلا نکتہ کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ تفصیلات میں جانا اس لیے ضروری نہیں کہ خصوصاً عصبیت کے حوالے سے اسلام۔ نے جو تبدیلیاں متعارف کرائیں اور جن کا ذکر ہو چکا ہے، ان کا تکرار ہوگا۔ وفا کی صفت جو خونی رشتے کے اس مخصوص شعور سے پیدا ہوئی تھی، جسے قربانی کی مقدس رسم نے جنم دیا تھا، دراصل قبائلی یا بین القبائلی معاملہ تھا۔ بنیادی طور پر یہ ایک ہی قبیلے کے افراد کے درمیان ایک دوسرے کے ساتھ جگری بندھن کا اظہار تھا۔ دوسرے یہ مختلف قبیلوں یا ان کی شاخوں کے درمیان مقدس عہد کا رشتہ تھا۔ جب دو قبیلے کسی بات پر باہم متفق ہو جائیں، مثلاً دوستی، شادی یا تجارت، تو وہ دونوں مل کر کسی دیوی دیوتا کو مشترکہ قربانی پیش کرتے تھے اور اس طرح ایک مقدس معاہدہ میں بندھ جاتے تھے۔ اسلام نے قبائلی طرزِ زندگی کی ایسی تمام قیود اور شرائط کو ختم کر کے اس صفت کو

وفاداری کی وسیع انسانی بنیادوں پر قائم کیا۔ اس کو قبائل کی سطح سے بلند کر کے صحیح معنوں میں انسانی قدر میں تبدیل کر دیا۔ چنانچہ وفا ایک ایسی اخلاقی قوت بن گئی جو کہ ایک انفرادیت پسند معاشرے میں بھی قابلِ عمل تھی۔

دوسرا نکتہ اس معاملے میں زیادہ اہم ہے، یعنی وفا کو مذہبی سطح پر اسلامی رنگ دینا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بدوی مذہب کے تمام ان گھڑ تصورات سے بالاتر ہو کر میثاق کے مخصوص سامی تصور کو اختیار کرتے ہوئے اسے اللہ اور بندے کے درمیان باقاعدہ مذہبی بندھن کا رسمی اظہار قرار دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں کہ مذہب کا یہ تصور توراتِ قدیم سے مخصوص ہے۔ بنی اسرائیل کے مذہبی شعور کے حرکت و عمل کا سب سے بنیادی اور عمومی ڈھانچہ یہوہ اور تمام بنی اسرائیل کے درمیان میثاق کا تصور تھا۔ ''میں تمہارا خدا ہوں اور تم میرے بندے ہو۔'' یہوہ نے یہ میثاق خود بنی اسرائیل پر اس وقت لاگو کیا جب اس نے اپنی رحمت سے کام لیتے ہوئے ان لوگوں کو مصر سے باہر نکالا۔ قرآنِ کریم میں بھی یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے۔

وَإِذْ نَجَّيْنٰكُم مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَآءَكُمْ وَفِى ذٰلِكُم بَلَآءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنجَيْنٰكُمْ وَأَغْرَقْنَآ آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ۔ (البقرۃ:۴۹-۵۰)

اور جب تمہیں آلِ فرعون سے نجات دی جو تمہارے پیچھے لگے رہتے تھے، سخت ترین سزاؤں کے ساتھ۔ تمہارے بیٹوں کے گلے کاٹتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی جانب سے بڑا بھاری امتحان تھا اور جب تمہارے لیے سمندر کو شق کر دیا گیا اور تمہیں بچا لیا اور آلِ فرعون کو غرق کر دیا اور تم دیکھ رہے تھے۔

ہر معاہدہ، معاہدہ ہونے کے لحاظ سے فریقین کو کچھ باتوں کا پابند کرتا ہے۔ یہوہ نے جب اپنے لوگوں پر اپنا میثاق نافذ کیا تو اس عمل سے اپنے آپ کو بھی معاہدے کی

شرائط پوری کرنے کا پابند بنایا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ بنی اسرائیل کا خدا رہے گا، ان سے محبت کرے گا، ان کو نجات دے گا، ان کو صحیح راستہ دِکھائے گا۔ یہ ساری باتیں اس جملے میں موجود ہیں کہ وہ ان لوگوں کا خدا رہے گا۔ یاد رہے کہ

لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

(الروم:٦)

اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا، لیکن اکثر لوگ یہ نہیں جانتے۔

اس طرح یہوہ اور بنی اسرائیل دونوں نے اپنے آپ کو حقوق و فرائض کے باہمی روابط میں پابند کرلیا۔ یہ انتہائی اہم بات ہے کہ یہوہ اور بنی اسرائیل کے درمیان اس بنیادی رشتے کا قرآنِ کریم میں بار بار ذکر کیا گیا ہے۔

يٰبَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ أُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُوْنَ۔ (البقرۃ: ٤٠)

اے بنی اسرائیل! میری ان نعمتوں کو یاد کرو، جو میں نے تم پر کیں۔ تم میرے عہد کو پورا کرو، میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا اور صرف مجھ سے ڈرتے رہو۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ قرآنِ کریم نے یہوہ اور بنی اسرائیل کے درمیان اس مخصوص رشتے کو اسلام کا مرکزی تصور بنایا اور اللہ اور مسلمانوں کے درمیان تعلق کے لیے اسے بنیادی شکل عطا فرمائی۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ، يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيْهِمْ فَمَنْ نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ وَمَنْ أَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ أَجْرًا عَظِيْمًا۔ (الفتح: ١٠)

جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں، تو وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے۔ جو شخص بدعہدی کرے گا تو یہ بدعہدی اُسی پر ہوگی اور جس نے اللہ سے کیا وعدہ پورا کیا تو اللہ تعالیٰ عنقریب اسے بہت بڑا اجر دے گا۔

مذہب کا یہ تصور کہ وہ فریقین کے مابین ایک معاہدہ پر مشتمل ہے، صرف قدیم تورات ہی میں نہیں ہے، بلکہ قرآنِ کریم میں بھی مخصوص تصور کے طور پر سامنے آتا ہے۔ چنانچہ اسلام کی تمام اخلاقی اقدار براہِ راست یا کم از کم بالواسطہ میثاق کے اسی تصور سے تعلق رکھتی ہیں۔ صدق کی صفت ان صفات میں غالباً اوّلین صفت ہے جو اس بنیادی تصور سے بہت گہرا تعلق رکھتی ہے۔

صدق:

ص د ق کا مادہ قرآنِ کریم میں کئی شکلوں میں آیا ہے۔ فعل کی صورت میں صَدَقَ، اسم کی صورت میں صِدق، اسم فاعل کی صورت میں صادق اور اسم تفضیل کی صورت میں صدّیق وغیرہ۔ ہم اس کی وضاحت قدیم عرب ماہرینِ لغت کی اس متفقہ رائے سے شروع کر سکتے ہیں کہ صدق، کذب کا براہِ راست متضاد ہے۔ ابنِ فارس بن زکریا جنہوں نے سب سے پہلی حروفِ تہجی کی لغت مرتب کی، وہ اس لفظ کے بنیادی معنی زبان یا دوسری اشیاء کی قوت اور سختی بیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ اصلی معنی اس مادے سے حاصل شدہ اسمِ صفت، صدق میں ابھی تک پائے جاتے ہیں، جس کا معنی ہے سخت اور جاندار، صدق زبان کی سچائی کو بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہی اس کی طاقت ہے۔ اس کے مقابلے میں جھوٹ کمزوری ہے۔ (۲۲)

چنانچہ صدق کا عمومی معنی سچ بولنا، صحیح خبر دینا ہے، جس کا مطلب ہے، حقیقت سے مطابقت رکھنا۔ لفظ کا یہ مفہوم بہت عام قسم کے جملوں میں صراحت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ مثلاً خبر کی بہت غور سے چھان بین کی، پتہ چلا کہ خبر بتانے والے نے سچ بولا (صدق)۔

اس قسم کے جملوں میں بلاشک وشبہ صدق کا معنی زبان کا حقیقت کے مطابق ہونا ہے، لیکن صرف یہی مفہوم اس کے مکمل معنی ظاہر نہیں کرتا۔

زبان کی سچائی کو یعنی اس عمل کو جس سے کوئی بات سچ ہو جائے، دو طرح سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اندرونی سچائی کے طور پر اور معروضی حقیقت کے طور پر۔ معروضی سچائی وہ

حقائق ہیں، جن سے لفظ مطابقت رکھتے ہوں۔ عربی زبان میں اس معروضی حقیقت کو لفظ حق سے بیان کیا جاتا ہے، جس کے عام معنی بھی سچائی کے ہیں۔ اس طرح لفظ حق سچائی کی معروضی حالت کو ظاہر کرتا ہے، صدق اس کا مخالف قطب ہے۔ یہ خاص طور پر متکلم کی صفت کو بیان کرتا ہے کہ اس کے الفاظ حقیقت کے مطابق ہیں یا نہیں، دوسرے الفاظ میں یہ الفاظ بولنے والا سچا ہے یا نہیں۔ یہ نکتہ ابنِ اسحاق کی مندرجہ ذیل عبارت سے بہت اچھی طرح واضح ہوتا ہے۔

واخذ علیهم ان یودوا ذلك الی كل من امن بهم
وصدقهم فادوا من ذلك ما كان علیهم من الحق فیه۔(۲۳)

"(اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے) وعدہ لیا کہ جو کوئی ان پر ایمان لائے گا اور اُن کی تصدیق (صدق) کرے گا، یہ امانت اسے پہنچائیں گے۔ چنانچہ ان پر جو سچائی (حق) واجب تھی، اُنہوں نے پہنچائی۔"

اسی طرح طرفہ کا مندرجہ ذیل شعر بھی دلچسپ ہے:

والصدق یالفه اللبیب المرتجی
والكذب یالفه الدنی الاخیب(۲۴)

"سچائی ایسے شخص کی مستقل صفت ہے جو مستقل مزاج اور قابلِ بھروسہ ہو اور جھوٹ ایسے شخص کی صفت ہے، جو بدسرشت اور دھوکے باز ہو۔"

اس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بعض عرب ماہرینِ لغات صدق کی معنویاتی ساخت کے بارے میں بعض دُور کی کوڑیاں لائے ہیں۔ مثلاً کسی عبارت کے سچا ہونے کے لیے یہ کافی نہیں کہ لفظ حقیقت کے مطابق ہوں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ اس حقیقت کے مطابق بھی ہوں، جو متکلم کے ذہن میں ہیں۔ صدق کی معنویاتی ساخت میں فیصلہ کن عنصر یہ ہے کہ بولنے والے کے ذہن میں اس بات کے سچا ہونے کا ارادہ اور عزم بھی موجود ہو، لیکن "حقیقت کے مطابق سچا ہونے کی نیت" کی عبارت کو عملی طور پر مختلف انداز سے سمجھا جاتا ہے اور اس میں جو مفہوم شامل ہوں، ان کا دائرہ وسیع بھی ہو سکتا ہے اور

تنگ بھی، کیونکہ لفظ ''حقیقت'' کا اطلاق مختلف اشیاء پر ہوتا ہے۔ اس سے مراد ایک ٹھوس حقیقت بھی ہوسکتی ہے۔ معروف رواج بھی، ادب کا ضابطہ بھی، صلح کا معاہدہ بھی، اور وہ لفظ بھی جو بولے گئے ہیں۔ ان تمام مثالوں میں صدق میں ظاہر طور پر اخلاص، استقلال، امانت اور دیانت کے مفہوم بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں ہمیں صدق کے عملی استعمال کی ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، جو عربی ادب میں دوسری جگہ بھی پائی جاتی ہیں، جس سے صدق کا مفہوم صرف سچ بولنا کافی معلوم نہیں دیتا۔

صرف ہمارے موجودہ باب کے مخصوص موضوع کے لحاظ سے ہی نہیں، بلکہ عام مفہوم میں بھی سب سے اہم مثال وہ ہے جہاں قرآنِ کریم نے صادق بمقابلہ کافر اور منافق کا استعمال کیا ہے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا لِيَسْأَلَ الصَّادِقِينَ عَنْ صِدْقِهِمْ وَأَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا أَلِيمًا۔

(الاحزاب:۷-۸)

اور جب ہم نے پیغمبروں سے عہد لیا اور تم سے اور نوح سے اور ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور مریم کے بیٹے عیسیٰ سے اور عہد بھی ان سے پکا لیا تھا، تاکہ سچ کہنے والوں سے ان کی سچائی کے بارے میں دریافت کرے اور اس نے کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے روز لوگ دو گروہوں میں تقسیم کر دیے جائیں گے۔ ایک گروہ صادق لوگوں کا، دوسرا کافروں کا۔ صادق وہ ہیں، جو اپنی پوری زندگی بڑے استقلال کے ساتھ معاہدے سے پیدا ہونے والے فرائض کو پورا کرتے رہے۔ جبکہ کافر وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بارے میں ہمیشہ ناشکری کا اظہار کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس معاہدے سے بے وفائی کے مرتکب ہوئے اور سچے نہیں رہے۔ یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ صدق کا لفظ اللہ اور بندوں کے درمیان معاہدے کے

مخصوص حوالے کے ساتھ مذکور ہوا ہے۔ چنانچہ سیاق وسباق کا تقاضا ہے کہ صادق کا معنی وفادار اور صدق کا معنی وفاداری کیا جائے۔ اگلی آیت میں جہاں صادق منافق کے بالمقابل استعمال ہوا ہے، فعل صدق کا معنی یوں ہوگا: ان لوگوں نے معاہدوں کو پورا کیا یا وفادار رہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ إِنْ شَاءَ أَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَحِيْمًا۔ (الاحزاب: ۲۳-۲٤)

مومنوں میں کتنے شخص ایسے ہیں کہ اللہ سے جو اقرار اُنہوں نے کیا تھا، اس کو سچ کر دکھایا تو اُن میں سے بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے اور بعض ایسے ہیں جو انتظار کر رہے ہیں اور اُنہوں نے اپنے قول کو ذرا بھی نہیں بدلا تاکہ خدا سچوں کو ان کی سچائی کا بدلا دے اور منافقوں کو چاہے تو عذاب دے، چاہے اُن پر مہربانی کرے، بے شک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

قرآنِ کریم میں صدق کا لفظ جب عدل کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، مثلاً سورۃ الانعام آیت نمبر ۱۱۵ میں تو وہاں بھی اس کا یہی مفہوم سامنے آتا ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا، لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ۔ (الانعام: ۱۱۵)

تمہارے پروردگار کی باتیں سچائی اور انصاف میں پوری ہیں۔ اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔

یہ تعبیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے، اگر ہم آیت کے آخری حصے کو جس میں اللہ کے الفاظ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ مطلقاً کبھی بھی تبدیل نہیں ہوتے، یہ سمجھیں کہ یہ ایک طرح سے صدق کے مفہوم کی ترجمانی کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ صدق کا لفظ کلماتِ الٰہی کے حوالے سے آیا ہے۔ اس کا سادہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو اس معاہدے کا ایک شریک فریق ہے، اس نے اپنے وعدے کی پابندی کی ہے۔ اس کا دوسرے الفاظ میں یوں مطلب بیان کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب ایک بات کہہ دیں تو پھر اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی یعنی اللہ کے الفاظ ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد ہیں۔

بہرکیف اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صدق کا یہ معنی کہ کوئی شخص اپنے قول پر پورا اُترتا ہے، وفا کے اس مفہوم کے بہت قریب ہے، جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ چنانچہ صدق انسان کی ایسی صفت کو بیان کرتا ہے، جس سے اس کا وفادار ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ یہ دونوں الفاظ اکثر ہمیں ساتھ ساتھ مترادف مفہوم میں ملتے ہیں۔ مثلاً

وانی عاهدت محمدا فلست بناقض ما بينه ولم
ارمنه الا وفاء مصدقا۔ (۲۵)

''میرا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے معاہدہ ہے، میرے اور ان کے
درمیان جو طے ہوا ہے، میں اسے نہیں توڑوں گا، کیونکہ میں نے وفا
اور صدق کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا۔''

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ہم عصر شاعر نے اپنے اشعار میں جو جنگِ احد کے بعد لکھے گئے، یہ الفاظ اس طرح استعمال کیے:

وعدنا ابا سفيان بدراً فلم نجد
لميعاده صدقاً وما كان وافيا (۲۶)

''ہم نے ابوسفیان سے بدر کے موقع پر وعدہ لیا تھا، لیکن ہم نے اسے وعدہ کا سچا نہیں پایا، نہ ہی وہ وفادار نکلا۔''

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ حضرت ابوبکرؓ نے صدق کے بارے میں ایسی ہی بات کہی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد ان کو خلیفہ منتخب کر لیا گیا تو اُنہوں نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''صدق کا خلاصہ امانت ہے اور کذب کا خلاصہ خیانت''۔ امانت بھی ایک ایسا لفظ ہے جو انسان کی ان

خصوصیات کو جن کا تعلق اعتماد اور دیانت سے ہے، بیان کرتا ہے اور خیانت اس کے مقابل بدعہدی، بے وفائی اور بے پرواہی کو ظاہر کرتا ہے۔ اب ہم آسانی سے دیکھ سکتے ہیں کہ صدق کس طرح قدیم عرب کے لغوی شعور میں وفاداری اور بھروسے کے تصور کے ساتھ وابستہ تھا اور یہ کہ قدیم بدوی اور اسلامی اخلاقی صفات میں اس کو اعلیٰ مقام کیوں حاصل رہا۔

اب ہم اِسی مادے کے ایک اور مشتق لفظ صدیق کی طرف آتے ہیں۔ اس متنازعہ فیہ لفظ کا متعین معنی بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ ایک بات ضرور ثابت ہے کہ یہ صادق کا اسم مبالغہ ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ صدق کے اعلیٰ ترین ممکنہ درجے کو بیان کرتا ہے، تاہم یہ پھر بھی مبہم ہے کیونکہ صدق جیسا کہ ہم جانتے ہیں، دو قابلِ امتیاز پہلوؤں کا نام ہے۔ عرب ماہرینِ لغت کی عام رائے کے مطابق اس کا تعلق سچ بولنے سے ہے۔ چنانچہ صدیق کا مطلب ایسا شخص ہے، جو ہمیشہ سچ بولتا ہے اور کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

صدیق کا لفظ خلیفہ ابوبکرؓ کے لقب کے طور پر بہت معروف ہے اور اس کا یہی مفہوم سمجھا جاتا ہے جو ہم نے ابھی بیان کیا۔ لیکن اگر اس واقعہ کا بغور مطالعہ کیا جائے، جس روایت کے مطابق حضرت ابوبکرؓ کو یہ لقب ملا تو ہم کسی قدر مختلف تعبیر پر پہنچتے ہیں۔ روایت یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے آسمانوں کی طرف معراج اور رات کو یروشلم کی جانب سفر کے اپنے تجربے کو تفصیل کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو بتایا تو جو مسلمان اس بات کو سن رہے تھے، اُن کے ذہنوں میں اس حقیقت کے بارے میں شبہات پیدا ہوئے، ایک شخص جس کے ایمان نے اس تفصیل کے بارے میں کسی شک کو موقع نہیں دیا، وہ روایت کے مطابق ابوبکرؓ تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ یہ تفصیلات بیان کر رہے تھے کہ انہوں نے یروشلم میں کیا دیکھا تو صرف ابوبکرؓ یہ کہتے رہے کہ یہ سچ ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ اس واقعہ کی تفصیل بتانے کے بعد حضرت محمد ﷺ نے کہا، ابوبکرؓ تم واقعی صدیق ہو۔

اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس کا مطلب ہے کہ صدیق صرف اس شخص کو نہیں کہا جاتا جو سچ بولتا ہو، بلکہ اسے کہا جاتا ہے جو کسی چیز کی سچائی کی شہادت دے۔ اس روایت کا سچا ہونا یا نہ ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس سے ہمارے زیرِ بحث موضوع کے لیے ایک

کلیدی بات معلوم ہوئی، جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں عربوں کے ذہن میں صدیق کا مفہوم کیا تھا۔ آیئے اب دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں یہ مفہوم کیسے مذکور ہوا۔

قرآنِ کریم میں یہ لقب حضرت مریم، حضرت ابراہیمؑ، حضرت یوسفؑ اور عمومی معنی میں تمام مومنین کے لیے استعمال ہوا ہے:

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَاْكُلَانِ الطَّعَامَ۔ (المائدہ:۷۵)

مسیح ابنِ مریم صرف ایک پیغمبر ہیں، ان سے پہلے اور بھی پیغمبر گزرے ہیں اور اُن کی ماں سچ بولنے والی ہستی تھیں۔

اس آیت کا سیاق یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور اُن کی والدہ حضرت مریم کے بارے میں تقدیس کے اس عقیدے کی نفی کی جائے جو توحیدِ مطلق کے تصور سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا ہے اور یہ واضح کیا جائے کہ یہ دونوں شخصیات سیدھے سادے فانی انسان تھے، جو دوسروں کی طرح کھاتے پیتے تھے۔ صرف ایک چیز جس میں وہ عام لوگوں سے مختلف تھے، وہ یہ تھی کہ حضرت عیسیٰؑ اللہ کے رسول تھے اور حضرت مریم انتہائی ممتاز نیک خاتون تھیں۔ صدیقہ کے لفظ کا صحیح معنی کیا سمجھا جائے۔ وہ اس سیاق سے واضح نہیں ہوتا۔ ہم اسے سچ بولنا، امانت اور دیانت اور قابلِ بھروسہ ہونا کسی بھی مفہوم میں لے سکتے ہیں۔

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ لَّعَلِّيْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔ (یوسف:۴۶)

یوسف، اے صدیق! آپ ہمیں اس بارے میں بتایئے کہ سات دبلی گائیں، سات موٹی گایوں کو کھا گئیں اور سات بالیں ہری ہیں اور سات خشک۔ تاکہ میں لوگوں کے پاس لوٹ کر جاؤں تو اُن کو بھی معلوم ہو جائے۔

عام طور پر اس آیت میں صدیق کا مفہوم سچ بولنے والا لیا جاتا ہے۔ کیا اس لفظ کا معنی بولنے والے کے پچھلے تجربے کے حوالے سے لیا جائے یعنی خوابوں کی تعبیر کے

حوالے سے جو حضرت یوسف نے اسے بتلائی تھی اور جو سچ نکلا تھا۔ اس مفہوم میں صدیق کا مطلب ہوگا ایسا شخص جس نے سچ بولا تھا یا اس سے مراد زیادہ عام مفہوم میں خود سچائی کی صفت کو لیا جائے یا پھر اس سے قابلِ اعتماد اور وفادار شخص کا مفہوم سمجھا جائے۔ بہرکیف اس لفظ کے صحیح معنی کے بارے میں بڑی حد تک غیر یقینی کیفیت پائی جاتی ہے۔

مندرجہ ذیل آیت جس میں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر ہے، معنویاتی لحاظ سے خاص طور پر اہم ہے کیونکہ ایک طرح سے یہ پوری آیت اس بات کی تفصیل سے وضاحت کرتی ہے کہ آپ کو صدیق کیوں کہا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ لفظ صدیق کی تعریف نہیں ہے، لیکن اس میں ایسی نشانیاں ضرور پائی جاتی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ کس قسم کے اخلاقی اور عملی رویے سے اس لقب کا استحقاق اُنہیں حاصل ہوا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرَاهِيمَ، اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا، اِذْقَالَ لِاَبِيهِ يٰاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَالَا يَسْمَعُ وَلَايُبْصِرُ وَلَايُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا يٰاَبَتِ اِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَالَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي اَهْدِكَ صِرَاطاً سَوِيًّا۔ يٰاَبَتِ لَاتَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ، اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا۔ يٰاَبَتِ اِنِّي اَخَافُ اَنْ يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا۔ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ آلِهَتِي يٰاِبْرَاهِيمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا۔ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُلَكَ رَبِّي اِنَّهٗ كَانَ بِي حَفِيًّا۔ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَاَدْعُوا رَبِّي عَسٰى اَلَّا اَكُونَ بِدُعَاءِ رَبِّي شَقِيًّا، فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا۔ (مریم: ۴۱ - ۵۰)

اور اس کتاب میں ابراہیم کا ذکر کیجیے۔ وہ بڑے صدیق نبی تھے۔ جب اُنہوں نے اپنے باپ سے کہا، اے میرے باپ! تم ایسی چیزوں کی کیوں عبادت کرتے ہو، جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں

اور نہ تمہیں کسی چیز سے بچا سکتی ہیں۔ اے میرے باپ! میرے پاس ایسا علم ہے جو تمہارے پاس نہیں۔ تو میرے کہنے پر چلو، میں تمہیں سیدھا رستہ بتلاؤں گا۔ اے میرے باپ! تم شیطان کی پرستش مت کرو۔ بے شک شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے۔ اے میرے باپ! مجھے ڈر ہے کہ تم پر رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب نہ آ جائے، پھر تم شیطان کے ساتھی بن جاؤ۔ باپ نے جواب دیا، کیا تم میرے معبودوں سے پھرے ہوئے ہو۔ اے ابراہیم! اگر تم باز نہ آئے تو میں پتھر مار کے سزا دوں گا۔ تم مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے جاؤ۔ اُنہوں نے کہا، تم پر سلام ہو، میں اپنے رب سے تمہارے لیے مغفرت کی درخواست کروں گا۔ بے شک وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔ میں تم لوگوں سے اور جن کی تم عبادت کرتے ہو، کنارہ کش ہوتا ہوں۔ میں اپنے رب کی عبادت کروں گا۔ اُمید ہے میں اپنے رب کی عبادت کر کے محروم نہ رہوں گا۔ پس جب وہ اُن لوگوں سے اور جن کی وہ عبادت کرتے تھے، کنارہ کش ہوا تو ہم نے انہیں اسحاق اور یعقوب عطا فرمائے اور دونوں میں سے ہر ایک کو نبی بنایا۔ ہم نے اُن کو اپنی رحمت سے عطا کیا اور ہم نے ان کو صدق کی زبان اور بلند نام دیا۔

اِن آیات میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کو عقیدۂ توحید کے اولوالعزم نمائندے کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے، جو شرک کی قوتوں میں گھرے ہوئے تھے، وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے ایک نڈر اور پُر جوش انسان ہیں جو اپنے مذہب پر آخری دم تک قائم رہتے ہیں، حتیٰ کہ ان کے اپنے والد بھی ان پر دباؤ ڈالتے ہیں اور جلاوطن کر دیتے ہیں، تب بھی ان کے قدم نہیں ڈگمگاتے۔ یہ ہے وہ شخص جو ہر لحاظ سے صدیق کہلانے کا اہل ہے۔ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس آیت سے ہمیں لفظ صدیق کے بنیادی معنویاتی عناصر کا مزید پتہ چلتا ہے۔ اگلی مثال میں بظاہر یہ لفظ اِسی معنی میں عمومی طور پر تمام مومنوں

کے لیے آیا ہے۔ لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہاں صدیق کا لفظ کافر کے متضاد کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

وَالَّذِيْنَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ أُولٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ وَالشُّهَدَاءُ عِنْدَ رَبِّهِم، لَهُمْ أَجْرُهُمْ وَنُورُهُم وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا أُولٰئِكَ أَصْحٰبُ الْجَحِيمِ۔ (الحدید:۱۹)

جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے تو ایسے ہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔ ان کے لیے ان کا اجر اور ان کا نور ہے۔ جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا، وہ دوزخی لوگ ہیں۔

ان آخری دو آیات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم قرآنی سیاق میں لفظ صدیق ایک ایسے مومن کے لیے بولا جاتا ہے جو اپنے ایمان پر پُر جوش طریقے سے قائم رہتا ہے اور کچھ بھی ہو جائے وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے عقیدے سے وفاداری متزلزل نہیں ہونے دیتا۔ یہاں صدیق کا معنی محض سچ بولنے والے سے زیادہ ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے قول کا اوپر ذکر ہوا، اس میں بھی ہم نے دیکھا کہ صدق کذب کے بالمقابل ہے اور اس طرح خیانت کا متضاد ہے۔ چنانچہ اگر صدق ایک غیر متزلزل طریقے سے وعدے، قسم اور معاہدے کی پابندی کا نام ہے تو یہ ایک ایسی اخلاقی صفت پر مشتمل ہے جو فطری طور پر خیانت کو سب سے زیادہ معیوب صفت بنا دیتا ہے۔ زمانۂ جاہلیت کی طرح اسلام میں بھی بدعہدی کا فعل بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اور جس شخص میں یہ صفت پائی جاتی تھی، اس سے کالے ناگ کی طرح نفرت کی جاتی تھی۔

وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ إِنَّ اللّٰهَ لَايُحِبُّ الْخَائِنِينَ۔ (الانفال:۵۸)

اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہے تو آپ وہ عہد ان کو اس طرح واپس کر دیجیے کہ برابر ہو جائیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

مندرجہ ذیل آیت میں جس میں حضرت یوسفؑ کی امانت و دیانت کا اقرار عزیزِ مصر کی بیوی کی زبان سے ادا ہوا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خائن صادق کے عین متضاد معنوں میں استعمال ہوا ہے، جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اس سیاق و سباق میں صادق سے مراد ایسا شخص ہے جو آقا اور بندے کے درمیان معاہدے کا وفادار رہتا ہے۔

قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدتُّهُ عَن نَّفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ۔ ذَٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ۔ (یوسف: ۵۱-۵۲)

عزیز کی بیوی کہنے لگی کہ اب تو حق ظاہر ہو گیا۔ میں نے ہی اس سے اپنے مطلب کی خواہش کی تھی اور وہ تو یقیناً سچا ہے۔ یہ اس لیے کہ عزیز کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں خیانت نہیں کی تھی اور اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا۔

اگر عام سماجی زندگی میں خیانت ایک گناہِ کبیرہ ہے یعنی وہ سماجی اخلاقیات جن سے اسلامی معاشرت میں افراد ایک دوسرے کے ساتھ سلوک میں اس کے ضوابط کے پابند ہیں تو فطری طور پر اس کا اطلاق انسان کے اس مذہبی اخلاقی رویے پر زیادہ صادق آتا ہے جو اللہ کے ساتھ ہے۔ دوسرے الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے خیانت انسان کے ساتھ خیانت سے زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے یہ یاد رکھنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خیانت کی سب سے مخصوص شکل نفاق ہے یعنی ایمان میں غیر سنجیدگی کے ساتھ دوغلے پن کا اظہار۔ کفر جس کے متعلق ہم اوپر بحث کر چکے ہیں، کم از کم اپنی مخصوص شکل میں خیانت یا بے وفائی کی بجائے اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاہدے کا سرے سے انکار ہے، یا اللہ تعالیٰ پر ایمان سے کھلم کھلا انکار ہے۔ اس کے برعکس نفاق اسلام کے ہوتے ہوئے تقویٰ کے بھیس میں بدعہدی کا فعل ہے۔

درحقیقت نفاق کے تصور پر ہم پہلے گفتگو کر چکے ہیں، مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ منافق وہ شخص ہے، جو بظاہر نیک مسلمان نظر آتا ہے، لیکن اپنے دل میں وہ کافر رہتا ہے جو

خفیہ طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ سے پکی دشمنی رکھتا ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی مناسب ہوگا کہ ہم نے اوپر جو سورہ الاحزاب کی آیات (۲۳ تا ۲۴) نقل کی تھیں، ان میں منافق صادق کے متضاد کے طور پر استعمال ہوا تھا۔ تاہم چونکہ اس کتاب کے موضوع کے لحاظ سے نفاق کا موضوع بے حد اہم ہے، اس کے مزید تجزیے کی ضرورت ہے۔ ہم اس پر آگے چل کر مناسب موقع پر گفتگو کریں گے۔ فی الحال اس فصل کو ختم کرتے ہوئے چند آیات نقل کرتے ہیں، جن سے مذہب اور ایمان کے تعلق سے خیانت کے معنوں پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا۔ (النساء: ۱۰۶ – ۱۰۷)

آپ ان بد دیانت لوگوں کی طرف داری نہ کریں۔ اللہ سے استغفار کریں، بے شک اللہ بڑا مغفرت کرنے والا اور بڑی رحمت والا ہے۔ آپ ان لوگوں کی طرف سے جواب دہی نہ کریں جو اپنے ساتھ بد دیانتی کرتے ہیں، بے شک اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو غدار اور بہت بڑا گنہگار ہے۔

یہ عبارت کہ ''جو اپنے ساتھ بد دیانتی کرتے ہیں'' یہ بیان کرتی ہے کہ جو لوگ اللہ کے ساتھ خیانت کرتے ہیں، وہ خود اپنے ساتھ بھی خیانت کرتے ہیں، کیونکہ بالآخر خیانت کا وبال اپنے ہی سر آ پڑتا ہے۔ جہاں تک لفظ خوّان کا تعلق ہے، جس کا ترجمہ عارضی طور پر غدار کیا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ خائن کا اسمِ مبالغہ ہے، جس سے مراد ایسا شخص ہے جو بد عہدی میں انتہا درجہ تک پہنچا ہوا ہے اور جو البیضاوی کے الفاظ میں بدعہدی اور خیانت کے کام کرنے کا عادی ہو چکا ہے۔ مزید برآں یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہاں اس لفظ کو ایک اور لفظ اثیم یعنی گناہ گار کے اضافے کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ۔ (الحج: ۳۸)

اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کا دفاع کرتا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ
کسی غدار اور کفر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

یہاں پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدعہدی کرنے والے کو اسی شدید لفظ یعنی ''خوّان'' سے یاد کیا گیا ہے، لیکن اس مرتبہ اس کے لفظ اثیم (۲۷) کے بجائے اس سے زیادہ شدید لفظ کفور استعمال ہوا ہے، جو ک ف ر کے مادے کا اسمِ مبالغہ ہے اور جس سے مراد انتہائی اور عادی ناشکرا ہے۔

قرآنِ کریم میں غدار کے لیے ایک اور لفظ بھی آتا ہے، جو خوّان سے کسی طرح شدت میں کم نہیں۔ یہ ہے ختار، جو کہ ختر کا اسمِ تفضیل ہے۔ اس سے مراد ایسا شخص ہے جو بدعہدی اور بے وفائی میں بہت آگے ہو۔ (۲۸) یہ بھی کم اہم بات نہیں کہ قرآنِ کریم میں یہ لفظ کفور کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ سورۃ نمبر ۳۱، آیت نمبر ۳۲ میں چند ناشکرے لوگوں کا ذکر ہے، جن کو سمندر کا طوفان گھیرے تو وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور اس وقت اپنی دُعا میں انتہائی خلوص کا مظاہرہ کرتے ہیں، لیکن جونہی حفاظت کے ساتھ ساحل پر اُتر آئیں تو یہ سارا ماجرا بھول جاتے ہیں اور پھر خدا کی دشمنی میں لگ جاتے ہیں۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللَّهِ لِيُرِيَكُم مِّنْ آيَاتِهِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ وَإِذَا غَشِيَهُم مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ۔ (لقمٰن: ۳۱-۳۲)

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ کشتیاں اللہ ہی کے فضل سے سمندر میں چلتی ہیں، تاکہ وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھائے۔ بے شک ہر ایسے شخص کے لیے جو صبر کرنے والا اور شکر کرنے والا ہے، اس میں نشانیاں ہیں۔ اور جب ان لوگوں کو موجیں سائبانوں کی طرح گھیر لیتی ہیں تو وہ خالص اعتقاد کے ساتھ اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں، پھر جب ان کو اللہ نجات دے کر خشکی پر لے آتا ہے تو اُن میں سے چند

ہی اعتدال پر آ جاتے ہیں۔ ہماری آیات کا انکار تو بدعہد اور
ناشکرے کرتے ہیں۔

آیت کی صوری ساخت میں متوازی تراکیب کے موازنے سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ختار اور خوان اگرچہ اپنے مادوں میں قطعاً مختلف ہیں، تاہم معنی، ساخت اور جذباتی شدت میں ہر لحاظ سے ممکن ترین مترادف ہیں۔

ہم یہاں یہ ذکر کرنا چاہیں گے کہ اس آیت میں لفظ ختار کی تفسیر میں البیضاوی نہایت دلچسپ بات کہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس سے مراد غدار ہے، یعنی سب سے نقصان دہ غداری کرنے والا اور یہ کہ جو اشخاص یہ افعال کرتے ہیں، ان کو غدار اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کی آیات سے انکار کرتے ہیں جو بالآخر فطری میثاق کے مذہب سے بے وفائی اور بدعہدی کا نام ہے۔ یقیناً یہ ہمارے استدلال کی تائید میں بے حد وقیع شہادت ہے۔ یعنی صدق اور خیانت اپنے بنیادی معنوں میں اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان معاہدے سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کی وفاداری کے لحاظ سے ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ جہاں رسمی معاہدے کا صریح ذکر بھی نہیں ہے۔ وہاں بھی یہ تصور بذاتِ خود موجود ہے اور اس کی وجہ سے یہ الفاظ ایک مخصوص اخلاقی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔

حق:

جیسا کہ ذکر ہوا، صدق کی معنوی صنف میں ہمیں دو مختلف لیکن باہم مربوط پہلو نظر آتے ہیں، ایک سچ بولنا دوسرے وفاداری۔ گذشتہ بحث میں ہم نے زیادہ تر وفاداری یا ایفائے عہد کے بارے میں گفتگو کی تھی۔ اب ہم دوسرے پہلو کے بارے میں گفتگو کریں گے کہ آیا صحرا کی اس قدیم اخلاقی قدر کے بارے میں اسلام میں کوئی خاص تعلیمات موجود ہیں۔

اس بات کی وضاحت کے لیے کسی تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں صحرا میں رہنے والے عربوں میں سچائی بہت بڑی صفت خیال کی جاتی تھی۔ جہاں تک ہمیں علم ہے، یہ بات ساری اقوام میں پائی جاتی ہے۔ انسانی صفات میں یہ سب سے عام

اور سب سے سادہ صفت ہے اور اس لحاظ سے اس کے سمجھنے میں کوئی پیچیدگی موجود نہیں۔ تاہم قرآنِ کریم میں یہ صفت ایک بہت ہی مخصوص رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ بات دفعتہً ہماری نگاہوں کے سامنے تب آتی ہے جب ہم اس کے منفی پہلو یعنی جھوٹ بولنا پر غور کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ ہم پہلے اس اہم نکتہ پر گفتگو کر چکے ہیں کہ سچائی دو قطبوں یعنی صدق اور حق کے درمیان واسطے کا نام ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، حق سچائی کا معروضی پہلو ہے یعنی کسی زبان میں کوئی لفظ تبھی سچا کہلاتا ہے، جب وہ حقیقت کے مطابق ہو۔ داخلی معنوں میں سچائی الفاظ کے ایسے استعمال کا نام ہے جس میں وہ حق یعنی حقیقت کے مطابق ہو۔ اس نکتے کی اہمیت اس وقت زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب ہم ان معاملات میں سچ بولنے کے مسئلے پر غور کریں، جن کا تعلق اللہ اور بندے کے درمیان مذہبی رشتے کا ہے۔ کیونکہ قرآنِ کریم کے مطابق وحی حق کے سوا کچھ نہیں اور اللہ تعالیٰ خود مطلق حق ہے۔ یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ان دونوں صورتوں میں حق باطل کے بالمقابل آتا ہے، جس کا مطلب ہے ایسا جھوٹ اور فریب جس کی بنیاد ہی نہ ہو۔

اللہ حق وصدق ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ۔ (الحج:٦٢)

یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے اور اس کے علاوہ جن چیزوں کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں، وہ سب باطل ہیں اور اللہ ہی سب سے بلند اور سب سے بڑا ہے۔

اس آیت میں باطل سے مراد صریحاً وہ بت ہے، جن کو زمانۂ جاہلیت کے عرب اللہ کا شریک ٹھہرا کر پوجتے تھے اور چونکہ قرآنِ کریم کی زبان میں بتوں کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ انسانی ذہن کی پیداوار ہیں، گھڑی ہوئی کہانیاں ہیں، صرف نام ہیں، جن کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں۔ اس لیے یہ واضح ہوتا ہے کہ حق سے مراد واضح طور پر ایسی حقیقت اور ایسی زندہ قوت ہے جو دُنیائے وجود میں زندگی اور موت کے عمل میں کارفرما

ہے۔ یہ بات مندرجہ ذیل آیت سے خاص طور پر واضح ہوتی ہے جس میں اس عمل کی تفصیل بیان ہوئی ہے کہ کس طرح بنی نوع انسان مٹی سے پیدا ہوتے ہیں، ایک خون کے لوتھڑے کی شکل میں نشوونما پاتے ہوئے ایک خوش شکل بچے کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ اس آیت میں اس ساری تفصیل کے بعد کہا گیا ہے کہ یہ وہی اللہ ہے جس میں انسان کو عدم سے پیدا کرنے کی قدرت ہے، وہی یہ قدرت رکھتا ہے کہ حشر کو قائم کر سکے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِي الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (الحج:٦)

یہ سب اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے اور یہ کہ وہی مُردوں میں جان ڈالتا ہے اور وہی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اگلی آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ کا ذکر ہے کہ وہ انسان کی زندگی کے معاملات کیسے چلاتا ہے اور اِسی بات کو اللہ تعالیٰ کے حق ہونے کا ثبوت بتایا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے حق ہونے کی صفت اس کے تخلیقی عمل سے ہی بہتر طریقے سے سمجھی جا سکتی ہے۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ۔ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ۔ (یونس: ۳۲)

آپ ان سے کہیے کہ وہ کون ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق پہنچاتا ہے یا وہ کون ہے جو تمہیں سننے اور دیکھنے کی قوت دیتا ہے۔ اور وہ کون ہے جو مردہ میں سے زندہ اور زندہ میں سے مردہ کو نکالتا ہے۔ وہ کون ہے جو یہ سارے انتظام کرتا ہے، وہ ضرور یہ کہیں گے کہ وہ اللہ ہے تو پھر ان سے کہیے کہ پھر تم اس سے کیوں نہیں ڈرتے۔ سو اللہ ہی تمہارا حق رب ہے۔ حق کے بعد

سوائے گمراہی کے کیا رہ گیا۔ تو تم کدھر پھرے جا رہے ہو۔

وحی بطور صدق وحق:

أَمْ يَقُولُونَ بِهِ جِنَّةٌ بَلْ جَاءَهُم بِالْحَقِّ وَأَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ۔ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ بَلْ أَتَيْنٰهُم بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَن ذِكْرِهِم مُّعْرِضُونَ۔ (المومنون: ۷۰-۷۱)

یا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اسے جنون ہے جب کہ وہ حق بات لے کر آیا ہے اور ان میں سے اکثر حق سے نفرت کرتے ہیں۔ اگر حق ان کی خواہشات کے مطابق ہوتا تو آسمان اور زمین اور جو لوگ اس کے اندر ہیں، تباہ ہو جاتے۔ بلکہ ہم نے ان کے پاس ان کے لیے نصیحت بھیجی اور وہ اپنے لیے نصیحت سے بھی منہ پھیرتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیات کا شانِ نزول یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ کو بعثت کے اولین زمانے میں ان کے زمانے کے ہم وطن ایک قسم کا دیوانہ سمجھتے تھے۔ لفظ مجنون لغوی طور پر اس معنی کا حامل ہے کہ کسی شخص پر غیر مرئی روح یا جنوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ جنوں کے وجود کے بارے میں حضرت محمد ﷺ بھی کسی شک میں مبتلا نہیں تھے۔ اس آیت میں بہت شدت سے اس بات کی تردید کی گئی ہے اور یہ صراحت کی گئی ہے کہ حضرت محمد ﷺ مجنون نہیں بلکہ اللہ کے رسول ہیں، جو وحی الٰہی لے کر آئے ہیں جو کہ خود سچائی ہے۔ اسی طرح اس سچائی کے بارے میں بھی لوگ مذاق اُڑاتے تھے اور اسے سحر یا جادو کہتے تھے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ۔ (سبا: ۴۳)

اور یہ کافر اس حق کی نسبت جو ان کے پاس پہنچا ہے، یہ کہتے ہیں کہ یہ محض صریح جادو ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ کفار کے ان شدید حملوں سے پہلے بعض اوقات حضرت محمد ﷺ

خود بھی متزلزل ہو جاتے تھے۔ احادیث میں بتایا گیا ہے کہ بعثت کے اولین دنوں میں آپ کو تشویش رہتی تھی اور بعض اوقات اس پُر اسرار آواز کے اصلی منبع کے بارے میں انہیں شک بھی ہو جاتا تھا جو انہیں پیغام کو پہنچانے کی ہدایت دیتی تھی۔ مندرجہ ذیل دو آیات میں خود اللہ تعالیٰ حضرت محمد ﷺ کو یقین دلاتے ہیں کہ اس وحی کی سچائی ایسی ہے جس پر کبھی شک نہیں کیا جا سکتا۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ۔ (آلِ عمران: ٦٠)

یہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے، سو تم شبہ کرنے والوں میں سے نہ بنو۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰـهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَهُمْ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ۔ (البقرة: ١٤٥-١٤٦)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اسے اسی طرح پہچانتے ہیں، جس طرح اپنے بیٹوں کو۔ ان میں سے بعض لوگ ایسے ہیں کہ حق کو چھپاتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے حق ہے۔ سو تم شبہ کرنے والوں میں سے نہ بنو۔

اسلام اور سچائی:

حضرت محمد ﷺ کے ذریعے جو وحی نازل ہوئی، اگر وہ سچائی ہے تو فطری طور پر اسلام جو اس وحی پر مبنی دین ہے، وہ بھی سچائی ہے۔ اس لحاظ سے بھی لفظ حق ہمیشہ باطل کے متضاد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْ اِلَى الْحَقِّ۔ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ۔ اَفَمَنْ يَّهْدِيْ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْ اِلَّا اَنْ يُّهْدٰى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ۔

(یونس: ۳۵)

ان سے کہیے کیا تمہارے شرکاء میں کوئی ایسا ہے، جو حق کی طرف راستہ دکھائے۔ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ اللہ ہی حق کی طرف راستہ دکھاتا ہے، پھر جو شخص حق کا راستہ دکھائے، وہ زیادہ پیروی کے لائق ہے یا وہ جو اس وقت تک راستہ نہ دکھائے جب تک اسے کوئی راستہ نہ دکھلائے تو پھر تم کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسے فیصلے کرتے ہو۔

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔ (بنی اسرائیل: ۸۱)

اور کہہ دیجیے کہ حق آ گیا ہے اور باطل چلا گیا ہے، بے شک باطل تو جانے کے لیے ہی ہوتا ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں لفظ حق یعنی سچائی کو ایک خاص قسم کا مقدس مقام حاصل ہے۔ چنانچہ زبان کا ایسا استعمال جس میں اس تقدیس کی نفی پائی جاتی ہو، اللہ تعالیٰ اور اس کے مذہب کے خلاف کھلی بدزبانی ہے۔ چنانچہ یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ قرآنِ کریم میں کذب یعنی جھوٹ بولنے والے کو انتہائی گھناؤنا بتایا گیا ہے۔ کافر کی سب سے نمایاں خصوصیات میں سے ایک جھوٹ بولنا ہے۔

کذب اللہ تعالیٰ کے خلاف بدزبانی کا ایک رویّہ ہے، جو بنیادی طور پر دو طرح سے ظاہر ہوتا ہے۔ پہلی شکل تو یہ ہے کہ انسان اللہ اور اس کی وحی کے بارے میں کھلم کھلا جھوٹ بولے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ انسان اللہ پر جھوٹ باندھے۔ قرآنِ کریم میں پہلی شکل کے لیے افتراء الکذب کا لفظ آیا ہے اور دوسری کے لیے تکذیب۔ افتراء کا مطلب ہے جھوٹ گھڑنا اور تکذیب کا مطلب ہے، کسی چیز کو جھوٹا ٹھہرانا۔ تکذیب جیسا کہ لفظ سے ہی ظاہر ہے، وحیٔ الٰہی کا صاف طور پر انکار ہے۔ اس بات کے ماننے سے انکار ہے کہ جب یہ سچائی اُتاری گئی تو صحیح نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے بارے میں مذاق اور تمسخر کا عنصر بھی شامل ہے۔ دوسرے الفاظ میں قرآنی سیاق سے پتہ چلتا ہے کہ تکذیب ایسے

ضدی نافرمانوں کا مخصوص رویہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی وحی کو ماننے سے انکار پر مصر ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے نہیں آئی اور اسے پرانے لوگوں کی کہانیاں کہہ کر مذاق کا نشانہ بناتے ہیں۔

وَمَا تَاتِیْھِمْ مِنْ آیَةٍ مِنْ آیَاتِ رَبِّھِمْ إِلَّا کَانُوا عَنْھَا مُعْرِضِیْنَ۔ فَقَدْ کَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَ ھُمْ فَسَوفَ یَاتِیْھِمْ أَنْبٰؤا مَا کَانُوا بِهِ یَسْتَھزِؤُنَ۔ (الانعام: ٤-٥)

اور ان کے پاس اللہ کی نشانیوں میں سے کوئی آئے تو وہ ہمیشہ اس سے منہ ہی پھیرتے ہیں۔ اُنہوں نے جب بھی حق ان کے پاس آیا، تو اسے جھٹلایا۔ سو جلد ہی ان کو خبر مل جائے گی۔ اس چیز کے بارے میں جس کا وہ مذاق اُڑایا کرتے تھے۔

جیسا کہ ظاہر ہے یَسْتَھْزِءُونَ سے وہی مراد ہے جو یُکَذِّبُونَ کا معنی ہے۔ چنانچہ تکذیب کے عمل میں جو ذہنی رویہ کارفرما ہے، اس آیت سے اس پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اِسْتَھْزَا یا مذاق ایسے لوگوں کی بنیادی ذہنی کیفیت کا نام ہے، جو نازل شدہ سچائی کا انکار کرتے ہیں۔

جہاں تک افتراء کا تعلق ہے، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اگر تکذیب براہِ راست خدا کے خلاف بدزبانی کا عمل ہے تو جھوٹ گھڑنا زیادہ لطیف قسم کی بے دینی ہے جو اپنی طرف سے یہ جھوٹی کہانیاں گھڑتی ہے اور یہ دعویٰ کرتی ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے آئی ہے۔ افتراء اسی قسم کی جعل سازی کا نام ہے۔ یہ ایک فعل ہے ادر عام طور پر لفظ کذب اس کا مفعول آتا ہے۔ جو لوگ افتراء کے مرتکب ہوتے ہیں، وہ کسی طرح بھی ان لوگوں سے کم گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں، کیونکہ اس طرح وہ صریحاً خود اللہ کی آیات گھڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ قرآنِ کریم میں افتراء کو بھی اِسی طرح قابلِ مذمت قرار دیا گیا ہے جس طرح تکذیب کو۔

قرآنِ کریم میں افتراء کا صحیح مفہوم کیا ہے، اس سوال کا جواب سیاق وسباق کے اختلاف کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ افتراء کی نمایاں مثال

بت پرستی اور وہ مقدس رسوم ہیں، جو جاہلیہ میں بت پرستی سے وابستہ تھیں۔

إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُفْتَرِيْنَ۔ (الاعراف: ۱۵۲)

بے شک جن لوگوں نے بچھڑے کو خدا بنایا، ان پر بہت جلد خدا کی طرف سے عذاب نازل ہوگا، اور دنیوی زندگی میں ذلت ملے گی اور ہم افتراء کرنے والوں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔

یہ بات حضرت موسیٰ کی قوم کے بارے میں کہی گئی، کیونکہ اُنہوں نے حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں سونے کا بچھڑا بنایا اور اللہ تعالیٰ کی بجائے اس بت کی پرستش کرنے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ لفظ مفترین کا اشارہ بت پرستوں کی طرف ہے۔ اسلام کی رو سے بت پرستی جھوٹ گھڑنے کی سب سے واضح شکل ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ محض اپنے تخیل کی بنیاد پر عجیب وغریب چیزوں کو ایجاد کیا جائے اور بغیر کسی دلیل کے ان کو حقیقت سمجھا جائے۔ جبکہ دراصل حقیقت صرف خدا کی ہے۔ مندرجہ ذیل آیات میں بھی مفتری لفظ بعینہ ان ہی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا۔ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُم مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُه اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ۔ (هود: ۵۰)

اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اُنہوں نے فرمایا، اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں، تم صرف افتراء کر رہے ہو۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں زندگی کے لیے تحریم کے بہت سے مفصل اور پیچیدہ ضابطے موجود تھے، جن کو روایتِ تقالید کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ چیز حرام ہے اور یہ چیز حلال۔ حرام اور حلال کا یہ نظام لوگوں پر مقدس بنا کر ٹھونس دیا گیا تھا۔ اسلام کے نزدیک یہ نظام اللہ کے خلاف جعل سازی کی مثال تھی، کیونکہ یہ حق صرف اس کو حاصل ہے کہ وہ انسانوں کے لیے احکام اور ضابطے مذہب کی شکل میں جاری کرے۔ چنانچہ یہی وجہ

ہے کہ قرآنِ کریم میں جاہلیت کے مقدس رسوم و رواج کو اللہ کے خلاف بہتان بتا کر مذمت کی گئی ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُم الْكَذِبَ هٰذَا حَلَالٌ وَهٰذَا حَرَامٌ۔ لِتَفْتَرُوا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ۔ إِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَايُفْلِحُونَ۔ (النحل:۱۱۶)

اور جن چیزوں کے بارے میں تمہارا محض جھوٹا زبانی دعویٰ ہے، ان کی نسبت یوں مت کہا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام۔ جس کا مطلب ہے تم اللہ پر افتراء باندھ رہے ہو، بے شک وہ لوگ جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، کامیاب نہیں ہوں گے۔

وَقَالُوا هٰذِهِ أَنْعَامٌ وَ حَرْثٌ حِجْرٌ لَا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَنْ نَشَاءُ بِزَعْمِهِم وَأَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ لَايَذْكُرُونَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا إِفْتِرَاءً عَلَيْهِ۔ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُو يَفْتَرُونَ۔ (الانعام: ۱۳۸)

اور اپنے خیال پر یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ مخصوص مویشی ہیں، اور مخصوص کھیت ہیں، جن کا استعمال ہر شخص کو جائز نہیں۔ ان کو کوئی نہیں کھا سکتا، سوائے اُن کے جنہیں ہم چاہیں۔ یہ مویشی ہیں جن پر سواری حرام ہے۔ یہ مویشی ہیں، جن پر یہ لوگ اللہ کا نام نہیں لیتے۔ یہ سب باتیں محض اللہ پر افتراء ہیں اور اللہ تعالیٰ بہت جلد ان کے افتراء کی سزا انہیں دے گا۔

بعض اوقات جادو کو بھی افتراء کہا گیا ہے۔ ذیل کی آیت میں مصری جادوگروں کی طرف اشارہ ہے، جنہوں نے فرعون کی موجودگی میں جادو کے میدان میں حضرت موسیٰؑ سے مقابلہ کرنے کی خواہش کی تھی۔

قَالَ لَهُمْ مُوسٰى وَيْلَكُمْ لَاتَفْتَرُوا على اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُم بِعَذَابٍ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى۔ (طٰہٰ:۶۱)

موسیٰ نے اُن سے کہا، بدبختو! اللہ پر جھوٹ نہ باندھو۔
کہیں وہ تمہیں عذاب سے نیست و نابود نہ کر دے۔ جو جھوٹ
باندھتا ہے، وہ آخر ناکام ہوتا ہے۔

بہرکیف افتراء اور تکذیب جو مذکورہ بالا آیت میں استعمال ہوئے ہیں، قرآنِ کریم کی رُو سے کافروں کے سب سے واضح خصائص پر مشتمل ہے۔ ان پر تفصیلی بحث لفظ کفر کے ضمن میں آئے گی۔

صبر:

صبر بمعنی استقلال اور برداشت، زمانۂ جاہلیت کے صحرائی ماحول میں ایک نمایاں صفت تھی۔ یہ دراصل شجاعت کا ایک حصہ تھی، جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ شجاعت کا لازمی حصہ تھی۔ صحرا میں جہاں جینا بھی دشوار ہوتا ہے، ہر شخص کے لیے ہر دم بے حد صبر اور برداشت کا مظاہرہ لازمی ہے۔ اس کی اپنی زندگی اور قبیلے کے وجود کا انحصار اس پر ہے۔ جسمانی قوت یقیناً ضروری تھی، لیکن یہ کافی نہیں تھی۔ اس کی تائید میں ایسی قوت کی بھی ضرورت تھی جو انسان کے اندر سے اس کا ساتھ دے۔ اس سے مراد صبر یا کمزور نہ پڑنے والا ایسا عزم ہے جو کچھ بھی ہو جائے، انسان کے مفاد کے لیے ہمیشہ لڑتا ہے۔

معنوی طور پر یہ لفظ جزع کا بعینہٖ متضاد ہے۔ اس کا مطلب ہے، ایسے لوگ جو مصیبت کو صبر کے ساتھ برداشت نہ کر سکیں اور بہت جلد اپنے جذباتی ردِعمل کا اظہار کرنے لگیں۔ اس میں یہ معنی بھی مضمر ہیں کہ صبر روح کی ایسی لازمی قوت کا نام ہے، جو شدائد اور مصائب میں اور ہر قسم کی مشکلات میں اپنے مقصد کے حصول میں مستقل مزاجی سے انسان کا ساتھ دے۔[۲۹] یہ بات بہت آسانی سے واضح ہو جاتی ہے کہ صبر میدانِ جنگ میں سپاہی کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ صبر کے بغیر شجاعت کا اظہار بھی ناممکن تھا۔

اسلام نے اس قدیم بدوی خوبی کو بھی اپنی بنیادی صفات میں شامل کر کے اس طرح تبدیل کیا کہ اسے ایک مخصوص مذہبی جہت دے دی، یعنی اللہ کے راستے میں صبر۔

زمانۂ جاہلیت کی طرح مومنین کو حکم دیا گیا کہ جب کافروں کے ساتھ لڑائی کریں تو میدانِ جنگ میں صبر سے کام لیں۔

قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلٰقُوا اللّٰهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِينَ وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَ جُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَآ أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ۔ (البقرة: ۲۵۰)

جن لوگوں کو خیال تھا کہ وہ اللہ کے روبرو پیش ہونے والے ہیں، اُنہوں نے کہا، کتنی مرتبہ چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر خدا کے حکم سے غالب آ جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ صبر و استقلال والوں کا ساتھ دیتا ہے اور جب وہ جالوت اور اس کے فوجیوں کے سامنے آئے تو کہنے لگے، اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر نازل فرمایئے اور ہمارے قدم جمائے رکھیے اور ہم کو اس کافر قوم پر غالب کیجیے۔

وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِينَ۔ (آلِ عمران: ۱٤٦)

اور بہت نبی ہو چکے ہیں، جن کی معیت میں بہت سے اللہ والے لڑے، سو ان مصائب میں جو اللہ کے راستے میں آئے، نہ تو اُنہوں نے ہمت ہاری اور نہ کمزور پڑے اور نہ دبے۔ اللہ تعالیٰ ایسے صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

یہ سپاہیانہ صبر قدرتی طور پر شہادت کے جذبات میں بدل جاتا ہے۔ شہادت درحقیقت ایک ایسی اخلاقی قوت کا نام ہے جو حیران کن بہادری کے ساتھ موت کا سامنا کرنے کی قوت دیتی ہے۔ اور ایمان کے راستے میں آنے والی تمام تکالیف کو برداشت کرنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ مندرجہ ذیل آیت میں فرعون کے جادوگر یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ پوری اولوالعزمی کے ساتھ موسیٰ کے خدا کے وفادار رہیں گے، خواہ ان کو کتنے ہی

ہولناک عذاب اور تکالیف کا سامنا ہو۔

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ ءَ اٰذَنَ لَكُمْ۔ إِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَكَرْ تُمُوهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوا مِنْهَا أَهْلَهَا۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ۔ لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ مِنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِيْنَ۔ قَالُوا إِنَّا إِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُونَ۔ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّا إِلَّا أَنْ اٰمَنَّا بِآيَاتِ رَبِّنَا لَمَّا جَاءَتْنَا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ۔

(الاعراف:۱۲۳-۱۲۶)

فرعون کہنے لگا تم میری اجازت سے پہلے ہی اس پر ایمان لے آئے۔ بے شک یہ ایک سازش ہے، جس پر تم نے اس شہر میں عمل کیا ہے، تاکہ تم یہاں کے رہنے والوں کو اس شہر سے باہر نکال دو۔ سو اب تم کو حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹ دوں گا، پھر تم سب کو سولی پر ٹانگ دوں گا۔ اُنہوں نے کہا ہم اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں، اور تو ہم سے صرف اس بات کا بدلہ لیتا ہے کہ جب اللہ کے احکام آئے تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اے رب! ہم پر صبر کا نزول فرما۔ اور ہمیں حالتِ اسلام پر موت دے۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ صبر کی حقیقت کا اسلام سے واضح طور پر معنوی تعلق قائم کر دیا گیا ہے۔ اس پر اب ہم قدرے تفصیل سے بات کریں گے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ صبر کا تقویٰ یعنی خوفِ خدا سے بھی بہت قریبی تعلق ہے۔

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوا إِنَّ الْأَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔

(الاعراف:۱۲۸)

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اللہ سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو۔ زمین اللہ کی ہے، وہ جسے چاہتا ہے، اپنے بندوں میں سے

اس کا مالک بناتا ہے اور آخر کامیابی متقین کے لیے ہے۔

مومنین کو جس عذاب کا سامنا ہوگا، وہ صرف بدنی سزا نہیں ہے۔ یہ تکلیف تمسخر، مذاق اور کافروں کی دشنام طرازی کی شکل میں بھی پیش آ سکتی ہے۔ ان معنوں میں تکذیب جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اور غرور اور نخوت کی تمام علامات جن پر ہم نے پچھلے باب میں بحث کی تھی، سب کافروں کی صفات ہیں۔ چنانچہ تکذیب کو بھی مومنین کے لیے ان بہت سی آزمائشوں اور آفات میں شمار کیا جاتا ہے، جو شہادت کے جذبے کا تقاضا کرتی ہیں۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَى مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّى أَتْهُمْ نَصْرُنَا۔ (الانعام: ٣٤)

اور آپ سے پہلے بہت سے پیغمبروں کو جھٹلایا گیا، اُنہوں نے اس تکذیب پر صبر کیا، اُن کو تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ حتیٰ کہ پھر ہماری مدد ان تک پہنچی۔

وَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا۔ وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا۔ (المزمل: ١٠-١١)

اور یہ لوگ جو کہہ رہے ہیں، اس پر صبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ رہو۔ اور ان ناز ونعمت میں رہنے والے جھٹلانے والوں کو مجھ پر چھوڑ دو اور ان کو تھوڑی مہلت دو۔

إِنَّهُ كَانَ فَرِيقٌ مِنْ عِبَادِي يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّحِمِينَ۔ فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سِخْرِيًّا حَتَّى أَنْسَوْكُمْ ذِكْرِي وَكُنْتُمْ مِنْهُمْ تَضْحَكُونَ إِنِّي جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا أَنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ۔ (المومنون: ١٠٩-١١١)

میرے بندوں میں سے ایک گروہ ایسا تھا، جو کہتے تھے، اے ہمارے پروردگار! ہمیں بخش دے، ہم پر رحمت فرما تو سب

سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ تم نے ان کا مذاق اُڑایا، حتیٰ کہ اس نے تمہیں ہماری یاد بھلا دی اور تم ہنسی کیا کرتے تھے۔ ہم نے آج ان کو صبر کا یہ بدلہ دیا ہے کہ وہ ہی کامیاب ہیں۔

چنانچہ صبر صحیح معنوں میں ایمان کے ایک بنیادی پہلو کا نمائندہ بن کر سامنے آتا ہے۔ صبر ایمان کا وہ پہلو ہے، جو اس کے ناسازگار حالات میں ظاہر ہوتا ہے، اور یاد رہے کہ تاریخ میں اپنے ابتدائی دور میں اسلام کو ایسے ہی حالات کا واقعتاً سامنا کرنا پڑا۔ مومنین کافروں کے درمیان گھرے ہوئے تھے اور ان کے چاروں طرف دنیاوی خواہشات کا انبار تھا۔ چنانچہ ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ پُرعزم مزاحمت کا رویہ اختیار کریں۔ دشمن کے مسلسل حملوں کے خلاف اپنے سچے ایمان پر اسی غیر متزلزل عزم کے ساتھ قائم رہنا صبر کہلاتا ہے۔ یہ بات مندرجہ ذیل تین آیات سے مزید واضح ہوتی ہے۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُوْدِ۔ (ق:۳۹-۴۰)

پس ان کی باتوں پر صبر کیجیے اور اپنے رب کی تسبیح اور حمد بیان کیجیے، سورج نکلنے سے پہلے اور سورج کے غروب ہونے سے پہلے اور رات میں بھی تسبیح کیجیے اور سجدوں کے بعد بھی۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَاتَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ (الكهف:۲۸)

اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ ثابت قدم رکھیے جو صبح و شام اللہ کو محض اس کی رضا جوئی کے لیے پکارتے ہیں اور دنیوی زندگی کی زینت کے خیال سے ان سے نگاہیں نہ پھیر لینا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اسْتَعِيْنُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۔ وَلَاتَقُوْلُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَمْوَاتٌ بَلْ

أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّاتَشْعُرُونَ۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ
وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ
الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ
رَاجِعُونَ۔ (البقرۃ:۱۵۳-۱۵۵)

اے اہلِ ایمان! صبر اور نماز کے ذریعے مدد چاہو۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جاتے ہیں، انہیں مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں، لیکن تمہیں اس کا احساس نہیں۔ ہم تمہیں آزمائیں گے، کسی قدر خوف، بھوک، مال و جان اور پیداوار کی کمی سے۔ ایسے صبر کرنے والوں کو بشارت سنا دیجیے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں، ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

مندرجہ ذیل بحث ان تمام قبل از اسلام اخلاقی تصورات کا مکمل احاطہ نہیں کرتی، جنہیں اسلام نے اختیار کیا، اور نئی اخلاقیات کا تصور دے کر اسلام میں سمو لیا۔ لیکن کم از کم ہم چند اہم ترین مثالوں کا ذکر ضرور کر پائے ہیں، جن سے اسلام کے اس ابتدائی عہد میں غیر اسلامی عناصر کو اسلام میں اختیار کرنے کے عمل کی وضاحت ہوتی ہے۔ اسلام کو اپنی طویل تاریخ میں اپنے اسی طرح کے عمل سے ثقافت کی مختلف سطحوں پر کئی مرتبہ گذرنا پڑا، جب اسے یونانی، ایرانی اور ہندوستانی تصورات کے ساتھ نپٹنا تھا اور بالآخر جدید مغربی تصورات کے ساتھ بھی اِسی عمل سے گزرنا پڑا۔

حواشی:

(۱) ابنِ ہشام: سیرۃ النبیؐ، ج ۲، ص ۸-۹۔

(۲) المعلقات السبع، معلقه زهیر (ترجمہ مولانا قاضی سجاد حسین)، کراچی، نور محمد کارخانہ تجارت کتب، ت۔ن)، ص ۴۴۔ (مترجم)۔

(۳) المعلقات السبع، معلقه طرفه، محولہ بالا، ص ۶۲۔

(۴) سیرۃ ابنِ ہشام، محولہ بالا۔

(۵) شریف المرتضیٰ الامالی، ج ۱، ص ۲۰۴، لکھتے ہیں کہ اپنا مال خرچ کرتے رہو۔ ثواب اسی وقت ملتا ہے جب اس کے ساتھ اللہ سے ملاقات، اس کی عبادت اور اطاعت کی نیت ہو، جب یہ چیزیں ساتھ نہ ہوں، تو مال خرچ کرنے والے کو کوئی ثواب نہیں ملتا۔

(۶) تفسیر بیضاوی میں اس کا مطلب یوں بیان ہوا ہے، یعنی بے سوچے سمجھے خرچ کرنا، حتیٰ کہ اپنی روزی کو خطرے میں ڈال دینا۔

(۷) یعنی خرچ کرتے وقت تمہاری نیت محض نیکی کا کام کرنا ہونی چاہیے، شاہ خرچی کا مظاہرہ نہیں۔

(۸) المعلقات السبع، معلقه زهير، ص ۴۴۔

(۹) انجد کے معنی سخی کے ہیں۔ اس لیے اہل قبیلہ نے کہا کہ نام سخی ہے، لیکن ہے کنجوس۔

(۱۰) سیرۃ ابن ہشام، ج ۲، ص ۷۰ (و أی داء اکبر من البخل)۔

(۱۱) منٹگمری واٹ، باب سوم، ص ۷۲-۷۹۔

(۱۲) احمد محمد الحوفی، الحیاة العربیة من الشعر الجاهلی (قاہرہ، ۱۹۵۲ء، صفحات ۲۵۲ و مابعد)۔

(۱۳) بستانی: محیط المحیط، ج ۱، ص ۶۹، البخل: نعص المنع، الشح: الحاله النفسانیه التی تقتضی ذالك المنع۔

(۱۴) سیرۃ ابن ہشام، ج ۳، ص ۱۱۳۔

(۱۵) المعلقات السبع، معلقه زهير، محولہ بالا، ص ۴۵، و من لم یذد عن حوضه بسلاحه یهدم و من لایظلم الناس یظلم۔

(۱۶) المعلقات السبع، معلقه زهير، ص ۴۲، جری متی یظلم یعاقب بظلمه سریعا والا یبد بالظلم یظلم۔

(۱۷) سیرۃ ابن ہشام، ج ۳، ص ۴۳۸۔

(۱۸) ایضاً، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”یہ بھگوڑے نہیں بلکہ ان شاء اللہ دوبارہ حملہ کریں گے۔“

(۱۹) سیرۃ ابن ہشام، ج ۳، ص ۴۳۹۔

(۲۰) مثلاً دیکھیے نکلسن، محولہ بالا، صفحات ۸۴-۸۵۔

(۲۱) معلقه زهير بن ابی سلمه، محولہ بالا، ص ۴۴۔

(۲۲) ابن فارس، معجم مقاییس اللغة، تحقیق عبدالسلام ہارون، (قاہرہ، ۱۳۶۶-۱۳۷۱ھ)، جلد سوم، ص ۳۳۹۔

(۲۳) سیرۃ ابن ہشام، ج ۱، ص ۲۵۲۔

(۲۴) طرفہ، دیوان، تحقیق: م۔ سلگ سوہن (پیرس ۱۹۰۱ء)، قصیدہ ۱۲، شعر ۷۔ Tarafah, *Diwan*, Ed. M. Seligsohn (Paris, 1901).

(۲۵) سیرۃ ابن ہشام، ج ۳، ص ۲۳۶، (کعب بن اسد قرظی نے حیی بن اخطب کو یہ جواب دیا تھا، جب حیی نے قلعے کا دروازہ کھولنے کے لیے کہا)۔

(۲۶) سیرۃ ابنِ ہشام، ج ۳، ص ۲۲۳۔

(۲۷) اثیم پر آگے چل کر باب ۱۱ میں بحث کریں گے۔

(۲۸) ای ڈبلیو لین، عربی انگریزی لغات (انگریزی)، (لندن، ۱۸۶۳-۱۸۹۳ء)، جلد دوم، ص ۷۰۱۔
E.W. Lane, *An Arabic-English Lexicon*, (London, 1863-1893).

(۲۹) قرآنِ کریم کی ایک اور آیت میں دونوں خصوصیات تضاد کے طور پر استعمال ہوئی ہیں۔ روزِ حساب جب کفار کو دوزخ میں بھیجا جائے گا تو وہ کہیں گے: سواءٌ علینا أجزعنا ام صبرنا مالنا مِنْ محیص۔ (ابراھیم: ۲۱) ''ہم بے صبری کا اظہار کریں یا صبر کریں، ہمارے لیے دونوں برابر ہیں۔ اب ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔''

باب ششم

بنیادی اخلاقی تضادات

قُلْ یَا اَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ۔ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ۔ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ۔ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ۔ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ۔ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ۔ (الکفرون:۱-۶)

آپ کہہ دیجیے کہ اے کافرو! نہ تو میں تمہارے معبودوں کی پرستش کرتا ہوں اور نہ تم میرے معبود کی عبادت کرتے ہو۔ نہ میں تمہارے معبودوں کی پرستش کرنے والا ہوں اور نہ تم میرے معبود کی پرستش کرنے والے ہو۔ تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔

ان آیات میں بہت ہی ڈرامائی انداز میں بتایا گیا ہے کہ اسلام نے مذہبی معاملات میں اپنے مخصوص رویّے کی بنا پر اپنے اردگرد پھیلے ہوئے شرک سے کس طرح مکمل طور پر ناطہ توڑا۔ دوسرے الفاظ میں یہ اسلام کی طرف سے ان تمام چیزوں کے خلاف جو اس کے عقیدۂ توحید سے بنیادی طور پر مطابقت نہیں رکھتی تھیں، آزادی کا رسمی اعلان تھا۔ اخلاقی عمل کے میدان میں اس آزادی کے اعلان سے بہت ہی اہم نتائج مرتب ہوئے۔ اس اعلان سے ظاہر ہوا کہ آئندہ تمام انسانی اقدار ایک نہایت ہی قابلِ اعتماد معیار کے مطابق جانچی جائیں گی۔

قرآن کی رُو سے تمام انسانی صفات دو باہم متضاد خانوں میں بانٹی گئی ہیں۔ یہ تقسیم اتنی پختہ اور اتنی پُرمعنی ہے کہ اسے اچھائی، برائی یا درست، غلط کے الفاظ سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ہم انہیں بالترتیب مثبت اخلاقی صفات اور منفی اخلاقی صفات

کہیں گے۔ اس تقسیم کی بنیاد عقیدۂ توحید ہے، وہ واحد خدا جس نے تمام کائنات کو پیدا کیا۔ دیکھا جائے تو قرآنِ کریم میں انسان کی اخلاقی صفات کے بارے میں یہ دوئی ایک کلیدی تصور کے طور پر پوری کتاب میں موجود ہے۔ یہ بنیادی دوئی مومن اور کافر کے تضاد پر مبنی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اسلام کے اخلاقی نظام کی ساخت بہت ہی سادہ ہے، کیونکہ ایمان کے معیار سے جانچتے ہوئے ہم بہت آسانی سے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کوئی شخص یا کوئی فعل کونسے خانے سے تعلق رکھتا ہے۔

اس تقسیم کی اہم بات یہ ہے کہ عربوں کے اخلاقی ارتقا پر اس اصول کا بہت دُور رس اثر پڑا، کیونکہ اس کی رُو سے پہلی مرتبہ ایک ایسا اخلاقی اصول سامنے آیا تھا جو ہمیشہ اور ہر جگہ پائے جانے کی وجہ سے اصول کہلانے کا مستحق تھا۔ اگرچہ مجموعی طور پر یہ اب بھی منضبط نہیں تھا، لیکن جونہی کوئی شخص اللہ کی توحید اور رسالت کی صداقت پر ایمان لاتا تھا، اس پر ایک مکمل عملی ضابطہ نافذ ہو جاتا تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، عربوں کی روحانی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا۔ ہم جانتے ہیں دورِ جاہلیت میں اخلاقی اقدار کی ایک خاصی تعداد معروف تھی، لیکن یہ اقدار کسی بنیادی واضح اصول پر مبنی نہیں تھیں۔ تقریباً سب کی سب ایک قسم کے جذباتی اخلاقی رویے پر مبنی تھیں، جس کی عقلی بنیاد نہیں تھی یا یوں کہیے کہ یہ اقدار ایک اندھے اور شدید جذبے کے طور پر نسل در نسل قبائلی میراث کے طور پر طرزِ زندگی کی حیثیت میں چلی آ رہی تھیں۔ اسلام نے پہلی مرتبہ عربوں کو یہ نظریاتی اخلاقی اصول مہیا کیے، جن کی بنیاد پر وہ کسی صفت کی قدر متعین کر سکتے تھے۔

اخلاقی صفات کے بارے میں جس بنیادی دوئی کا ہم ذکر کر رہے ہیں، وہ قرآنِ کریم کی آیات میں کئی مختلف شکلوں میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک تو کافر اور مومن کی بنیادی متضاد دوئی کی شکل میں۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ۔ (التغابن:۲)

وہی ہے، جس نے تم کو پیدا کیا۔ سو تم میں سے بعض

کافر ہیں اور بعض مومن اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ
وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَآمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ
وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ۔ کَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ذٰلِكَ
بِاَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَاتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ
مِنْ رَّبِّهِمْ کَذٰلِكَ یَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ۔ (محمد: ۱-۳)

جو لوگ کافر ہوئے اور اللہ کے راستے سے روکا، خدا نے ان کے اعمال کالعدم کر دیے۔ جو لوگ ایمان لائے اور اُنہوں نے اچھے کام کیے اور جو محمد ﷺ پر نازل کیا گیا ہے، اس پر ایمان لائے، وہ اللہ کی طرف سے سچ ہے۔ اللہ اُن کے گناہ دھو ڈالے گا اور اُن کی حالت درست رکھے گا۔ یہ اس لیے کہ کافر تو غلط راستے پر چلے اور اہلِ ایمان حق راستے پر جو ان کے رب کی طرف سے آیا۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح لوگوں کو اُن کی مثال سے بیان کرتا ہے۔

کہیں یہ اخلاقی اقدار کافر اور متقی کے درمیان تضاد کی شکل میں بیان ہوئی ہیں۔تقویٰ کے مذہبی معنی ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ۔ وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِیْنَ۔
وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْیَقِیْنِ۔ (الحاقہ: ۴۸-۵۱)

اور بے شک یہ متقیوں کے لیے نصیحت ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم میں سے بعض جھٹلانے والے ہیں۔ اور یہ کافروں کے لیے موجبِ حسرت ہے اور یہ یقینی حق ہے۔

یا یہ مسلم اور مجرم کی دوئی کی شکل میں بیان ہوئی ہیں۔

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ۔ (القلم:۳۵)

تو کیا ہم مسلمانوں کے ساتھ مجرمین کے برابر سلوک کریں؟

یا گمراہ اور ہدایت یافتہ کی دوئی کی شکل میں ذکر ہوئی ہیں۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدَىٰ۔ (النجم:۳۰)

بے شک تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے بھٹکا ہوا اور وہ خوب جانتا ہے کہ کون ہدایت یافتہ ہے۔

یا ایک ایسی دوئی کی شکل میں جس میں مثبت جانب جنتی لوگ یا اہلِ حق ہیں اور منفی جانب دوزخی لوگ یا بائیں بازو والے لوگ شامل ہیں۔

لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ۔ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُونَ۔ (الحشر:۲۰)

دوزخی لوگ اور جنتی لوگ برابر نہیں ہو سکتے۔ جنتی تو کامیاب ہیں۔

جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، انسانی صفت کی یہ بنیادی دوئی کئی اور شکلوں میں بھی بیان ہوئی ہے، لیکن یہ سب کے سب ایمان اور کفر کے بنیادی تضاد کے دائرے میں اضافی تنوعات ہیں۔ بنیادی حقیقت ہمیشہ ایک ہے۔

بعض اوقات قرآنِ کریم میں انسانوں کو دو کی بجائے تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے، تاکہ ان دو انتہائی سروں کی درمیانی صورتوں کا ذکر بھی ہو سکے۔ یہ غیر مستقل درمیانی صورت جہاں ایمان اور کفر ایک دوسرے کے ساتھ بدلتے یا اکٹھے ہوتے نظر آتے ہیں، ایسے لوگوں کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے رسمی طور پر اسلام قبول کر لیا ہے اور مسلمان ہو گئے ہیں۔ لیکن اپنے ایمان میں پختہ نہیں ہیں۔

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا۔ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللَّهِ۔

ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ۔ (فاطر:۳۲)

پھر ہم نے یہ کتاب ان لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچائی، جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے پسند فرمایا۔ ان میں سے بعض اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں، اور ان میں سے بعض درمیانے درجے کے ہیں۔ اور ان میں سے بعض اللہ کی اجازت سے نیکیوں میں بڑھنے والے ہیں۔ اور یہ بہت بڑا فضل ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس درمیانی صورت کا اشارہ زیادہ تر صحرا کے بدوی عربوں کی طرف تھا۔ اگرچہ شہری لوگوں پر بھی یہ بات صادق آتی تھی کہ وہ کفر اور ایمان کے درمیان متذبذب رہتے تھے۔ ڈوزی کا کہنا ہے کہ ''عرب اپنی طبیعت میں مذہبی نہیں ہوتے، چنانچہ اسی وجہ سے ان کے اور اسلام قبول کرنے والوں کے درمیان بہت بڑا فرق رہتا ہے۔ آج کے بدوؤں کو ہی دیکھ لیجیے، اگرچہ وہ مسلمان ہیں، لیکن وہ اسلام کے احکام پر زیادہ شدت سے عمل کے قائل نہیں۔ بہرکیف بدوؤں کے ہاں مذہب کے بارے میں وابستگی کا رجحان بہت مشکل نظر آتا ہے۔[۱] قرآن بھی بار بار اس بات کی تائید کرتا ہے۔ ایک آیت میں مومن اور مسلم کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ بدوؤں نے اسلام تو قبول کر لیا ہے، لیکن صرف اس بنیاد پر انہیں صحیح معنوں میں مومن شمار نہیں کیا جا سکتا۔

نہایت اہم آیات (سورۂ ۴۹:۱۴-۱۵) میں جہاں 'مومن' اور 'مسلم' میں فرق کو بہت صراحت سے واضح کیا گیا ہے، یہ بیان ہوا ہے کہ بدو جنہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے، صرف اس بنیاد پر صحیح معنوں میں مومن نہیں کہلا سکتے۔[۲]

بہرصورت یہ ماننا پڑے گا کہ کم از کم معنویاتی لحاظ سے ایسے مشکوک مسلمانوں کا طبقہ بالآخر تذبذب کی مثال ہے، جن کے بارے میں ابھی یہ فیصلہ باقی ہے کہ وہ ایمان اور کفر کے درمیان دو انتہائی سروں کے درمیان کے خط پر کونسی جانب کھڑے ہیں۔ خود حضرت محمد ﷺ کے لیے بھی یہ واقعتاً ایک بہت ہی سنگین مسئلہ تھا کہ ایسے نیم مومنوں کا کیا کیا جائے۔ تاہم اس میں بھی شک نہیں کہ ان کو ایک مستقل خانے میں

شمار نہیں کیا گیا۔ حضرت محمد ﷺ کے نزدیک وہ بالآخر مثبت قدر رکھنے والے طبقے کا ہی ایک حصہ تھے۔ دوسرے الفاظ میں وہ مومنوں کی ایک نامکمل شکل تھی، بالکل نامکمل۔ لیکن پھر بھی اس لحاظ سے مومن کہ کم از کم ظاہری طور پر وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے تھے اور اس لحاظ سے انہیں ان کے اعمال کے اجر سے محروم نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس سے پہلے کہ ہم ان الفاظ کا تفصیلی تجزیہ پیش کریں جو قرآنِ کریم میں مثبت یا منفی طور پر مذہبی اخلاقی صفات کے حامل شمار کیے گئے ہیں، یہ بہتر ہوگا کہ پہلے ہم انسانوں کی ایک دو بنیادی قسموں کی عمومی صفات کا جائزہ لے لیں جو ان صفات کے امتزاج سے پیدا ہوتے ہیں۔ سادہ لفظوں میں ہم پہلے زیرِ تحقیق مسئلے کی وضاحت کے لیے یہ سوال تشکیل دے لیں کہ قرآنی تعلیمات کی رُو سے ایک انسان کو جنت کے حصول کے لیے کیا کرنا ضروری ہے اور وہ کونسے اعمال ہیں جن کی وجہ سے کوئی شخص لازمی طور پر دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ ایک مثالی مومن کی صفات کیا ہیں اور ایک کافر کی نمائندہ خصوصیات کیا ہیں؟ ہمیں اُمید ہے کہ متعلقہ قرآنی آیات کا تجزیہ کر کے ہم مذہبی اخلاقی صفات کی بنیادی قسموں کا تعین کر سکیں گے۔ یہاں ہم یہ بات بھی کہتے چلیں کہ عام طور پر قرآن کے اخلاقی مذہبی نظام کی بنیادِ آخرت کے تصور پر ہے۔ یا یوں کہیے کہ محض موجودہ دُنیا کی اخلاقیات بذاتِ خود ایک مکمل نظام نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس اس کی ساخت نہایت جامع طریقے سے آئندہ آنے والی دُنیا کے حساب سے متعین ہوتی ہے جو موجودہ دُنیا کا انجام ہے۔ اسلامی نظامِ فکر میں آخرت کا جیتا جاگتا تصور انسان کے اخلاقی معاملات میں سب سے اعلیٰ اصول کی طرح کارفرما نظر آتا ہے۔

اصحاب جنت:

قرآنِ کریم کی سترویں سورت (المعارج)، آیات ۲۲-۳۵ میں ان شرائط کا تفصیلی ذکر ہے جن کا پورا کرنا ہر اس شخص کے لیے لازم ہے جو ان لوگوں میں شامل

ہونا چاہتا ہے جن کو جنت میں رہنے کی اجازت ہوگی۔ یہاں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ جنت کے انعام کا وعدہ صرف ایسے عبادت گزاروں کے لیے ہے جو:

(۱) پابندی سے اور صحیح طریقے سے نماز پڑھتے ہیں۔ (آیات:۲۳،۳۴)

(۲) جو اپنی دولت میں سے معلوم حصہ سائلین اور محتاجوں کو دیتے ہیں۔ (آیات: ۲۴-۲۵)

(۳) جو یومِ قیامت کو حق سمجھتے ہیں۔ (آیت: ۲۶)

(۴) جو اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ (آیت: ۲۷)

(۵) جو اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہیں۔ (آیت: ۲۹)

(۶) جو اپنے وعدوں اور قسموں کو پابندی سے پورا کرتے ہیں۔ (آیت: ۳۲)

(۷) جو سچی گواہی دیتے ہیں۔ (آیت: ۳۳)

ان آیات میں اللہ کی مرضی حاصل کرنے کے لیے جو شرائط گنوائی گئی ہیں، ان میں دائمی عبادت، زکوٰۃ، یومِ حساب پر عقیدہ، اللہ کا خوف، جنسی بے راہ روی سے احتراز، وفاداری اور سچائی شامل ہیں۔ پہلی دو کا تعلق عبادات سے ہے جو بعد میں فرائض کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں اور آگے چل کر روزہ اور عقیدۂ توحید کے ساتھ مل کر اسلام کے پانچ ارکان کی حیثیت اختیار کرتی ہیں۔ تیسری اور چوتھی شرط خوف کے اس مرکزی تصور سے تعلق رکھتی ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ چھٹی اور ساتویں شرط کا بھی ہم صدق کے حوالے سے گزشتہ باب میں تجزیہ کر چکے ہیں۔

تیرھویں سورت میں ان اسلامی صفات کا ذکر ہے جو ایک مومن کے لیے لازم ہیں، یہ صفات درحقیقت وہی ہیں جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَايَنْقُضُونَ الْمِيْثَاقَ۔
وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوْءَ الْحِسَابِ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ جَنّٰتُ عَدْنٍ

یَدْخُلُوْنَھَا۔ (الرعد: ۲۰-۲۳)

جو لوگ اللہ سے اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اس عہد کو توڑتے نہیں، جن چیزوں کو جوڑنے کا حکم دیا، ان کو جوڑتے ہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور سخت حساب سے ڈرتے ہیں، جو لوگ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر کرتے ہیں۔ نماز کی پابندی کرتے ہیں اور ہم نے جو دے رکھا ہے، اس میں سے خفیہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں۔ بدسلوکی کو حسنِ سلوک سے ٹال دیتے ہیں۔ نیک انجام انہی لوگوں کے لیے ہے۔ یہ ہمیشہ رہنے والی جنت میں داخل ہوں گے۔

غور کیجیے تو اس دوسری فہرست میں صبر کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں پہلے بات ہو چکی ہے۔ صبر کا ذکر اس فہرست میں بھی ہے، جہاں ایک مثالی مومن کی صفات بیان کی گئی ہیں۔

(۱) مرد اور عورت جو اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرتے (مسلم) ہیں،

(۲) مرد اور عورت جو ایمان لاتے (مومن) ہیں،

(۳) مرد اور عورت جو سچ بولتے (صادق) ہیں،

(۴) مرد اور عورت جو صبر کرتے (صابر) ہیں،

(۵) مرد اور عورت جو عاجزی اور انکساری سے کام لیتے (خاشع) ہیں،

(۶) مرد اور عورت جو خوشی سے زکوٰۃ و صدقات ادا کرتے (متصدق) ہیں،

(۷) مرد اور عورت جو پابندی سے روزے رکھتے (صائم) ہیں،

(۸) مرد اور عورت جو اپنی عصمت کی حفاظت کرتے (حافظ لفروج) ہیں،

(۹) مرد اور عورت جو اللہ کا ہمیشہ ذکر کرتے (ذاکر) ہیں،

اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا انعام تیار کر رکھا ہے۔ (الاحزاب: ۳۵)

اس فہرست کو مکمل کرنے کے لیے شکر اور توبہ کا بھی اضافہ کرنا ضروری ہے، اگلی آیت میں ان دونوں عناصر کو بہت نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت میں

بھی اصحابِ جنت کی خصوصیات بتائی گئی ہیں۔ اس آیت میں ہر سچے مومن سے کہا گیا ہے کہ جب وہ چالیس سال کا ہو جائے تو اپنے اللہ سے یہ دُعا کرے۔

حَتّٰی إِذَا بَلَغَ أَشُدَّہ وَ بَلَغَ أَرْبَعِینَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِی أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِی أَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰه وَأَصْلِحْ لِی فِی ذُرِّیَّتِی إِنِّی تُبْتُ إِلَیْكَ وَإِنِّی مِنَ الْمُسْلِمِینَ۔ أُولٰئِكَ الَّذِینَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ فِی أَصْحٰبِ الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِی كَانُوا یُوعَدُونَ۔ (الاحقاف:۱۵-۱۶)

یہاں تک کہ وہ جب جوانی کو پہنچ جائے اور چالیس سال کا ہو جائے تو اب رب سے دُعا کرے کہ اے رب! مجھے اس پر مداومت دیجیے کہ میں آپ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو آپ نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائی ہیں اور میں ایسے نیک کام کروں، جس سے آپ خوش ہوں اور میرے لیے میری اولاد میں بھی صلاحیت پیدا کیجیے۔ میں آپ کی جناب میں توبہ کرتا ہوں۔ میں فرماں بردار ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ ہم ان کے اعمال کو قبول کریں گے اور ان کے گناہوں سے درگذر کریں گے، اس سچے وعدے کی رُو سے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔

ان دو عناصر میں سے ایک یعنی شکر کا گذشتہ باب چہارم میں تفصیلی ذکر ہو چکا ہے۔ آئندہ باب میں بھی اس پر گفتگو ہوگی۔ جہاں تک دوسرے عنصر یعنی توبہ کا ذکر ہے، ہم پہلے یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ گویا ایک طرف اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت ہے تو اس کے مقابلے میں یہ انسانی فعل ہے۔ گو کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ بہت سختی سے کام لیں گے اور برائی کرنے والوں کے ساتھ کسی طرح کی نرمی سے پیش نہیں آئیں گے۔ لیکن یہی خداوندِ کریم نہایت رحیم اور غفور بھی ہے۔ قرآنِ کریم میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کا توبہ قبول کرنا بیان کیا گیا ہے۔

ثُمَّ يَتُوبُ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيْمٌ۔ (التوبہ:۲۷)

پھر اللہ تعالیٰ جس کی چاہے توبہ قبول کر لے گا اور اللہ تعالیٰ بہت مغفرت کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ توبہ کا لفظ انسان کی نسبت سے استعمال ہو تو اس کا مطلب باز آ جانا، لیکن اگر اللہ کی نسبت سے استعمال ہو تو اس کا معنی معاف کر دینا ہے۔ انسان جب اللہ تعالیٰ کی طرف مڑتا ہے تو یہ توبہ کہلاتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ انسان کی طرف مڑتا ہے تو یہ رحمت اور مغفرت کہلاتا ہے۔ اس طرح بہت واضح طور پر اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیان مڑنے کا ایک مربوط رشتہ ہے۔ اور یہ بات لفظ توبہ کے معنویاتی عمل میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بے انتہا اچھائی اور رحمت ایسے لوگوں کے لیے بھی ہے جو کسی طرح کا ایمان نہ رکھتے ہوں اور جو بت پرستی جیسے مکروہ ترین گناہ کا ارتکاب کر چکے ہوں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ برائی کے راستے سے مکمل طور پر توبہ کر کے ایمان کے راستے پر آ جائیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے بارے میں جو سونے کے بچھڑے کے بت کی پوجا کرنے لگے تھے، قرآنِ کریم میں ارشاد ہوا۔

إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيْمٌ۔ (الاعراف:۱۵۲-۱۵۳)

بے شک جن لوگوں نے بچھڑے کی پرستش کی، ان پر اپنے رب کی طرف سے ان کی دنیوی زندگی میں ہی غضب اور ذلت پڑے گی اور جن لوگوں نے برے کام کیے اور پھر اس کے بعد توبہ کر لی اور ایمان لے آئے تو تمہارا رب اس کے بعد معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

تمام مومنوں کو بڑی سختی سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ پورے اخلاص کے ساتھ توبہ کر کے اللہ کی طرف واپس آ جائیں۔ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ ان کے پچھلے گناہوں کو جو جان بوجھ کر یا بھول سے کیے گئے ہوں، معاف کر دے۔ ایسا دل جو سچائی سے توبہ کرے، جنت کے انعام کا حق دار بھی ہو سکتا ہے۔

يا أيّها الّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إلى اللّٰهِ تَوْبَةً نَصُوحًا۔
عَسىٰ رَبُّكُم اَنْ يُكَفِّرَ عَنْكُم سَيِّاتِكُم وَيُدْخِلَكُم جَنّٰتٍ تَجرِىْ
مِنْ تَحْتِها الأَنْهٰر۔ (التحريم:٨)

اے ایمان والو! تم اللہ کے آگے سچی توبہ کرو۔ ہو سکتا ہے، تمہارا رب تمہارے گناہ معاف کر دے اور تمہیں ایسے باغوں میں داخل کر دے، جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

قرآنِ کریم میں توبہ کے اس مادے سے ایک اور شکل توّاب بھی اکثر استعمال ہوتی ہے۔ جب انسان کے حوالے سے مذکور ہو تو اس سے مراد ایسا شخص ہے جو اکثر توبہ کرتا ہو اور جب اللہ کے حوالے سے مذکور ہو تو قدرتی طور پر اس کا معنی ہے وہ خدا جو گناہ گاروں کو معاف کر دینے کا عادی ہے، جو اکثر عذاب سے ہٹ کر رحمت کا سلوک کرتا ہے۔ اسی طرح ایک اور لفظ اوّاب بھی آتا ہے، جس کا معنی بہت کثرت سے توبہ کرنے والا ہے۔ یہ اوب کے مادے سے مبالغے کی شکل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جو اپنے گناہوں سے توبہ کر کے اللہ کی طرف لوٹ آتا ہے۔ توّاب کے برعکس یہ لفظ جب اللہ کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس کا معنی معاف کر دینے کا نہیں آتا۔ مثلاً مندرجہ ذیل دو آیات ملاحظہ ہوں:

وَأُزْلِفَتِ الْجنّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غير بَعِيدٍ، هٰذا مَاتُوعَدُوْنَ
لِكُلِّ أَوّابٍ حَفِيظٍ۔ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالغَيْبِ و جاءَ بِقَلْبٍ
مُنِيبٍ۔ اُدْخُلُوها بِسَلٰمٍ ذٰلِكَ يَومُ الخُلُود۔ (ق:٣١-٣٤)

اور جنت متقیوں کے قریب لائی جائے گی، یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ وہ ہر واپس لوٹنے والے کے

لیے اور پابندی کرنے والے کے لیے ہے۔ جو شخص خدا سے بے دیکھے ڈرتا ہو اور جو رجوع کرنے والا دل لے کر آئے۔ اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔

ان آیات میں تقریباً انہی معنوں میں ایک اور لفظ منیب بھی آیا ہے۔ یہ فعل اناب کا اسم فاعل ہے، جس کا مطلب ہے توبہ کر کے اللہ کی طرف لوٹنا۔ اس کے معنوں میں اضافی طور پر وقتاً فوقتاً کا مفہوم بھی شامل ہے۔ عرب ماہرینِ لغات کے نزدیک لفظ اناب کا اصلی معنی کوئی کام باری باری کرنا یا کسی شخص کی طرف بار بار آنا ہیں۔

اصحابِ دوزخ:

اوپر ہم نے ان اہم صفات پر گفتگو کی جو جنت کے انعام کے مستحق لوگوں کی اسلامی خوبیاں ہیں۔ ان کی روشنی میں اب یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ دوزخ میں جانے والوں کی برائیاں کیا ہو سکتی ہیں۔ انہی کو قرآنِ کریم میں بعض اوقات بائیں بازو کے لوگ بھی کہا گیا ہے۔

وَأَصْحٰبُ الشِّمَالِ مَا أَصْحٰبُ الشِّمَالِ۔ فِي سَمُومٍ وَ حَمِيمٍ۔ وَظِلٍّ مِّن يَحْمُومٍ۔ لَابَارِدٍ وَلَاكَرِيمٍ۔ (الواقعه: ٤١ - ٤٤)

اور بائیں بازو کے لوگ۔ یہ بائیں بازو کے لوگ کون ہیں؟ یہ آگ میں اور کھولتے پانی میں ہوں گے اور سیاہ دھوئیں کے سایے میں ہوں گے۔ جو نہ ٹھنڈا ہوگا، نہ آرام دہ۔

اصحابِ دوزخ وہ ہیں جن میں کوئی بھی مثبت صفت نہیں پائی جاتی۔ یا یوں کہیے کہ ان میں بعض خصوصیات ایسی ہیں جو اوپر بیان کردہ اچھی صفات کے بالکل برعکس ہیں۔ چنانچہ یہ بات بڑی آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ جہنم کی طرف جانے والے لوگوں میں کافر سب سے آگے ہوں گے۔

وَلِلَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِم عَذَابُ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ۔

(الملک:٦)

اور جن لوگوں نے اپنے رب کا انکار کیا، ان کے لیے
جہنم کا عذاب ہے اور کتنی بری منزل ہے۔

کافروں کو آگ میں اس لیے پھینکا جائے گا کہ اُنہوں نے فسوق کا ارتکاب کیا یعنی اس دُنیا میں وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے رہے۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ۔ أَذْهَبْتُمْ
طَيِّبٰتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا۔ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ
عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا
كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ۔ (الاحقاف:۲۰)

اور جس روز کفار آگ کے سامنے لائے جائیں گے
کہ تم اپنی اچھی چیزیں دنیوی زندگی میں حاصل کر چکے اور ان
کے مزے لے چکے۔ سو آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی۔
اس وجہ سے کہ تم دُنیا میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے اور اس لیے کہ
تم نافرمانیاں کیا کرتے تھے۔

دوزخ کی طرف جانے والے اس جلوس میں ایسے تمام لوگ شامل ہیں، جو کسی نہ کسی طرح کافروں سے تعلق رکھتے ہیں، یعنی ایسے تمام لوگ جو کفر کی امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں۔ یہاں ہم ان چند آیات کا ذکر کریں گے، جن میں ان منفی خصوصیات کا آگ کے عذاب کے حوالے سے واضح طور پر ذکر ہے۔

ان میں پہلے وہ لوگ ہیں، جن کو تکذیب کی صفت سے یاد کیا گیا۔

ثُمَّ إِنَّكُمْ أَيُّهَا الضَّالُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ۔ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ
شَجَرٍ مِنْ زَقُّوْمٍ۔ فَمَا لِئُوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ۔ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ
الْحَمِيْمِ۔ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ۔ هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ۔
(الواقعہ:٥١-٥٦)

پھر تم اے گمراہو! اور جھٹلانے والو! تمہیں زقوم کے

درخت سے کھانا ہوگا۔ پھر اس سے پیٹ بھرنا ہوگا۔ پھر اس پر کھولتا ہوا پانی پینا ہوگا۔ پھر پیاسے اونٹوں کی طرح پینا ہوگا۔ یہ ہوگی قیامت کے روز ان لوگوں کی دعوت۔

یَومَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَورًا۔ وَتَسِیرُ الجِبَالُ سَیرًا۔ فَوَیلٌ یَومَئِذٍ لِّلمُکَذِّبِینَ الَّذِینَ هُم فِی خَوضٍ یَلعَبُونَ۔ یَومَ یُدَعُّونَ اِلٰی نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا۔ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِی کُنتُم بِهَا تُکَذِّبُونَ۔ اَفَسِحرٌ هٰذَا اَم اَنتُم لَاتُبصِرُونَ۔ اصلَوهَا فَاصبِرُوا اَو لَاتَصبِرُوا سَوَاءٌ عَلَیکُم اِنَّمَا تُجزَونَ مَا کُنتُم تَعمَلُونَ۔ (الطور:۹-۱٦)

جس روز آسمان تھرتھرائے گا اور پہاڑ چلنے لگیں گے، تو اس روز جھٹلانے والوں کی بدبختی ہوگی، جو بے ہودگی کے مشغلے میں مشغول رہے گا۔ جس روز ان کو دھکیل کر دوزخ کی آگ کی طرف لایا جائے گا۔ یہی وہ دوزخ ہے، جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ کیا یہ جادو ہے یا تم کو اب بھی نظر نہیں آتی۔ اس میں داخل ہو جاؤ، پھر اس کو تم برداشت کرو یا نہ کرو، تمہارے لیے دونوں برابر ہیں، جیسا کہ تم کرتے تھے۔ یہ صرف ویسا ہی بدلہ ہے۔

اسی میں ظالم لوگ بھی ہیں جن کا سرسری ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اور آئندہ بھی ان کے بارے میں گفتگو ہوگی۔ یہاں یہ کہنا کافی ہوگا کہ زقوم کا درخت جس کا ابھی ذکر ہوا، ایسے لوگوں کا منتظر رہے گا جو اللہ تعالیٰ کو جھٹلاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل آیت میں ظالموں کے حوالے سے اس درخت کا ذکر خصوصی طور پر کیا گیا ہے۔

اَذٰلِكَ خَیرٌ نُّزُلًا اَم شَجَرَةُ الزَّقُّومِ۔ اِنَّا جَعَلنٰهَا فِتنَةً لِّلظّٰلِمِینَ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخرُجُ فِی اَصلِ الجَحِیمِ۔ طَلعُهَا کَاَنَّهٗ رُءُوسُ الشَّیٰطِینِ۔ فَاِنَّهُم لَاٰکِلُونَ مِنهَا فَمَالِئُونَ مِنهَا البُطُونَ۔ ثُمَّ اِنَّ لَهُم عَلَیهَا لَشَوبًا مِّن حَمِیمٍ۔ ثُمَّ اِنَّ مَرجِعَهُم لَاِلَی الجَحِیمِ۔ (الصّٰفّٰت:٦٢-٦٨)

بھلا یہ دعوت بہتر ہے یا زقوم کا درخت۔ ہم نے اس
درخت کو ظالموں کے لیے آزمائش بنایا ہے۔ یہ ایک درخت ہے،
جو قعرِ دوزخ سے نکلتا ہے۔ اس کے پھل ایسے ہیں، جیسے سانپ
کے پھن۔ تو وہ لوگ اسے کھائیں گے۔ پھر اسی سے پیٹ بھریں
گے، پھر ان کو کھولتا ہوا پانی ملا کر دیا جائے گا۔ پھر ان کا آخری
ٹھکانا دوزخ ہی ہوگا۔

متکبر (جو متکبر کا مترادف ہے) ایسا شخص ہے جو فخر و غرور کی وجہ سے اس قدر پھول گیا ہے کہ وہ قرآن کی تعلیمات کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔ کبر کے تصور پر گفتگو آئندہ ہوگی۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ
دٰخِرِيْنَ۔ (المومن:٦٠)

جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں، وہ
عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

فَادْخُلُوْا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا فَلَبِئْسَ مَثْوَى
الْمُتَكَبِّرِيْنَ۔ (النحل:٢٩)

سو جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اس میں ہمیشہ
رہو۔ پس تکبر کرنے والوں کے لیے بہت برا ٹھکانا ہے۔

ان میں طاغی بھی شامل ہیں، یعنی ایسے لوگ جو انتہائی سرکش ہیں اور برخود غلط ہیں۔ اس لفظ کا معنویاتی تجزیہ آئندہ آئے گا۔

لِلطَّاغِيْنَ مَـاٰبًا لَّابِثِيْنَ فِيْهَا أَحْقَابًا۔ لَايَذُوْقُوْنَ فِيْهَا
بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا۔ إِلَّاحَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا۔ جَزَآءً وِّفَاقًا۔ إِنَّهُمْ كَانُوْا
لَايَرْجُوْنَ حِسَابًا وَّ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا۔ (النبا:٢٢-٢٨)

دوزخ سرکش لوگوں کی گھات میں ہے، جس میں بے
انتہا زمانوں تک پڑے رہیں گے؛ وہ نہ کسی ٹھنڈی چیز کا ذائقہ

چکھیں گے، نہ پینے کا۔ صرف گرم پانی اور پیپ پینے کو ملے گی۔
ان کو پورا پورا بدلہ ملے گا۔ یہ لوگ حساب کی توقع نہیں رکھتے تھے
اور ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے تھے۔

فاجر وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل نہیں کرتا یا اخلاقی ضابطے کی پابندی نہیں کرتا اور برے کام کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ نیک یعنی بار (جمع ابرار) لوگوں کے برعکس ہے۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ
يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ وَ مَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِينَ۔ (الانفطار:
۱۳-۱۶)

بے شک نیک لوگ آسائش میں ہوں گے اور فاجر
لوگ دوزخ میں ہوں گے۔ وہ روزِ جزا اس میں داخل ہوں گے
اور پھر کبھی اس سے باہر نہیں آئیں گے۔

اسی طرح قاسط وہ شخص ہے جو سیدھے راستے سے ہٹا ہوا ہے اور برے کام کرتا ہے۔ لفظ قاسط لفظ مسلم کا متضاد ہے۔

وَإِنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُونَ وَمِنَّا الْقَسِطُونَ فَمَنْ أَسْلَمَ
فَأُولَٰئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا وَأَمَّا الْقَسِطُونَ فَكَانُوا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا۔
(الجن: ۱۴-۱۵)

ہم میں سے بعض تو مسلمان ہو گئے اور بعض بے راہ
ہیں۔ جو اسلام لے آئے، اُنہوں نے تو بھلائی کا راستہ ڈھونڈ لیا
اور جو بے راہ ہیں، وہ دوزخ کا ایندھن ہیں۔

اسی طرح عاصی ہے یعنی جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا باغی ہے۔

وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَ رَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَلِدِينَ
فِيهَا أَبَدًا۔ (الجن:۲۳)

اور جو اللہ اور اس کے رسول کا کہنا نہیں مانتے، تو یقیناً

ان کے لیے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

پھر منافق ہے جو ظاہری طور پر نیک اور مومن ہے، لیکن درحقیقت وہ ہٹ دھرم کافر ہے۔ لفظ منافق کی معنوی ساخت کے بارے میں آئندہ گفتگو ہو گی۔

يَٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۔ (التحریم:۹)

اے نبی! کفار سے اور منافقین سے جہاد کیجیے اور ان پر سختی کیجیے۔ ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اور بہت بری منزل ہے۔

انہی میں مستہزی بھی ہے جو اللہ کی وحی کا مذاق اُڑاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے الفاظ میں مذاق دراصل کفر کا عمل ہے۔ قرآن کی رُو سے یہ کفار کا مخصوص وطیرہ ہے کہ وہ پیغمبروں کا ہمیشہ مذاق اُڑاتے آئے ہیں۔

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا۔ (الکھف:۱۰۶)

اور کہ ان کی سزا جہنم ہوگی، کیونکہ اُنہوں نے کفر کیا اور میری نشانیوں اور پیغمبروں کا مذاق اُڑایا۔

اسی طرح خراص ہے جو شدید لفظوں میں قابلِ مذمت ہے۔ اس لفظ سے مراد ایسا شخص ہے جو اندازوں سے بات کرتا ہے، اس کی بات علم پر مبنی نہیں ہوتی۔ قرآن کی رُو سے یہ وہ شخص ہے جو وحی کے بارے میں ہر طرح کی باتیں اپنے قیاس سے کہتا ہے۔

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ۔ يَسْئَلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ۔ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ۔ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ۔ (الذریت: ۱۰-۱۴)

لعنت ہو بے سند بات کرنے والوں پر جو اپنی جہالت میں بھولے ہوئے ہیں۔ پوچھتے ہیں روزِ جزا کب ہوگا جس دن وہ لوگ آگ سے آزمائے جائیں گے۔ اپنی آزمائش کا مزہ

چکھو۔ تم اس کی جلدی مچایا کرتے تھے۔

آخر میں ایسے لوگ ہیں جو ایمان نہ لانے کی وجہ سے سماجی کاموں میں حصہ نہیں لیتے اور نہ کسی کی مدد کرتے ہیں، ان لوگوں کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ جو اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ غریب اور محتاج کی ضرورت کے وقت مدد کرنے کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔

خُذُوہ فغُلُّوہُ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوہُ ثُمَّ فِی سِلْسِلَۃٍ ذَرْعُھَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُکُوہُ إِنَّہُ کَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ فَلَیْسَ لَہُ الْیَوْمَ ھٰھُنَا حَمِیْمٌ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ لَا یَأْکُلُہ إِلَّا الْخَاطِئُونَ۔ (الحاقہ: ۳۰-۳۷)

اس شخص کو پکڑ لو۔ اسے طوق پہنا دو۔ پھر اسے دوزخ میں ڈال دو۔ پھر ایک ایسی زنجیر میں جکڑ دو جو ستر گز لمبی ہے۔ یہ شخص خدائے بزرگ پر ایمان نہیں لاتا تھا۔ اور غریب کو کھانے کی ترغیب نہیں دیتا تھا۔ اس شخص کا آج کوئی حمایتی نہیں ہے۔ زخموں کے دھوون کے علاوہ اس کے لیے کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ اسے گناہگاروں کے علاوہ کوئی نہیں کھاتا۔

آخر میں ہم چند ایسی آیات کا ذکر کریں گے، جن میں یہ منفی خصوصیات یکجا بیان ہوئی ہیں۔ کبھی ایک شخص میں جمع بتائی گئی ہیں۔ اور کبھی مختلف اشخاص میں۔

أَلْقِیَا فِی جَھَنَّمَ کُلَّ کَفَّارٍ عَنِیْدٍ مَنَّاعٍ لِلْخَیْرِ مُعْتَدٍ مُرِیْبٍ أَلَّذِی جَعَلَ مَعَ اللّٰہِ إِلٰھًا آخَرَ فَأَلْقِیَاہُ فِی الْعَذَابِ الشَّدِیْدِ۔ (ق: ۲۴-۲۶)

ہر اس شخص کو جہنم میں ڈال دو جو کفر کرنے والا اور ضد رکھنے والا ہے۔ نیکی سے روکتا ہے، حد سے گزرنے والا ہو اور شک پیدا کرنے والا ہو۔ وہ جس نے اللہ کے ساتھ دوسرا معبود

تجویز کیا، ایسے شخص کو عذاب میں ڈال دو۔

اس آیت میں چار گناہوں کا ذکر ہے جو دوزخ کے شدید عذاب کے انعام کے لیے بیان ہوئے ہیں:

(۱) کفر، (۲) لوگوں کو ایسے کاموں سے روکنا جو مذہبی طور پر اچھے قرار دیے گئے ہیں، (۳) اللہ کی مرضی کی حدود کی خلاف ورزی کرنا، (۴) اللہ تعالیٰ کے سچ ہونے میں شک کا اظہار کرنا اور شرک اختیار کرنا۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيْمٍ عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ أَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِيْنَ۔ إِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ أَسَاطِيْرُ الْأَوَّلِيْنَ سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ۔ (القلم:۸-۱۶)

آپ ان جھٹلانے والوں کا کہنا نہ مانیے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ ڈھیلے ہو جائیں تو یہ لوگ بھی ڈھیلے ہو جائیں۔ آپ کسی ایسے شخص کا کہنا نہ مانیں جو بہت قسمیں کھانے والا ہو، بے وقعت ہو، طعنے دینے والا ہو اور چغلیاں کھانے والا۔ نیک کام سے روکنے والا، حدود اللہ کی خلاف ورزی کرنے والا، گناہ کرنے والا، سخت مزاج اور پھر حرام زادہ بھی ہو۔ اس سبب سے کہ وہ مال اور اولاد والا ہو۔ جب اس کے سامنے ہماری آیات تلاوت کی جائیں تو وہ کہے کہ یہ بے سند باتیں ہیں جو اگلوں سے نقل ہوتی آئی ہیں۔ ہم عنقریب اس کی ناک داغ دیں گے۔

اس آیت میں سات خصوصیات بیان ہوئی ہیں: (۱) تکذیب، (۲) بے سوچے سمجھے قسمیں کھانا یا دوسرے لفظوں میں سچائی کا دامن چھوڑنا، (۳) غیبت جو کذب کی مخصوص شکل ہے، (۴) نیکی سے روکنا، (۵) حدود کی خلاف ورزی، (۶) تند مزاجی جو جاہلیت کی خصوصیت ہے، (۷) اپنے مزاج میں ذلت، پست خوئی اور پیچ

ہونے کا اظہار یعنی ایسی خصوصیات جو قبائلی معاشرے میں غیرکی صفات سمجھی جاتی ہیں۔

ذیل کی آیت میں ایسے لوگوں کا اقرارِ جرم بیان کیا جاتا ہے جو قیامت کے روز دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِيْنَ، وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ حَتّٰى أَتَانَا الْيَقِيْنُ۔ (المدثر:۴۳-۴۷)

وہ کہیں گے، ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور غریب کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور شغل کرنے والوں کے ساتھ شغل میں لگے رہتے تھے۔ ہم روزِ جزا کو جھٹلاتے تھے، حتیٰ کہ یقینی صورت ہم پر آ گئی۔

اس اقرارِ جرم میں جو چار چیزیں فوری طور پر سامنے آتی ہیں، جن کی وجہ سے گناہ گاروں کو دوزخ کے عذاب کا سامنا ہے۔ (۱) فرض عبادت کا ادا نہ کرنا، (۲) زکوٰۃ نہ ادا کرنا، (۳) مذہبی اُمور کے بارے میں بے سروپا باتیں کرنا، (۴) تکذیب۔

اصحابِ جنت اور اصحابِ دوزخ کے امتیازی خصائص کے بارے میں ایک عمومی تصور قائم کرنے کے بعد اب ہم ان دو قطعی متضاد صفات کے بارے میں کلیدی لفظوں کے تفصیلی تجزیے کے لیے تیار ہیں۔ آئندہ ابواب کا موضوع یہی تجزیہ ہے۔

حواشی:

(۱) ڈوزی (Dozy)، محولہ بالا، ج ۱، ص ۱۳-۲۴۔

(۲) قَالَتِ الْأَعْرَابُ اٰمَنَّا۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ۔ (الحجرات:۱۴)

بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ ان سے کہہ دیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو، ہم اسلام لے آئے ہیں اور ایمان ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ أُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ (الحجرات:۱۵)

مومن صرف وہ ہیں، جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے اور اللہ کے راستے میں اپنے مال اور جان سے جہاد کیا اور یہ لوگ سچے ہیں۔

بنیادی تصورات
کا تجزیہ

باب ہفتم

کفر کے تصوّر کا تجزیہ

قرآن کریم میں مذکور اہم اخلاقی صفات کے تفصیلی بیان کے لیے ہم نے مثبت اقدار کی بجائے منفی قدر یعنی ''کفر'' کے تجزیے سے آغاز کیا ہے، کیونکہ مسلمہ طور پر کفر سب سے بڑا گناہ ہے۔ ہماری نظر میں منفی قدر سے بات شروع کرنا منہجِ تحقیق کے لحاظ سے بھی بے حد مفید ہے۔ نہ صرف یہ کہ 'کفر' تمام منفی اخلاقی اقدار کا بنیادی نقطہ ہے، بلکہ قرآنی اخلاقیات کے مجموعی نظام میں بھی اس کا مقام اتنا اہم ہے کہ اکثر مثبت صفات کے صحیح ادراک کے لیے اس کی معنویاتی تشکیل کو سمجھنا لازمی ہے۔ قرآنِ مجید کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کتاب میں 'کفر' کے تصور کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ انسانی اخلاق و کردار کے بارے میں کوئی آیت ہوگی جس میں اس کا حوالہ نہ ہو۔ ہمارے خیال میں تو دینِ اسلام کی اعلیٰ ترین قدر 'ایمان' کی معنوی اہمیت بھی ایمان کے براہِ راست تجزیے سے نہیں بلکہ اس کے منفی پہلو یعنی کفر کی اصطلاح کو سمجھنے سے واضح ہوتی ہے۔

'کفر' کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اس کے پیچیدہ معانی کے بارے میں بھی ہم کافی گفتگو کر چکے ہیں۔ آیئے ہم پہلے اجمالاً ان نکات کا اعادہ کر لیں جن پر بات ہو چکی ہے۔

۱۔ معنوی اعتبار سے کفر کے بنیادی اور غالب معنی 'چھپانا' ہیں۔ انعامات کے سیاق میں جن میں نعمتوں سے نوازنا اور ان سے بہرہ ور ہونا، دونوں مفہوم شامل ہیں، کفر کے بدیہی معنی یہ بنتے ہیں۔ 'چھپانا' یعنی جان بوجھ کر ان نعمتوں کو نظرانداز کرنا جن سے آدمی فائدہ اُٹھا رہا ہو، یا بالفاظِ دیگر 'ناشکراپن'، 'احسان فراموشی'۔

۲۔ قرآن اس بات پر بہت شدت سے زور دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خاص طور پر لطف و کرم کرنے والا ہے۔ اس کی مخلوق ہونے کے ناطے انسان کی ہر چیز حتیٰ کہ اس کا وجود بھی اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا مرہونِ منت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا فرض بنتا ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں کا، جو انسانی زندگی کے ہر ہر لمحے میں ظاہر ہو رہی ہیں، شکر ادا کرے۔ چنانچہ کافر ایسا انسان ہے جو اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں اور احسانات سے فائدہ اُٹھانے کے باوجود اپنے افعال و کردار سے کسی احسان مندی کا اظہار نہ کرے، بلکہ اس محسن و مربی کے خلاف بغاوت کا راستہ اختیار کیے رکھے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کے مقابلے میں ناشکری اور احسان فراموشی کے رویّے کا انتہائی واضح اظہار 'تکذیب' یعنی 'چیخ چیخ کر جھٹلانے' سے ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اللہ کے رسولؐ اور اس کے ذریعے بھیجے ہوئے پیغامِ الٰہی کو جھوٹ بتلانا۔

۴۔ چنانچہ اس طرح لفظ 'کفر' فی الواقعہ 'ایمان' کی عین ضد کے طور پر بہت کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ قرآنِ کریم میں 'مومن' (ماننے والا) اور 'مسلم' (سرِ تسلیم خم کرنے والا) کے متضاد سب سے زیادہ جو لفظ استعمال ہوا ہے، وہ یقیناً 'کافر' ہے۔

اس نکتے سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک طرف تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کفر کا لفظ ایمان کے مقابلے میں اتنی کثرت سے استعمال ہوا ہے کہ اس کا اصلی معنوی عنصر یعنی 'ناشکراپن' بتدریج نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور 'عدم ایمان' یا 'نہ ماننے' کا مفہوم زیادہ غالب آتا گیا، حتیٰ کہ بالآخر اب عام طور پر یہ لفظ دوسرے معنوں ہی میں استعمال ہونے لگا اور اس سیاق و سباق میں 'شکر' کا مفہوم بالکل بے محل لگتا ہے۔ انتہائی محتاط طریقے سے کم از کم یہ کہا جا سکتا ہے کہ درحقیقت قرآنِ کریم میں کفر کا لفظ 'شکرگزاری' کی بجائے 'ایمان' اور 'عقیدہ' کے متضاد مفہوم میں زیادہ استعمال ہوا ہے۔ دوسری جانب اسی نکتے کی بنیاد پر یہ قیاس بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس معنویاتی اصول کی رُو سے کہ معانی اپنے قریبی الفاظ سے متاثر ہوتے ہیں، لفظ 'ایمان' بھی 'کفر' کے اصلی معنی یعنی 'ناشکراپن' سے شدت سے متاثر ہوا ہوگا۔

۵۔ لفظ 'کفر' کا ایک مفہوم ہے 'انسان کا اپنے خالق سے انکار'۔ قرآنِ کریم میں

یہ مفہوم خاص طور پر تکبر، غرور اور خود پسندی جیسے مختلف الفاظ کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے۔ استکبر (غرور کی وجہ سے بڑا بننا) اور استغناء (خود کو مطلقاً آزاد اور مختار سمجھنا) اور اسی طرح کے کئی الفاظ ہیں، جن کا ذکر آئندہ آئے گا۔ اس سیاق میں کفر 'تضرع' یعنی عاجزی کے عین برعکس ہے اور تقویٰ سے بھی متصادم ہے، جو یقیناً دین کے اسلامی تصور کا مرکزی عنصر ہے۔

اجمالی طور پر کفر کے مفہوم کے ان بنیادی نکات کو سب تسلیم کرتے ہیں۔ ذیل میں ہم قرآنِ کریم کی ان آیات کا تفصیلی جائزہ پیش کریں گے، جن میں کفر کا لفظ استعمال ہوا ہے اور اس کے ساتھ اس استعمال کا معنوی تجزیہ بھی کریں گے۔

۱۔ کفر کے مفہوم میں ناشکرے پن کا عنصر:

اس سے پہلے ہم لفظ 'کفر' کی ایک مثال دے چکے ہیں۔ سورۃ الشعراء (۲۶) میں لفظ 'کافر' کا سیاق دین و ایمان نہیں ہے۔[۱] درحقیقت یہ آیت 'کفر' کے غیر دینی مفہوم[۲] کی نہایت عمدہ مثال ہے، کیونکہ اس میں کفر کے معانی میں ناشکرے پن کا اساسی عنصر بہت واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ اس اصطلاح کے دینی سیاق میں استعمال کے تجزیے کے لیے ہم ایک نہایت اہم مثال سے بات شروع کریں گے۔ یہ آیت بہت نادر قسم کی ہے، کیونکہ یہاں کفر کا حوالہ خدا کے بارے میں انسانی رویّے سے نہیں، بلکہ اس کے بالکل برعکس یہاں کفر کا حوالہ اللہ تعالیٰ کا انسانوں کے بارے میں ایسے رویّہ سے ہے جو قطعاً ممکن نہیں کہ اللہ انسانوں سے یہ سلوک کرے۔ اس آیت سے اس عجیب حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ جس طرح انسان کا یہ دینی فریضہ ہے کہ وہ خدا کے فضل اور انعام کے حوالے سے اس کا شکر گزار ہو، اسی طرح خدا کی اپنی نیکی اور خیر کی صفت کا تقاضا ہے کہ وہ انسان کے ان اعمالِ صالحہ پر اس کا شکریہ (قدردانی) ادا کرے جو اس نے خدا کے پیغمبر کی دعوت پر ایک مومن کی حیثیت سے سرانجام دیے۔ اللہ تعالیٰ ایک مخلص مومن کے نیک اعمال کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا بلکہ وہ احسان مندی کے ساتھ ان کو قبول کرتا ہے اور انسان کے لیے ان کا حساب رکھتا ہے۔

وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ۔ (البقرۃ:۱۵۸)

جو بھی اپنے طور پر نیکی کا کام کرتا ہے، یقیناً اللہ اس کا شکرگزار ہے۔ وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

چنانچہ شکرگزاری کا جذبہ دونوں جانب سے ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بہت واضح طور پر بندے کو جنت کی نعمتیں عطا کر کے اپنی شکرگزاری (قدردانی) اور عدم کفران کا اظہار کریں گے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ۔ (الانبیاء:۹۴)

جو کوئی بھی نیکی کا کام کرتا ہے اور وہ مومن ہے تو اس کی کوشش کو ناشکری کی نذر نہیں کیا جائے گا، ہم اسے اس کے لیے لکھ لیتے ہیں۔

سادہ الفاظ میں اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی نیکی کو رائیگاں نہیں جانے دیں گے، بلکہ اس کا بدلہ بہت فیاضی سے دیں گے۔ اگر آیت کے معانی اس شکل میں بیان کیے جائیں تو اس کی ندرت ختم ہو جاتی ہے اور یہ قرآن کی عام آیتوں میں سے ایک آیت نظر آتی ہے۔ لیکن اس آیت کی خصوصی ندرت جو ہمارے نزدیک اس کی معنوی اہمیت ہے، اس بات میں ہے کہ اس میں ایک بہت ہی بنیادی خیال کو کفر کی اصطلاح میں بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ آیت اس بات کی شہادت فراہم کرتی ہے کہ کفر کا اصلی مفہوم 'ناشکراپن' ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس بنیادی مفہوم میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے اس امکانی رویّے کے لیے بھی بولا جا سکتا ہے، جس کے وقوع کی یہاں تردید کی جا رہی ہے۔

مندرجہ بالا آیت کے برعکس، ذیل میں جن آیات کی مثالیں دی جا رہی ہیں، ان سب کا تعلق اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے بارے میں انسانی رویّے سے ہے۔ اپنی لامحدود مشیت کے تحت اللہ تعالیٰ انسان کو اپنی لامتناہی نعمتوں سے نوازتا رہتا ہے، لیکن انسان ناشکرے پن پر اڑا رہتا ہے۔

أَلَمْ تَرَإِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَالْبَوَارِ۔ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ۔ (ابراهيم: ۲۸-۲۹)

کیا تو نے ان لوگوں کونہیں دیکھا، جنھوں نے اللہ کی نعمتوں کے بدلے میں ناشکری کا اظہار کیا اور اپنے لوگوں کو ہمیشہ کے لیے ہلاکت کے گھر یعنی جہنم میں پہنچا دیا، وہ اس میں جلیں گے اور کتنا برا ٹھکانہ ہے۔

مندرجہ ذیل دو آیات میں ''کفر'' صریح طور پر ''شکر'' کے متناقض استعمال ہوا ہے۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَأْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللّٰهِ فَأَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُوْنَ۔ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُوْلٌ مِنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظَالِمُوْنَ۔ فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ۔ (النحل: ۱۱۲-۱۱۵)

اور اللہ تعالیٰ ایک بستی والوں کی مثال بیان فرماتے ہیں کہ وہ امن و اطمینان میں تھے، ان کے کھانے پینے کی چیزیں بڑی فراغت سے ہر چہار طرف سے ان کے پاس پہنچا کرتی تھیں، سو انھوں نے خدا کی نعمتوں کی بے قدری (ناشکری) کی، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی حرکات کے سبب ایک محیط قحط اور خوف کا مزا چکھایا۔ ان کے پاس ان ہی میں سے ایک رسول بھی آیا، اس کو اُنھوں نے جھٹلایا، تب ان کو عذاب نے آ پکڑا۔ وہ بالکل ہی ظلم پر کمر باندھنے لگے۔ جو چیزیں اللہ نے تم کو حلال اور پاک دی ہیں، ان کو کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر کرو۔ اگر تم

اسی کی عبادت کرتے ہو۔

فَاذْكُرُوْنِیْ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِی وَلَاتَكْفُرُوْنِ۔
(البقرة:۱۵۲)

تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا۔ تم میرا شکر ادا
کرو، اور ناشکری نہ کرو۔

اگر مصیبت اور آزمائش کے حوالے سے انسانی رویّے کا مشاہدہ کیا جائے تو مزید واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کی طبیعت میں کفر (ناشکرے پن) کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ مندرجہ ذیل پہلی دو آیات میں کفر کا لفظ 'کفور' کے صیغے کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ اس صیغے کے متعلق علامہ بیضاوی کا کہنا ہے کہ یہ مبالغے کا صیغہ کفر کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔[۳] اور ایسے لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جو تمام نعمتوں سے بہرہ مند ہونے کے باوجود انہیں تو مطلقاً بھول جائیں، لیکن معمولی سی تکلیف کی یاد اُن کے حافظے میں نقش رہے۔

رَبُّكُمُ الَّذِی یُزْجِی لَكُمُ الْفُلْكَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِن
فَضْلِهِ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِیمًا۔ وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ
مَن تَدْعُونَ اِلَّا اِیَّاهُ فَلَمَّا نَجّٰكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ وَكَانَ
الإِنْسَانُ كَفُوْراً۔ (بنی اسرائیل:٦٦-٦٧)

تمہارا رب وہ ہے، کہ تمہارے لیے کشتی کو سمندر میں
لے چلتا ہے، تاکہ تم اس کے (رزق اور) فضل کی تلاش کرو۔
بے شک وہ تمہارے حال پر بہت مہربان ہے، اور جب تم کو
سمندر میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بجز خدا کے جتنوں کی تم عبادت
کرتے تھے، سب غائب ہو جاتے ہیں، پھر جب وہ تم کو خشکی کی
طرف بچا کر لے آتا ہے، تو تم پھر (بدستور) پھر جاتے ہو، اور
انسان ہے ہی بہت ناشکرا۔

وإِنَّا اِذَآ اَذَقْنَا الإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا وَإِن

تُصِبهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيدِيهِم فَإِنَّ الإِنْسَانَ كَفُورٌ۔
(الشوری:٤٨)

اور جب ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازتے ہیں، تو وہ اس پر خوش ہو جاتا ہے اور اگر ان پر ان کے اپنے اعمال کے بدلے میں جو پہلے اپنے ہاتھوں کر چکے ہیں، کوئی مصیبت آتی ہے تو آدمی ناشکرا ہو جاتا ہے۔

فَاذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجّٰهُم اِلَى البَرِّ اِذَاهُم يُشرِكُونَ۔ لِيَكْفُرُوا بِمَا اٰتَيْنٰهُم وَلِيَتَمَتَّعُوا فَسَوفَ يَعْلَمُونَ۔ (العنكبوت: ٦٥-٦٦)

جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں، تو خالص اعتقاد کے ساتھ اللہ کو پکارنے لگتے ہیں۔ جب اللہ انہیں بچا کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو فوراً ہی شرک کرنے لگتے ہیں، چنانچہ جو نعمت ہم نے ان کو دی ہے، اس کی ناشکری (ناقدری) کرتے ہیں اور یہ لوگ چندے اور فائدہ اُٹھالیں، پھر عنقریب ان کو سب پتہ لگ جائے گا۔

وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُنِيبِينَ إِلَيهِ ثُمَّ إِذَا أَذَاقَهُم مِنْهُ رَحْمَةً إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُم بِرَبِّهِمْ يُشرِكُونَ۔ لِيَكْفُرُوا بِمَآ آتَيْنٰهُمْ فَتَمَتَّعُوا فَسَوفَ تَعلَمُونَ۔ (الروم: ٣٣-٣٤)

اور جب انسانوں کو تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارنے لگتے ہیں پھر جب اللہ اپنی رحمت سے بہرہ اندوز کرتا ہے تو ان میں سے بعض اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتے ہیں، حتیٰ کہ ہم نے ان کو جو کچھ دیا، اس کی ناشکری کرتے ہیں۔ تو تم فائدہ اُٹھا لو، پھر عنقریب تم کو سب پتہ لگ جائے گا۔

وَمَا بِكُم مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ۔ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْئَرُوْنَ۔ ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ۔ لِيَكْفُرُوا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ۔ (النحل:۵۳-۵۵)

اور تمہارے پاس جو کچھ بھی نعمت ہے، وہ سب اللہ کی طرف سے ہے، پھر جب تم کو تکلیف پہنچتی ہے، تو اس سے فریاد کرتے ہو۔ تو پھر جب وہ اس تکلیف کو تم سے دُور کر دیتا ہے تو تم میں سے بعض اپنے رب کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ ہماری دی ہوئی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔ تو چندے اور فائدہ اُٹھا لو، پھر عنقریب تم کو سب پتہ لگ جائے گا۔

بعض اوقات اللہ تعالی اپنے انعامات کی فہرست بہت تفصیل سے دیتے ہیں اور انہیں آیات (آیت: نشانی کی جمع) کہہ کر یاد کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس کی طرف سے اتنے کرم کے باوجود اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کے شکر کا فریضہ ادا کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل آیت میں یہ بات غور طلب ہے کہ انسان کو بے انصاف اور بدمعاملہ (ظلوم)[۴] قرار دیا ہے، کیونکہ اللہ کی نعمتوں کے بارے میں اس کا رویہ 'کفر' کا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهٰرَ۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ۔ وَآتٰكُم مِّنْ كُلِّ مَاسَأَلْتُمُوهُ، وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَاتُحْصُوهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ۔ (ابراهيم:۳۲-۳۴)

اللہ وہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا، جس کی وجہ سے پھلوں کی صورت میں

تمہارے لیے رزق پیدا کیا۔ اس نے تمہارے لیے کشتی کو مسخر کر دیا تاکہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلے، اور دریاؤں کو بھی تمہارے لیے مسخر کر دیا جو ہمیشہ چلتے ہی رہتے ہیں، اور تمہارے لیے دن اور رات کو بھی مسخر کر دیا، جو چیز تم نے مانگی تمہیں دی اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار کرنے لگو تو گن نہیں سکو گے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ انسان بہت ہی بے انصاف اور بہت ہی ناشکرا ہے۔

مندرجہ ذیل آیات سے یہ بات مزید صراحت کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان پر اپنے انعامات کے بدلے میں توقع کرتے ہیں کہ انسان اس کا شکرگزار ہو۔ وہ جزئی تفصیلات کے ساتھ اپنے فضل وکرم کا ذکر کرتے ہیں کہ یہ سارے انعامات اس لیے ہیں کہ شاید انسان شکرگزار ہو۔ لیکن انسان اللہ کی نعمتوں کا صریح اقرار کرنے کے باوجود ان کا انکار کرتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پھر یہ نتیجہ پیش کرتے ہیں کہ انسانوں میں سے اکثر کافر (ناشکرے) ہیں۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـــًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔ اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَاۗءِ ۭ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۔ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (النحل: ۷۸-۸۳)

''اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس نے تم کو کان دیئے اور آنکھیں اور دل تا کہ شاید تم شکر کر سکو۔ کیا تم نے پرندوں کو نہیں دیکھا کس طرح آسمان کی فضا میں مسخر ہیں اور ان کو اللہ کے سوا کوئی نہیں تھامتا۔ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں (دلائل) ہیں جو ایمان والے ہیں۔ اللہ نے تمہارے لیے تمہارے گھروں کو رہنے کی جگہ بنایا اور تمہارے لیے جانوروں کی کھالوں کے گھر بنائے، جن کو تم کُوچ کے دن اور پڑاؤ کے دن ہلکا پاتے ہو۔ اور ان کی اون، رُوؤں اور ان کے بالوں سے گھر کا سامان اور ایک مدت کے لیے فائدے کی چیزیں بناتے ہو۔ اللہ نے تمہارے لیے بعض مخلوقات کے سائے بنائے۔ تمہارے لیے پہاڑوں میں پناہ گاہیں بنائیں، تمہارے لیے ایسے کُرتے (لباس) بنائے جو گرمی سے تمہاری حفاظت کرتے ہیں اور ایسے کرتے (لباس) بنائے جو لڑائی میں تمہاری حفاظت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنی نعمتیں تم پر پوری کرتا ہے، تا کہ تم فرمانبردار رہو۔ پھر اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو آپ کے ذمے تو صاف صاف پیغام پہنچا دینا ہے۔ یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کو پہچانتے ہیں، پھر ان سے انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر ناشکرے ہیں۔

اس فصل کے آخر میں ہم اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں ایک اور زور دار لفظ کَنُود بھی استعمال ہوا ہے، جس کے تقریباً وہی معنی ہیں جو کفور کے ہیں۔ کَنُود کا مادہ 'ك ن د' ہے، جس کے معنی ہیں 'احسان فراموش ہونا'، 'انعام کی وصولی کا تسلیم کرنے سے انکار کرنا'۔ اس لفظ کے استعمال کے سیاق و سباق سے اس کے مرادی معنی یہ بنتے ہیں کہ 'انسان دولت کا لالچ کر کے اور دوسروں سے

حسد کر کے ناشکرے پن کا اظہار کرتا ہے، حتیٰ کہ جو کچھ اس کے پاس ہے، اس کا عشر عشیر بھی دوسروں کے پاس ہو تو اس پر کڑھنے لگتا ہے۔' اگر انسان انعامِ الٰہی کا کچھ حصہ غریبوں اور ضرورت مندوں کو دے دے تو یہ اللہ تعالیٰ کے انعام وفضل پر احسان مندی کا اظہار ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْد۔ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ۔
وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ۔ (عادیات:٦-٨)

بے شک انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے، وہ خود اس بات کا گواہ ہے اور وہ اچھی چیزوں (مال و دولت) کی محبت بہت شدت سے کرتا ہے۔

۲۔ کفر بمقابلہ ایمان:

قرآنِ کریم میں لفظ 'کفر' ناشکراپن اور بے ایمانی دونوں معانی میں استعمال ہوا ہے۔ صحیح بخاری میں ایک عجیب حدیث مذکور ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ صدرِ اسلام میں جب سیاق سے یہ واضح نہ ہو کہ لفظ کفران دونوں میں سے کس معنی میں استعمال ہوا ہے تو صحابہ اس لفظ کے مفہوم میں بہت وسعت سے کام لیتے تھے۔

''پیغمبر ﷺ نے فرمایا: مجھے آگ دکھائی گئی (یعنی میں نے خواب میں دوزخ کو دیکھا)۔ اور خبردار! اس میں جھونکے جانے والوں میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی، جنھوں نے (اس دنیا میں) کفر کا رویّہ اختیار کیا تھا۔ پوچھا گیا، کیا اس کا مطلب ہے کہ وہ خدا پر ایمان نہیں لائی تھیں؟ فرمایا: نہیں کفر سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے خاوندوں کی ناشکرگزار تھیں اور ان کے احسانات کے جواب میں احسان فراموشی سے کام لیتی تھیں۔''(۵)

اس حدیث کی تشریح میں کرمانی لکھتے ہیں کہ یہاں کفر کا صیغہ دو مختلف مصادر کے حوالے سے استعمال ہوا ہے، ایک کفر دوسرے کفران۔ کفر ایمان کی ضد ہے اور 'کفران' اکثر شکر کی ضد کے طور پر نعمت کی ناشکری کے معنوں میں استعمال ہوتا

ہے۔ (۶)

الغرض اس میں شک نہیں کہ قرآنِ کریم میں کفر کا لفظ ان دو مختلف مفاہیم میں استعمال ہوا ہے، بلکہ بعض اوقات تو یہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کہاں کونسا معنی مراد ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں کہ قرآنی مفہوم میں یہ دونوں معانی ایک مضبوط تصوراتی رشتے میں بندھے ہیں۔ یہ سمجھنے کے لیے یاد رکھنا چاہیے کہ آیاتِ الٰہی یا اللہ کی نشانیاں جنہیں ہم نے سابقہ فصل میں زیادہ تر ایسے انعام کے طور پر بیان کیا جو اللہ نے بندوں پر کیے ہیں۔ یہ انعام اس بات کے متقاضی ہیں کہ بندہ احسان مند اور شکر کا رویہ اختیار کرے۔

ان انعامات کو اللہ کی قدرت و جلال کے اظہار سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس نئے مفہوم میں آیت یا نشانی کا فطری تقاضا ہے کہ انسان کے ذہن میں حیرت اور خوف پیدا ہو جو اسے خدا پر ایمان لانے پر آمادہ کرے۔ جو ایسا نہ کرے وہ کافر ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ۔ (آلِ عمران: ۷۰)

اے اہلِ کتاب، اللہ کی نشانیوں (آیات) کا انکار (کفر) کیوں کرتے ہو؟ تم تو خود اس کے گواہ ہو۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ، فَاَبٰى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا۔ (بنی اسرائیل: ۸۹)

ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے ہر قسم کی امثال (تشبیہات) بیان کی ہیں۔ پھر بھی اکثر لوگ انکار کیے بغیر نہ رہے۔

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ، اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ۔ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ۔ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَحْفُوْظًا وَهُمْ عَنْ

آيتها مُعرضُون۔ (الانبیاء: ۳۰-۳۲)

کیا یہ لوگ انکار کرتے ہیں، یہ نہیں دیکھتے کہ آسمان اور زمین ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے، پھر ہم نے ان دونوں کو کھول کر علیحدہ کر دیا اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا۔ کیا یہ پھر ایمان نہیں لائیں گے، اور ہم نے زمین پر مضبوط پہاڑ گاڑ دیے تاکہ زمین ان کے ساتھ ہلنے نہ لگے اور ہم نے ان پہاڑوں میں کھلے راستے بنائے تاکہ لوگ راہ پا سکیں اور ہم نے آسمان کو ایک مضبوط چھت بنایا اور یہ لوگ ان کی نشانیوں سے پھر بھی پھرے ہوئے ہیں۔

كيف تكفُرُون باللّه وكُنتُم أمواتا فأحياكُم ثُمّ يُميتُكُم ثُمّ يُحييكُم ثُمّ إليه تُرجعُون۔ (البقرۃ:۲۸)

تم اللہ کا انکار کیسے کرتے ہو، جب کہ تم بے جان تھے، اس نے جان ڈالی۔ پھر وہ تمہیں مارے گا، پھر زندہ کرے گا اور تم اسی کی طرف لوٹو گے۔

بعض اوقات کفر کا تعلق آخرت اور حشر کے عقیدے سے ہوتا ہے جو اسلام کی بنیادی تعلیمات ہیں، یہاں کفر کا مطلب ہے اس عقیدے کو بالکل فضول اور تخیلاتی قرار دے کر اسے قبول کرنے سے انکار کرنا۔ یہاں کفر کا تعلق شکر گزاری کے جذباتی ردعمل سے ہرگز نہیں ہے، بلکہ اس سوال سے ہے کہ آیا عقیدۂ آخرت عقلی طور پر قابل قبول ہے؟ کافر وہ لوگ ہیں جو اس مسئلے میں صریحاً عقل کا ساتھ دیتے ہیں اور وحی کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

وقالوا إن هي إلّا حياتُنا الدُّنيا وما نحن بمبعُوثين۔ ولو ترى إذ وُقفُوا على ربّهم، قال أليس هذا بالحق، قالُوا بلى وربّنا قال فذُوقُوا العذاب بما كُنتُم تكفُرُون۔ (الانعام: ۲۹-۳۰)

اور وہ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی صرف اس دنیا کی ہے
اور ہم دوبارہ زندہ نہیں کیے جائیں گے، اگر تم دیکھو جب وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے، اللہ پوچھے گا، کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟ تو وہ کہیں گے، بے شک ہمارے رب کی قسم! اللہ کہے گا کہ تم جو انکار کرتے رہے، اب اس کا عذاب چکھو۔

ءَ إِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًاء إِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيْدًا أَوَلَمْ يَرَوا أَنَّ اللّٰهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ قَادِرٌ عَلَى أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُم وَجَعَلَ لَهُم أَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيهِ فَأَبَى الظّٰلِمُونَ إِلَّا كُفُورًا۔ (بنی اسرائیل: ۹۸-۹۹)

ہم جب ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، تو کیا ہمیں از سرنو پیدا کر کے زندہ کیا جائے گا؟ کیا یہ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ جس اللہ نے آسمان اور زمین پیدا کیے، وہ کیا اس بات پر قادر نہیں کہ وہ ان جیسے لوگ پیدا کر سکے اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اس نے ان کے لیے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے۔ اس پر بھی ظالم لوگ انکار کیے بغیر نہیں رہتے۔

وَإِنْ تَعْجَبْ قَوْلُهُم ءَإِذَا كُنَّا تُرَابًاء إِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيْدٍ أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا بِرَبِّهِم وَأُولٰئِكَ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِم وَأُولٰئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ هُم فِيهَا خٰلِدُونَ۔ (الرعد: ۵)

اگر آپ کو تعجب ہے تو واقعی ان کا کہنا عجیب ہے کہ جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا از سرنو پیدا کیے جائیں گے؟ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کا انکار کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق ڈالے جائیں گے۔ اور یہ لوگ دوزخ والے ہیں، جہاں یہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

ان کا عقیدہ کفر، حشر و آخرت سے انکار تک محدود نہیں، انہیں ہر دم شک کا

کانٹا چبھتا رہتا ہے اور ہر ایسی چیز کو مشکوک قرار دیتے رہتے ہیں، جو ان کی دانست میں اس تصور کے متضاد ہے، جسے وہ معقول سمجھتے ہیں۔ وہ پیدائشی طور پر شک کرنے والے ہیں، شک کے جس رویے سے یہ لوگ متصف ہیں، وہ ایمان کے اس عمل کی قطعی ضد ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کو غیر مشروط طور پر تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ وہ ایک ایسے آدمی کو اللہ کا رسول ماننے کو تیار نہیں جو انہی میں سے ایک ہے، جو عام خوراک کھاتا ہے اور انہی کی طرح چلتا پھرتا ہے۔ ان کے شکی ذہن کے لیے یہ بات عقل کے خلاف لگتی ہے اور ایسا عام آدمی جو کسی شرف و وقار کا دعویٰ نہیں رکھتا خود کو پیغمبرانہ اقتدار سے کیسے منسوب کر سکتا ہے۔ کیا ہم اپنے میں کے ایک عام آدمی کی اطاعت کریں؟ تب تو ہم یقیناً غلطی پر ہیں۔ کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم سب میں سے ایک آدمی پر وحی نازل ہو؟ نہیں یہ شخص ضرور جھوٹا اور برخود غلط ہے۔ (۴۹:۲۴-۲۵)

چنانچہ جب یہ شخص دعویٰ کرتا ہے کہ خدا صرف ایک ہے اور باقی تمام خدا صرف (لوگوں کے رکھے ہوئے) نام ہیں تو غیظ و غضب کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، کیونکہ جو عقیدہ یہ شخص پیش کر رہا ہے، وہ بت پرستوں کے لیے بے معنی اور فضول بات سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

وَعَجِبُوا أَنْ جَآءَهُم مُّنذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكٰفِرُونَ هٰذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ أَجَعَلَ الْأٰلِهَةَ إِلٰهًا وٰحِدًا إِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ۔

(ص ٤-٥)

اور ان لوگوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا کہ ان کے پاس ایک ڈرانے والا آیا ہے اور یہ منکر لوگ کہتے ہیں کہ یہ جادوگر ہے، جھوٹا ہے۔ کیا اس نے اتنے خداؤں کا ایک خدا بنا دیا ہے؟ واقعی یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔

ان مثالوں سے یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ کفر کے معنی اللہ اور وحی سے انکار ہے۔ ذیل میں ہم ان بے شمار آیات میں سے جن میں کفر کا لفظ استعمال ہوا ہے، مثال کے طور پر چند کا ذکر کریں گے۔ جو ایمان اور کفر کے درمیان معنوی تضاد کو

خصوصی طور پر صراحت سے بیان کرتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر ان آیات میں کفر، ''شکرگزاری'' کی بجائے ''ایمان'' کے متضاد کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُم كُفَّارًا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِم مِنْ بَعْدِ مَاتَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ۔ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (البقرة: ۱۰۹)

ان اہلِ کتاب میں سے اکثر دل سے چاہتے ہیں کہ تمھیں ایمان لانے کے بعد پھر سے کافر بنا ڈالیں، محض اپنے دلی حسد کی بنا پر جب کہ سچی بات ان پر واضح ہو۔ ان کو معاف کر دو اور درگزر کر دو، تا کہ اللہ اپنے حکم کے ساتھ آئے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَآءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ، وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ۔ (آلِ عمران: ۸٦)

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت دے، جنھوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا۔ اُنہوں نے اقرار کیا تھا کہ رسول سچا ہے اور ان تک واضح دلائل پہنچ چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ، وَأُولٰئِكَ هُمُ الضَّآلُّونَ۔ (آلِ عمران: ۹۰)

بے شک جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا، پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے، ان کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی۔ یہ لوگ تو گمراہ ہیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِي

بین یدیہ ولو تری إذ الظّٰلمون موقوفون عند ربّھم یرجع بعضھم الٰی بعض القول یقول الّذین استضعفوا للّذین استکبروا لولا انتم لکنّا مؤمنین۔ (سبا: ۳۱)

اور کافروں نے کہا ہم اس قرآن پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اور نہ اس سے پہلی کتابوں پر۔ اور اگر آپ ان ظالموں کو اس وقت دیکھ لیں، جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے ہوں گے تو یہ بات ایک دوسرے پر ڈالیں گے۔ کمزور لوگ طاقتوروں سے کہیں گے، اگر تم نہ ہوتے تو ہم تو مومن ہوتے۔

فلمّا جآء ھم ما عرفوا کفروا بہ، فلعنۃ اللّٰہ علی الکٰفرین، بئسما اشتروا بہ انفسھم ان یّکفروا بما انزل اللّٰہ بغیا ان ینزّل اللّٰہ من فضلہ علی من یّشآء من عبادہ فبآءو بغضب علی غضب و للکٰفرین عذاب مّھین۔ و اذا قیل لھم اٰمنوا بما انزل اللّٰہ قالوا نؤمن بما انزل علینا ویکفرون بما ورآءہ۔ و ھو الحقّ مصدّقا لما معھم۔ (البقرۃ: ۸۹-۹۱)

جب ان کے پاس وہ چیز آ گئی، جسے وہ جانتے تھے، تو ان کا انکار کر دیا۔ کافروں پر اللہ کی لعنت۔ انہوں نے اپنی جانوں کا کتنا برا سودا کیا ہے کہ وہ اللہ کی نازل کردہ سچائی سے انکار کرتے ہیں، محض اس ضد میں کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اپنا فضل نازل کرتا ہے۔ وہ اپنے پر غضب پر غضب لاتے رہے، اور کافروں کے لیے ذلت آمیز عذاب ہے۔ جب ان سے کہا جائے کہ جو اللہ نے بھیجا ہے، اس پر ایمان لے آؤ، وہ کہتے ہیں، ہم تو اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل ہوا اور اس کے علاوہ کسی چیز کو نہیں مانتے۔ حالانکہ یہ وہ سچائی ہے جو اس کی بھی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس ہے۔

۳۔ کافر دل:

قرآن کریم کی متعدد آیات میں کافر کی ذہنی حالت بیان کی گئی ہے۔ ان آیات میں کفر کی ذہنی ساخت کے ذکر میں مندرجہ ذیل امتیازی خصوصیات بہت اہم ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ یاد رکھیے کہ مومن کے قلوب کی یہ خاصیت بیان کی گئی ہے کہ وہ اللہ کے ذکر میں اطمینان اور سہانا سکون پاتے ہیں۔

"اَلَّذِينَ آمَنُوا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللّٰهِ أَ لَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ۔ (الرعد:۲۸)

جو لوگ ایمان لائے، اُن کے دل اللہ کے ذکر میں اطمینان پاتے ہیں، بلکہ اللہ کے ذکر میں ہی ان کے دِلوں میں آرام اور سکون ملتا ہے۔

قلبِ مومن کی اس پُرسکون اور مطمئن حالت کے برعکس کافر کے دل کو اکثر پتھر کی طرح سخت بیان کیا گیا ہے۔ "قَسَتْ قُلُوبُهُم" (اُن کے دل سخت ہیں یا سخت ہو گئے ہیں) کا جملہ قرآنِ کریم میں بار بار کافر کے دل کی کیفیت بیان کرنے کے لیے ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتا ہے یعنی یہ ایسے دل ہیں کہ جو اللہ کی دعوت کو اپنی ضد سے ٹھکرا دیتے ہیں، حالانکہ اس آواز سے پہاڑ تک ہل جاتے ہیں اور زمین تک پھٹ جاتی ہے۔ (۱۳:۳۰)، اور اگرچہ ہم نے ان کے پاس فرشتے بھی بھیجے ہیں اور مردہ لوگوں نے بھی ان سے باتیں کی ہیں۔ (۶:۳)

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهٰرُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ۔ (البقرة:۷٤)

پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے گویا وہ پتھر ہیں یا اُن سے بھی زیادہ سخت اور پتھر تو بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ

اُن میں سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں اور بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ
پھٹ جاتے ہیں اور اُن میں سے پانی نکلنے لگتا ہے، اور بعضے ایسے
ہوتے ہیں کہ خدا کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور خدا تمہارے
عملوں سے بے خبر نہیں۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً۔

(المائدہ: ۱۳)

تو ان لوگوں کے عہد توڑ دینے کے سبب ہم نے ان پر
لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔

یاد رہے کہ آخری آیت میں دلوں کے سخت ہونے کو اللہ نے اپنی مشیت کی طرف منسوب کر کے یہ بتایا ہے کہ کافروں کو ان کے کیے کا حساب دینا ہوگا۔ یہ نکتہ جبر و قدر (تقدیر اور اخلاقی آزادی) کے نظریے سے تعلق رکھتا ہے، مسلمانوں کے ہاں علم الکلام میں اس سوال پر ہمیشہ جدل و مناظرہ کا بازار گرم رہا ہے کہ کیا تمام برائیاں (شر) جن میں کفر بھی شامل ہے، اللہ کی طرف منسوب کی جا سکتی ہیں؟ جہاں تک قرآنِ کریم کا تعلق ہے، وہ اس سوال پر بحث نہیں کرتا۔ قرآنی آیات جن میں اس نازک مسئلے کا ذکر ہے، ان کی تعبیر دونوں طرح سے کی جا سکتی ہے۔ اس بظاہر نظری معمے کا حل ہمارے موضوع کے دائرہ کار سے بھی خارج ہے۔

کافر کے دل کی دوسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ (فِي اَكِنَّةٍ) یعنی اس پر مکمل پردہ یا جزوی پردہ (حجاب) ہے جو اسے وحی الٰہی سے الگ رکھتا ہے۔

كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔ بَشِيْرًا
وَّنَذِيْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ۔ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْ
اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ وَفِيْۤ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ
فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ۔ (حم السجدہ: ۳-۵)

(ایسی) کتاب جس کی آیتیں واضح (المعانی) ہیں

(یعنی قرآنِ عربی ان لوگوں کے لیے جو سمجھ رکھتے ہیں، جو بشارت بھی سناتا ہے اور خوف بھی دلاتا ہے، لیکن ان میں سے اکثروں نے منہ پھیر لیا اور وہ سنتے ہی نہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جس چیز کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو، اس سے ہمارے دل پردوں میں ہیں اور ہمارے کانوں میں بوجھ (یعنی بہرا پن) ہے اور ہمارے اور تمہارے درمیان پردہ ہے تو تم (اپنا) کام کرو ہم (اپنا) کام کرتے ہیں۔

وَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَةِ حِجَاباً مَّسْتُوْرًا۔ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا۔ (بنی اسرائیل: ٤٥-٤٦)

اور جب تم قرآن پڑھا کرتے ہو تو ہم تم میں اور ان لوگوں میں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، حجاب پر حجاب کر دیتے ہیں، اور ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں کہ اسے سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں میں ثقل پیدا کر دیتے ہیں۔ اور جب تم قرآن میں اپنے پروردگار یکتا کا ذکر کرتے ہو تو وہ بدک جاتے ہیں اور پیٹھ پھیر کر چل دیتے ہیں۔

اسی بات کو قرآن کریم میں مختلف پیرایوں سے بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً اس بات کو ''دلوں پر مہر'' کے استعارے سے اس طرح کہا گیا:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ (البقرة: ٦-٧)

جو لوگ کافر ہیں، انہیں تم نصیحت کرو یا نہ کرو، ان کے لیے برابر ہے، وہ ایمان نہیں لانے کے، خدا نے ان کے دلوں

اور کانوں پر مُہر لگا رکھی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ (پڑا ہوا) ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب (تیار) ہے۔ اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، حالانکہ وہ ایمان نہیں رکھتے۔

رَضُوْا بِاَنْ یَّکُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ (التوبہ:۹۳)

(یعنی) اس بات سے خوش ہیں کہ عورتوں کے ساتھ جو پیچھے رہ جاتی ہیں (گھروں میں بیٹھ) رہیں۔ خدا نے ان کے دلوں پر مُہر کر دی ہے، پس وہ جانتے ہی نہیں۔

رَضُوْا بِاَنْ یَّکُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَفْقَهُوْنَ۔ (التوبہ:۸۷)

یہ اس بات سے خوش ہیں کہ عورتوں کے ساتھ جو پیچھے رہ جاتی ہیں (گھروں میں بیٹھ) رہیں، ان کے دلوں پر مُہر لگا دی گئی ہے، مگر یہ سمجھتے ہی نہیں۔

یا پھر اس بات کو یہ کہہ کر بیان کیا گیا ہے کہ ان کے دلوں پر تالے پڑے ہیں:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۔ (محمد:۲٤)

بھلا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا (اُن کے) دلوں پر قفل لگ رہے ہیں۔

یا پھر اسے یوں بیان کیا گیا کہ دل پر آہستہ آہستہ زنگ لگ گیا ہے۔

کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ۔ (المطففین:۱٤)

ہرگز نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر اعمالِ بد کی وجہ سے زنگ بیٹھ گیا ہے۔

اللہ کی نازل کردہ آیات میں جو گہرے معانی پوشیدہ ہیں، انہیں اہلِ دل (ق:۳۷) آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی وحی کے الفاظ ان کی یادوں کو زندہ کر ڈالتے ہیں، لیکن کفار جن کے دل پردوں اور رکاوٹوں کی وجہ سے کسی شئے کی دینی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتے، وہ آیاتِ الٰہی کے سامنے اندھے اور بہرے ہیں۔ کافر کی خصوصیات اور امتیازی صفات بیان کرنے کے لیے قرآنِ کریم میں اندھے اور بہرے کی تشبیہ بہت کثرت سے استعمال ہوئی ہے۔

> وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّاَفْئِدَةً فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُهُم مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ حَاقَ بِهِم مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۔ (الاحقاف:۲٦)
>
> اور ہم نے ان کو ایسے مقدور دیے تھے جو تم لوگوں کو نہیں دیے، اور انہیں کان اور آنکھیں اور دل دیے تھے۔ سو جبکہ وہ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے تھے، اس لیے نہ تو ان کے کان ہی ان کے کچھ کام آ سکے اور نہ آنکھیں اور نہ دل۔ اور جس چیز سے استہزا کیا کرتے تھے، اس نے ان کو آ گھیرا۔

گویا جسمانی طور پر کفار میں کوئی عیب نہیں، ان کے پاس سمجھنے کے لیے دل، سننے کو کان اور دیکھنے کو آنکھیں تو ہیں، لیکن ان کے سینوں میں جو دل ہیں وہ ناقص ہیں۔ مندرجہ ذیل آیات سے یہ بات مزید واضح ہوتی ہے:

> اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُم قُلُوب يعقلُون بِهَا اَو اذان يَسمعُون بها فانها لاتعمى الابصار ولكن تعمى القلوب التى فِي الصُّدور۔ (الحج:٤٦)
>
> کیا ان لوگوں نے زمین کی سیر نہیں کی تاکہ ان کے دل (ایسے) ہوتے کہ ان سے سمجھ سکتے۔ اور کان (ایسے) ہوتے کہ ان سے سن سکتے۔ بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں

بلکہ دل جو سینوں میں ہیں (وہ) اندھے ہوتے ہیں۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَايَسْمَعُوْنَ۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَايَعْقِلُوْنَ۔ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ (الانفال: ۲۰-۲۳)

اے ایمان والو! خدا اور اس کے رسول کے حکم پر چلو اور اس سے رُوگردانی نہ کرو اور تم سنتے ہو۔ اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جو کہتے ہیں کہ ہم نے (حکمِ خدا) سُن لیا، مگر (حقیقت میں) نہیں سنتے۔ کچھ شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تمام جانداروں سے بدتر بہرے گونگے ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے۔ اور اگر خدا ان میں نیکی (کا مادہ) دیکھتا تو ان کو سننے کی توفیق بخشتا۔ اور اگر (بغیر صلاحیت ہدایت کے) سماعت دیتا تو وہ منہ پھیر کر بھاگ جاتے۔

چنانچہ ان کو ایمان کی طرف بلانے کی جتنی بھی کوششیں کی جائیں، یقیناً بیکار جائیں گی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں اکثر حضرت محمد ﷺ کو فہمائش کی جاتی ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے پیغمبرانہ شفقت بے کار ہے، کیونکہ ان کی ہدایت کا ناممکن ہونا بالکل یقینی ہے۔

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا۔ (الفرقان: ۴۴)

یا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ان میں اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں (نہیں) یہ تو چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

اِنَّكَ لَاتُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَاتُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ۔ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ

اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ (النمل:۸۰-۸۱)

کچھ شک نہیں کہ تم مردوں کو (بات) نہیں سنا سکتے۔
اور نہ بہروں کو جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر پھر جائیں، آواز سنا سکتے ہو۔ اور نہ اندھوں کو گمراہی سے (نکال کر) رستہ دکھا سکتے ہو۔ تم تو ان ہی کو سنا سکتے ہو، جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں اور وہ فرمانبردار ہو جاتے ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ۔ (یونس:۴۲--۴۳)

اور ان میں بعض ایسے ہیں کہ تمہاری طرف کان لگاتے ہیں تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے، اگرچہ کچھ بھی (سنتے) سمجھتے نہ ہوں اور بعض ایسے ہیں کہ تمہاری طرف دیکھتے ہیں، تو کیا تم اندھوں کو رستہ دکھاؤ گے، اگرچہ کچھ بھی دیکھتے (بھالتے) نہ ہوں۔

دل پر پردہ پڑے ہونے کی وجہ سے ایک کافر اگرچہ قرآنِ کریم کی تلاوت سنتا ہے اور نبی اکرم ﷺ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، لیکن وہ اللہ کی آیات کو کما حقہ سمجھ نہیں سکتا۔ اس کے لیے آیاتِ الٰہی بوڑھے لوگوں کی سنائی ہوئی کہانیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ۔ (الانعام:۲۵)

اور ان میں بعض ایسے ہیں کہ تمہاری (باتوں کی) طرف کان رکھتے ہیں۔ اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال

دیے ہیں کہ اُن کو سمجھ نہ سکیں اور کانوں میں ثقل پیدا کر دیا ہے
(کہ سُن نہ سکیں) اور اگر یہ تمام نشانیاں بھی دیکھ لیں، تب بھی
ان پر ایمان نہ لائیں۔ یہاں تک کہ جب تمہارے پاس تم سے
بحث کرنے کو آتے ہیں تو جو کافر ہیں، کہتے ہیں یہ (قرآن) اور
کچھ بھی نہیں، صرف پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔

قرآنِ کریم میں کفار کو اسلام کی دعوت دینے والے کو ایسے گڈریے کے مشابہ قرار دیا گیا ہے جو اپنے گلے کو چیخ چیخ کر بلاتا ہے۔ جانور اس کی صرف آواز سنتے ہیں، لیکن اس کے الفاظ کے معانی کو نہیں سمجھتے۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ بِمَا لَايَسْمَعُ
اِلَّادُعَآءً وَّنِدَآءً صُمٌّ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَايَعْقِلُوْنَ۔
(البقرۃ: ۱۷۱)

جو لوگ کافر ہیں، ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو
کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن
سکے۔ (یہ) بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں کہ (کچھ) سمجھ
ہی نہیں سکتے۔

کفر اور شرک:

چونکہ کفر کے دونوں بنیادی مفاہیم یعنی ''ناشکراپن'' اور ''عدمِ ایمان'' بالآخر اللہ تعالیٰ کی مطلق وحدانیت کے انکار پر منتج ہوتے ہیں، اس لیے قدرتی طور پر ایک لحاظ سے کفر کو شرک کا ہم معنی قرار دیا جا سکتا ہے۔ قدیم عرب میں شرک سے مراد بتوں کی پوجا، اور بہت سے دیوی دیوتاؤں کی عبادت تھی، جنہیں کبھی خدا کے بیٹے بیٹیاں کہا جاتا، کبھی خدا کے ساتھی اور شریک قرار دیا جاتا تھا۔ اس قسم کے عقیدے کے لیے عام طور پر شرک کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی اور بت پرست کو مشرک کہا جاتا تھا، یعنی ایسا شخص جو خدا کا شریک ٹھہراتا تھا۔ چنانچہ معنویاتی لحاظ سے مندرجہ ذیل دو مساوات بنتی

ہیں۔

کفر = شرک

کافر = مشرک

سب سے پہلے ہم ان آیات کا ذکر کرتے ہیں، جہاں کفر کا ذکر شرک کے معنوں میں کیا گیا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ط ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ۔ (الانعام: ۱)

ہر طرح کی تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اندھیرا اور روشنی بنائی، پھر بھی کافر (اور چیزوں کو) خدا کے برابر ٹھہراتے ہیں۔

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ قُلْ سَمُّوْهُمْ ط اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ط بَلْ زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَ صُدُّوْا عَنِ السَّبِیْلِ ط وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ۔ (الرعد: ۳۳)

تو کیا جو (خدا) ہر متنفس کے اعمال کا نگران (و نگہبان) ہے، (وہ بتوں کی طرح بےعلم و بےخبر ہوسکتا ہے) اور ان لوگوں نے جو خدا کے شریک مقرر کر رکھے ہیں، اُن سے کہو کہ (ذرا) ان کے نام تو لو۔ کیا تم اسے ایسی چیزیں بتاتے ہو جس کو وہ زمین میں (کہیں بھی) معلوم نہیں کرتا یا (محض) ظاہری (باطل اور جھوٹی) بات کی (تقلید کرتے ہو) اصل یہ ہے کہ کافروں کو ان کے فریب خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ اور وہ (ہدایت) کے رستے سے روک لیے گئے ہیں۔ جسے خدا گمراہ کرے، اسے کوئی ہدایت کرنے والا نہیں۔

ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِیَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ وَاِنْ یُّشْرَكْ بِهٖ

تُؤْمِنُوْا ؕ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ۔ (المومن:۱۲)

یہ اس لیے کہ جب تنہا خدا کو پکارا جاتا تھا تو تم انکار کر دیتے تھے۔ اور اگر اس کے ساتھ شریک مقرر کیا جاتا تھا تو تسلیم کر لیتے تھے۔ تو حکم تو خدا ہی کا ہے جو (سب سے) اوپر اور (سب سے) بڑا ہے۔

اگلی آیت میں لفظ مشرک کے معنویاتی عناصر کا تعین دو بنیادی باتوں سے کیا گیا ہے۔

(۱) وحی الٰہی کی پیروی نہ کرنا،

(۲) توحیدِ الٰہی کو تسلیم نہ کرنا۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (الانعام:۱۰۶)

اور جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس آتا ہے، اس کی پیروی کرو۔ اس (پروردگار) کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور مشرکوں سے کنارہ کرلو۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اسلام نے توحیدِ کامل کا جو عقیدہ پیش کیا، اس کی رُو سے عیسائیوں کا نظریۂ تثلیث بھی کھلی بُت پرستی ہے۔ اس طرح حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت بھی بت پرستی ہے۔ غور کریں کہ مندرجہ ذیل آیات میں عیسائیت کی ان مرکزی تعلیمات کو کفار کے اعمال قرار دیا گیا ہے۔ معنویاتی طریق سے اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ اعمال شرک سے مماثلت کی وجہ سے کفر کے درجے میں داخل ہیں۔ مندرجہ ذیل آیت سے یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ

كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (المائدہ ۲۔ ۔۔۳)

وہ لوگ بے شبہ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ مریم کے بیٹے (عیسیٰ) مسیح خدا ہیں۔ حالانکہ مسیح یہود سے یہ کہا کرتے تھے کہ اے بنی اسرائیل خدا ہی کی عبادت کرو، جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی (اور جان رکھو کہ) جو شخص خدا کے ساتھ شرک کرے گا، خدا اس پر بہشت کو حرام کر دے گا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ وہ لوگ (بھی) کافر ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا تین میں کا تیسرا ہے۔ حالانکہ اس معبودِ یکتا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اگر یہ لوگ ایسے اقوال (وعقائد) سے باز نہیں آئیں گے تو ان میں جو کافر ہوئے ہیں، وہ تکلیف دینے والا عذاب پائیں گے۔

ایک اور زاویے سے دیکھا جائے تو شرک درحقیقت جعل سازی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے خلاف افترا ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ بت پرستی یا شرک کا مطلب ہے، حرص و ہوا کی بنیاد پر ایسی چیزوں کی تخلیق جو درحقیقت خود کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ چنانچہ اس راستے سے بھی شرک کے ڈانڈے بالآخر کفر سے جا ملتے ہیں، جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت سے ظاہر ہے:

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ هُوَ الْغَنِيُّ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اِنْ عِنْدَكُمْ مِنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ۔ قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ۔ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ۔ (یونس: ۶۸-۷۰)

(بعض لوگ) کہتے ہیں کہ خدا نے بیٹا بنا لیا ہے۔ اس کی ذات (اولاد سے) پاک ہے (اور) وہ بے نیاز ہے۔ جو کچھ

آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، سب اسی کا ہے۔ (اے افترا پردازو!) تمہارے پاس اس (قولِ باطل) کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ تم خدا کی نسبت ایسی بات کیوں کہتے ہو، جو جانتے نہیں۔ کہہ دو کہ جو لوگ خدا پر جھوٹ بہتان باندھتے ہیں، فلاح نہیں پائیں گے۔ (ان کے لیے جو) فائدے ہیں، دنیا میں (ہیں) پھر ان کو ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اس وقت ہم ان کو عذابِ شدید (کے مزے) چکھائیں گے، کیونکہ کفر (کی باتیں) کیا کرتے تھے۔

اس آیت میں کافر (یعنی کافر = مشرک) کا موازنہ ایک ایسے شخص سے کیا جا رہا ہے، جو صحرا میں پانی کے بجائے سراب کی طرف بے مقصد ہاتھ بڑھا رہا ہو:

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ ۖ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُم بِشَيْءٍ إِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ ۚ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ۔ (الرعد:۱۴)

سودمند پکارنا تو اسی کا ہے اور جن کو یہ لوگ اس کے سوا پکارتے ہیں، وہ ان کی پکار کو کسی طرح قبول نہیں کرتے، مگر اس شخص کی طرح جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلا دے تاکہ وہ (دور ہی سے) اس کے منہ تک آ پہنچے۔ حالانکہ وہ (اس تک کبھی بھی) نہیں آ سکتا۔ اور (اسی طرح) کافروں کی پکار بیکار ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِندَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ ۗ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ۔ (النور:۳۹)

جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے، جیسے میدان میں ریت کہ پیاسا اسے پانی سمجھے، یہاں تک

کہ جب اس کے پاس آئے، تو اسے کچھ بھی نہ پائے اور خدا ہی
کو اپنے پاس دیکھے تو وہ اس کا حساب پورا پورا چکا دے۔ اور خدا
جلد حساب کرنے والا ہے۔

اگلی آیت میں ایک اور موازنہ پیش کیا گیا ہے، جس میں کافر اور مشرک کو ایسے شخص سے تشبیہ دی گئی ہے جو گہرے اور وسیع سمندر میں تہ در تہ اندھیروں میں گھرا ہوا ہے:

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ
مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ
لَمْ يَكَدْ يَرٰهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ۔
(النور: ٤٠)

یا (ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے) جیسے دریائے
عمیق میں اندھیرے جس پر لہر چلی آتی ہو اور اس کے اوپر اور لہر
(آ رہی ہو) اور اس کے اوپر بادل ہو، غرض اندھیرے ہی
اندھیرے ہوں، ایک پر ایک (چھایا ہوا)، جب اپنا ہاتھ نکالے تو
کچھ نہ دیکھ سکے۔ اور جس کو خدا روشنی نہ دے اس کو (کہیں بھی)
روشنی نہیں مل سکتی)۔

ذیل کی آیت میں مشرک کے اعمال کی حقیقی بے بضاعتی کو ایک اور تشبیہ سے واضح کیا گیا ہے:

حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا
خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ
سَحِيْقٍ۔ (الحج: ۳۱)

صرف ایک خدا کے ہو کر اور اس کے ساتھ شریک نہ
ٹھہرا کر۔ اور جو شخص (کسی کو) خدا کے ساتھ شریک مقرر کرے تو
وہ گویا ایسا ہے جیسے آسمان سے گر پڑے، پھر اس کو پرندے اچک

لے جائیں یا ہوا کسی دور جگہ اُڑا کر پھینک دے۔

کفر، شرک کے تعلق سے ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ قرآنِ کریم میں شرک کو انجام کار ذہنی قوت کی اس کارکردگی سے منسوب کیا گیا ہے، جسے 'ظن' یعنی گمان کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ قاعدہ کلیہ کے طور پر لفظ 'علم' کے متضاد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ 'علم' سے مراد ہے، حقیقت کی بنیاد پر ثابت اور مستحکم بات۔ اور 'ظن' سے مراد ہے اور 'ظن' سے مراد ہے، بے بنیاد، اور بے دلیل طرزِ فکر۔(۷) غیریقینی اور مشکوک معلومات، ناقابلِ اعتبار رائے یا صرف اٹکل۔ اس لحاظ سے قرآنی سیاق میں جہاں بھی یہ اصطلاح آئی ہے، وہاں اس سے منفی قدر مراد ہے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ اس کے برعکس 'علم' کو مثبت قدر کا مقام حاصل ہے۔ قرآنِ کریم میں 'ظن' اور 'علم' دونوں قدری اصطلاحیں ہیں۔

> اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ۔ (یونس:٦٦)
>
> سن رکھو کہ جو مخلوق آسمانوں میں ہے اور جو لوگ زمین میں ہیں، سب خدا کے (بندے اور اس کے مملوک) ہیں۔ اور یہ جو خدا کے سوا (اپنے بنائے ہوئے) شریکوں کو پکارتے ہیں، وہ (کسی اور چیز کے) پیچھے نہیں چلتے، صرف ظن کے پیچھے چلتے ہیں اور محض اٹکلیں دوڑا رہے ہیں۔

اس آیت میں آخری لفظ یخرصون کا مادہ خرص ہے، جس کے معنی ہیں، ''غیریقینی بلکہ تقریباً غلط رائے کی بنیاد پر کوئی بات کہنا''۔ 'خرص' بھی 'علم' کے متضاد لفظ ہے۔ سورہ الذاریات کی دسویں آیت میں یہ لفظ مبالغے کے صیغے یعنی خرّاص کی شکل میں استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب ہے، ایسا شخص جو ہر دم اٹکل میں مشغول رہتا ہے۔ یہاں یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے کہ امام بیضاوی نے اس آیت کی تفسیر میں لفظ خرّاص کے معنی کذّاب بیان کیے ہیں۔(۸) یعنی بہت بڑا جھوٹا، جس سے ظاہر ہوتا

ہے کہ اٹکل اور اندازے سے بات کرنے کا تصور قدیم عرب کے معنویاتی شعور میں کتنی آسانی سے جھوٹ بولنے کے معانی میں بدل جاتا ہے۔

قُتِلَ الخرّٰصُوْنَ۔ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ غَمْرَةٍ سَاھُوْنَ۔
یسئلُوْنَ ایّان یومُ الدّین۔ (الذاریات:۱۰-۱۲)

اٹکل دوڑانے والے ہلاک ہوں، جو بے خبری میں
بھولے ہوئے ہیں۔ پوچھتے ہیں کہ جزا کا دن کب ہوگا؟

مندرجہ ذیل دو آیات ظن کے ان مخصوص معنوں میں استعمال کی مثالیں ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ لَایُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَیُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِکَةَ تَسْمِیَةَ
الْاُنْثٰی۔ ومالھُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ
لَایُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا۔ (النجم:۲۷-۲۸)

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے، وہ فرشتوں کو
(خدا کی) لڑکیوں کے نام سے منسوب کرتے ہیں، حالانکہ ان کو
اس کی کچھ خبر نہیں۔ وہ صرف ظن پر چلتے ہیں۔ اور ظن یقین کے
مقابلے میں کچھ کام نہیں آتا۔

وَمَا یَتَّبِعُ اَکْثَرُھُمْ اِلَّا ظَنًّا ۚ اِنَّ الظَّنَّ لَایُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ
شَیْئًا ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَفْعَلُوْنَ۔ (یونس:۳۶)

اور ان میں کے اکثر صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں۔
اور کچھ شک نہیں کہ ظن حق کے مقابلے میں کچھ بھی کارآمد نہیں ہو
سکتا۔ بے شک خدا تمہارے (سب) افعال سے واقف ہے۔

اسی سورہ میں چند آیات پہلے مکے کی تین قدیم دیویوں لات، عزیٰ اور منات کا ذکر ان الفاظ میں ہے کہ یہ صرف خالی نام ہیں اور بے بنیاد اٹکل (ظن) کی پیداوار ہیں۔

افرءیْتُمُ اللّٰتَ والعُزّٰی۔ ومنوٰةَ الثَّالِثَةَ الْاُخرٰی۔ الکُمُ
الذَّکَرُ ولہُ الْاُنثٰی۔ تِلْکَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِیْزٰی۔ اِنْ ھِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ

سَمَّيْتُمُوهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى۔ (النجم:۱۹-۲۳)

بھلا تم لوگوں نے لات اور عزیٰ کو دیکھا اور تیسرے منات کو (کہ یہ نام کہیں خدا کے ہو سکتے ہیں)۔ (مشرکو!) کیا تمہارے لیے تو بیٹے ہوں اور خدا کے لیے بیٹیاں۔ یہ تقسیم تو بہت بے انصافی کی ہے۔ وہ تو صرف نام ہی نام ہیں، جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے گھڑ لیے ہیں، خدا نے تو ان کی کوئی سند نازل نہیں کی۔ یہ لوگ محض ظن (فاسد) اور خواہشاتِ نفس کے پیچھے چل رہے ہیں۔ حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آ چکی ہے۔

کفر ضلالت کے مفہوم میں:

جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے، قرآنِ کریم میں ایمان کی وضاحت کئی کلیدی تصورات کی مدد سے کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک، اور یقیناً بے حد اہم اہتدا (ہدایت) کا مفہوم ہے۔ اس لحاظ سے ایمان کا مطلب ہدایت پانا ہے، یا اللہ کی ہدایت کو قبول کرنا ہے۔ اگر ایمان کا مطلب ہدایت ہے تو ظاہر ہے کفر کا مطلب صحیح راستے سے بھٹک جانا ہے۔ کیونکہ کفر ایمان کی ضد ہے۔ قرآنِ کریم میں اس مفہوم کے لیے خصوصی صیغہ ضَلَّ (مصدر ضلال یا ضلالہ) استعمال ہوا ہے۔

یاد رہے کہ یہ لفظ عربی زبان میں بہت کثرت سے استعمال ہوتا ہے اور بول چال کے بہت سے مدارج میں بولا جاتا ہے۔ اوّل تو اس کا بہت ہی واضح مفہوم ہے۔ 'صحرا میں سفر کرتے ہوئے راستہ بھول جانا'۔ اسی مفہوم کو استعارے کے طور پر بھی لیا جا سکتا ہے۔ بطورِ استعارہ اس کے خطاب کے دو مدارج میں فرق ضروری ہے۔ ایک مذہبی اور دوسرا غیر مذہبی۔

قرآنِ کریم میں ہی اس کے غیر مذہبی استعمال کی دو مثالیں سورہ یوسف میں موجود ہیں۔ ایک مثال میں اس کا اشارہ حضرت یعقوب کی حضرت یوسف سے بہت زیادہ یا جانبدارانہ محبت کی طرف ہے، جس میں وہ حضرت یوسف کو ان کے دوسرے بھائیوں سے زیادہ چاہتے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ بات بھائیوں کے نقطۂ نظر سے بیان ہوئی ہے۔

اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ۔ (یوسف:۸)

اُنھوں (حضرت یوسف کے بھائیوں) نے کہا، یقیناً یوسف اور اس کا بھائی (بن یامین، سب سے چھوٹے) ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ عزیز ہیں، اگرچہ ہم زیادہ قریبی ہیں۔ یقیناً ہمارا باپ کھلی گمراہی میں ہے۔

دوسری مثال میں اس بے قابو جذبے کی طرف اشارہ ہے جو عزیزِ مصر کی بیوی کے دل میں نوجوان یوسف کے لیے بھڑک اُٹھا ہے۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِى الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰهَا فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔

(یوسف:۳۰)

کچھ عورتوں نے شہر میں کہا، عزیز کی بیوی اپنے غلام کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتی ہے۔ اور اس کی محبت اس کے دل میں گھر کر گئی ہے۔ ہم دیکھتی ہیں کہ یہ عورت کھلی گمراہی میں ہے۔

واضح طور پر ان دونوں مثالوں میں ضلال کا مفہوم یہی ہے کہ جس فعل کا ذکر ہے، وہ اخلاقی اقدار کے معروف تصور کے خلاف ہے۔ تاہم اس کا بنیادی مفہوم یہ بھی ہے کہ یہ فعل صحیح راستے سے بھٹک جانے کا نام بھی ہے۔

قرآنِ کریم میں عام طور پر یہ لفظ مذہبی مفہوم میں زیادہ استعمال ہوا ہے۔ درحقیقت قرآنِ کریم میں ہدایت اور گمراہی میں جو بنیادی تضاد ہے، اسے جابجا زور

دے کر بیان کیا گیا ہے۔ بے شمار مثالوں میں سے صرف چند کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَاتَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ (بنی اسرائیل: ۱۵)

جس نے بھی ہدایت پائی، اس نے اپنے ہی فائدے کے لیے ہدایت پائی۔ جو گمراہ ہوا، اس نے اپنا ہی نقصان کیا، کوئی شخص بھی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ۔ (الانعام:۱۱۸)

یقیناً اللہ جانتا ہے، کون اس کے راستے سے بھٹک گیا، وہ ہدایت یافتہ لوگوں سے بھی واقف ہے۔

مندرجہ ذیل آیت میں لفظ ضلالت، ھدی کی ضد کے طور پر استعمال ہوا ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ (البقرۃ:۱۷۵)

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو خرید لیا ہے اور معافی کے بدلے میں عذاب کو۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ایک اور درجے پر گمراہی کے بالمقابل عذاب اور ہدایت کے بالمقابل معافی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس آیت سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ گمراہی کفر کا دوسرا نام ہے۔ اگلی آیت میں گمراہی اور عذاب ساتھ ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔

بَلِ الَّذِيْنَ لَايُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِى الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ۔ (السبا:۸)

نہیں، بلکہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے، وہ عذاب اور صریح گمراہی میں ہیں۔

اس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ انسان کی وہ حالت جس میں وہ وحی کے بغیر مکمل جہالت میں رہتا ہے، اسے بھی قرآن اسی لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ حالت اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بھی وحی کے نزول سے پہلے کا مرحلہ ہے۔ چنانچہ اس حالت میں صحیح معنوں میں کفر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ (آلِ عمران:١٦٤)

یقیناً اللہ نے مومنوں پر رحمت کرتے ہوئے، ان میں سے ایک رسول ان کے درمیان بھیجا، جو انہیں اللہ کی آیات سناتا ہے۔ انہیں پاک صاف کرتا ہے۔ انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس سے پہلے تو وہ کھلی گمراہی میں تھے۔ (آلِ عمران: ۱۶۴)

دلچسپ بات یہ ہے کہ مندرجہ ذیل آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جانور فطری طور پر ضلال (گمراہی) کی حالت میں ہیں۔ لیکن کافر ان سے بھی زیادہ صحیح راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا۔ (الفرقان:٤٤)

کیا آپ سوچتے ہیں کہ ان میں سے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں؟ وہ تو صرف جانوروں کی طرح ہیں، نہیں بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ صحیح راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے ابھی کہا، اگر وحی سے پہلے کی حالت کو گمراہی کی حالت کہا جا سکتا ہے، تو یہ لفظ کہیں زیادہ ان پر صادق آتا ہے، جو جان بوجھ کر وحی کو جھٹلاتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ قَدۡ ضَلُّوۡا ضَلٰلًاۢ بَعِیۡدًا۔ (النساء:١٦٧)

یقیناً جو لوگ انکار (کفر) کرتے ہیں اور اللہ کے راستے میں رکاوٹ بنتے ہیں، وہ بہت بڑی گمراہی میں ہیں۔

مَثَلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ اَعۡمَالُہُمۡ کَرَمَادِ ۣاشۡتَدَّتۡ بِہِ الرِّیۡحُ فِیۡ یَوۡمٍ عَاصِفٍ ؕ لَایَقۡدِرُوۡنَ مِمَّا کَسَبُوۡا عَلٰی شَیۡءٍ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الضَّلٰلُ الۡبَعِیۡدُ۔ (ابراھیم:١٨)

جن لوگوں نے اللہ کا انکار کیا، ان کی مثال ایسے ہے کہ ان کے اعمال اس راکھ کی مانند ہیں، جنہیں طوفانی ہوا اُڑا لے جائے۔ جو کچھ اُنہوں نے کمایا ہے، اس پر ان کا کوئی زور نہیں۔ یقیناً یہ بہت بڑی گمراہی ہے۔

یاد رہے کہ کفر اور ضلال کی مساوات صرف مومنین کے نقطۂ نظر سے ہے۔ کافروں کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مومنوں کی حالت ضلال (گمراہی) کی ہے۔ جب بھی کوئی ڈرانے والا آتا ہے تو کافر اس کو جھوٹا بتاتے ہیں اور کہتے ہیں:

مَا نَزَّلَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ ۚ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ کَبِیۡرٍ۔ (الملک:٩)

اللہ نے کچھ نازل نہیں کیا۔تم خود ہی بڑی گمراہی میں ہو۔

اس کے جواب میں حضرت محمدﷺ سے کہا جاتا ہے کہ وہ بتائیں:

قُلۡ ہُوَ الرَّحۡمٰنُ اٰمَنَّا بِہٖ وَعَلَیۡہِ تَوَکَّلۡنَا ۚ فَسَتَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ ہُوَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ۔ (الملک: ٢٩)

کہہ دیجیے، وہ رحم کرنے والا ہے۔ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔تم جلد دیکھ لو گے کہ کون کھلی گمراہی میں ہے۔

یہی بات مندرجہ ذیل آیات میں بیان ہوئی ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (اعراف: ۵۹-۶۱)

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ یقیناً میں تمہیں ایک خوفناک دن کے عذاب سے ڈراتا ہوں۔ قوم کے بڑوں نے کہا 'یقیناً ہم تمہیں بہت بڑی گمراہی میں مبتلا دیکھتے ہیں'۔ حضرت نوحؑ نے کہا، 'اے قوم! میں گمراہی میں نہیں، میں تو رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں'۔

قرآنی تصور میں چونکہ شرک، کفر کی سب سے خاص شکل ہے، اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اسے ضلال (گمراہی) کی ایک مثال بیان کیا گیا ہے۔ چند مثالیں اس کی وضاحت کے لیے کافی ہیں۔

یَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا یَضُرُّهٗ وَمَا لَا یَنْفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ۔ (الحج:۱۲)

وہ (مشرک) خدا کے علاوہ ان چیزوں کو مدد کے لیے بلاتا ہے، جو نہ اسے نقصان پہنچا سکتی ہیں، نہ فائدہ۔ یہ یقیناً بہت بڑی گمراہی ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّیْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ (انعام: ۷۴)

جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا، 'تم ان بتوں کو خدا بناتے ہو، یقیناً تم اور تمہاری قوم واضح گمراہی میں ہیں'۔

ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ یُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْئًا وَّلَا یُنْقِذُوْنِ۔ اِنِّیْٓ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔

(یونس:۲۲-۲۴)

کیا میں اس کے سوا کسی کو خدا بناؤں جو اگر رحم کرنے والا خدا مجھے کسی مشکل میں مبتلا کرے، تو وہ کبھی پوری طرح میری سفارش نہ کر سکے اور جو مجھے کبھی نہ بچا سکے۔ تب تو میں یقیناً کھلی گمراہی میں پڑ جاؤں۔

درحقیقت، کفر کی ہر صورت گمراہی ہے۔ مثلاً جو لوگ وحی کو جھٹلاتے ہیں، وہ گمراہ ہیں۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ۔ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ۔ (الواقعہ:۵۱-۵۲)

خبردار! تم لوگ جو گمراہ ہو اور آخرت کو جھٹلاتے ہو، تم (دوزخ میں) درخت زقوم کا پھل کھاؤ گے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ۔ اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ۔ (النحل:۳۶-۳۷)

ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجا، تم لوگ خدا کی عبادت کرو اور بتوں کو چھوڑ دو۔ ان میں سے بعض کو خدا نے ہدایت نصیب فرمائی۔ ان میں سے کچھ ایسے تھے، گمراہی جن کا مقدر تھی۔ زمین پر سفر کرو اور دیکھو، ان لوگوں کا کیا انجام ہوا، جنہوں نے (اللہ کو) جھٹلایا۔ اے پیغمبرؐ! اگر تم کو ان لوگوں کے راہِ راست پر آ جانے کا ہوکا ہو تو اس خیال کو چھوڑ دو کیونکہ خدا جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اُس کو ہدایت نہیں دیا کرتا اور کوئی ایسے لوگوں کی مدد کو بھی نہیں کھڑا ہوتا کہ ان کو عذاب سے بچا لے۔

قست قلوبھم (جن کے دل پتھر ہو گئے)۔ ایک صورت حال جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ یہ لوگ بھی گمراہی کا شکار ہیں۔

فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ (الزمر:۲۲)

برا ہو اُن کا، جن کے دل ذکرِ الٰہی کو بھلا کر پتھر ہو گئے۔ یہ لوگ بھی کھلی گمراہی میں ہیں۔

قرآن کے حوالے سے 'ظلم' بھی کفر کی ایک خاص شکل ہے۔ ہم اس پر مزید بات آگے چل کر کریں گے۔ قدرتی طور پر ظالم کو بھی صحیح راستے سے بھٹکا ہوا بیان کیا گیا ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۔ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ (مریم:۳۷-۳۸)

بُرا ہوان کا جنہوں نے حشر کے ہولناک دن سے انکار کیا، جن دن وہ ہمارے پاس لائے جائیں گے۔ تب ان کی باتیں سننا اور انہیں دیکھنا۔ آج ظالم کھلی گمراہی میں ہیں۔

حتیٰ کہ وہ لوگ جو حق کے بارے میں شک رکھتے ہیں، وہ بھی گمراہی میں دُور چلے گئے ہیں۔ یہی حالت ان لوگوں کی ہے جو بے صبر ہونے کے باعث اللہ کی رحمت سے مایوس ہو گئے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ؕ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍ ۢبَعِيْدٍ۔ (الشوریٰ:۱۸)

جو لوگ ایمان رکھتے ہیں، وہ آخرت سے ڈرتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ سچ ہے۔ خبردار! وہ لوگ جو آخرت کے بارے میں شک رکھتے ہیں، گمراہی میں دور چلے گئے ہیں۔

وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ۔ (الحجر:٥٦)

اپنے رب کی رحمت سے صرف وہ لوگ مایوس ہوتے ہیں، جو بھٹک گئے ہیں۔

قرآن کریم میں ضل کے بہت سے مترادفات ہیں، جو کم و بیش ایک ہی سیاق اور ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ غوِی یا غوَی ان میں سے اہم ترین الفاظ میں سے ہے، جس کا معنی ہے۔ 'صحیح راستے سے بھٹک جانا'۔ مندرجہ ذیل آیت میں غاوی جو مادہ غوی سے اسم فاعل ہے، یہی مفہوم رکھتا ہے۔ وہ جو راستے سے بھٹک گیا۔ غاوی اولاً تو متقی کے بالمقابل متضاد معنوں میں آیا ہے، جس کے معنی ہیں، 'خدا ترس'۔ اور پھر چند ہی آیات کے بعد یہ ضال (گمراہ) کے مترادف کے طور پر آیا ہے۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ۔

(الشعراء:٩٠-٩١)

اور متقی لوگوں کو جنت پیش کی جائے گی، جبکہ غاوین کو دوزخ کا راستہ دکھایا جائے گا۔

قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ۔ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ۔

(الشعراء:٩٦-٩٩)

وہاں آپس میں ایک دوسرے سے برسرِپیکار یہ لوگ کہیں گے، خدا کی قسم! ہم لوگ یقیناً واضح طور پر گمراہ تھے کہ ہم نے تمہیں (بتوں کو) ربِ کائنات کے برابر قرار دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجرموں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔

فعل غوی مذہبی معنوں میں ضل کا ہم معنی ہے، اس کو اس طریقے سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ قرآنِ کریم میں اسے اھتدی یعنی ہدایت پانے کے مخالف معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

وَعَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی۔ ثُمَّ اجْتَبٰـهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَیْهِ
وَهَدٰی۔ (طٰہٰ:۱۲۱-۱۲۲)

اور آدم نے اپنے خدا کی نافرمانی کی اور وہ راستے
سے بھٹک گیا۔ پھر اللہ نے اسے چُن لیا اور اس کی جانب توجہ کی
اور اسے ہدایت دی۔

ایک اور اہم مترادف زَاغَ (مصدر زیغ) ہے، جس کا معنی ہے 'ایک طرف جھکنا' اور 'صحیح راستے سے ہٹ جانا'۔ اس کی ایک مثال مندرجہ ذیل آیت ہے:

هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ
هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ
فَیَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ
تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ
عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ
هَدَیْتَنَا۔ (آلِ عمران:۷-۸)

وہی ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی، جس میں کچھ
آیات واضح اور محکم ہیں اور کچھ متشابہ، جن کے دلوں میں ٹیڑھا
پن ہے، وہ متشابہ میں اُلجھ جاتے ہیں اور اختلاف کی تلاش میں
رہتے ہیں اور تاویل ڈھونڈتے ہیں، حالانکہ صرف اللہ ہی تاویل
جانتا ہے۔ تاہم وہ جو علم میں گہرائی رکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں، ہم
اس پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ سب اللہ کی جانب سے ہے۔ صرف
اہلِ عقل ہی اسے یاد رکھتے ہیں۔ اے ہمارے رب! ہدایت عطا
کرنے کے بعد ہمارے دِلوں کو ٹیڑھا نہ کر۔

اس طرح فعل عَمِه اور عَمَه (اندھوں کی طرح بھٹکتے پھرنا یا کچھ پتہ نہ ہونا کہ کس طرف جانا ہے)۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ فعل کفار کی حالت بیان کرنے کے لیے عین مناسب ہے جو دُنیا میں کبھی اِدھر کبھی اُدھر چلتے رہتے ہیں اور جنہیں کبھی صحیح سمت کا

علم نہیں ہوتا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ زَیَّنَّا لَهُمۡ اَعۡمَالَهُمۡ فَهُمۡ یَعۡمَهُوۡنَ۔ (النمل:٤)

یقیناً ہم نے ان لوگوں کے لیے جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے، ان کے اعمال ان کے لیے خوش نما بنا دیئے تا کہ وہ بھٹکتے پھریں۔

ضلال کی طرح غفلت بھی ہدایت سے قریبی مناسبت رکھتا ہے۔ اس کا لفظی معنی 'بے پروائی' ہے۔ اس لفظ کا بنیادی مفہوم اس کے غیر مذہبی سیاق میں زیادہ واضح ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کی بہت دلچسپ مثال ملتی ہے۔ سورہ یوسف کی آیت میں حضرت یعقوب کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہیں، جب وہ اپنے عزیز بیٹے حضرت یوسفؑ کے بارے میں بے حد پریشان ہیں کہ ان کے بھائی ان کو ساتھ لے کر باہر کھیلنے کے لیے لے جاتے ہیں:

اِنِّیۡ لَیَحۡزُنُنِیۡۤ اَنۡ تَذۡهَبُوۡا بِهٖ وَاَخَافُ اَنۡ یَّاۡكُلَهُ الذِّئۡبُ وَاَنۡتُمۡ عَنۡهُ غٰفِلُوۡنَ۔ (یوسف:۱۳)

یقیناً، مجھے دُکھ ہے کہ تم اسے اپنے ساتھ باہر لے کر جا رہے ہو، مجھے ڈر ہے کہ تم اس سے بے پروا ہو جاؤ گے اور اسے بھیڑیا نہ کھا جائے۔

مذہبی سیاق میں لفظ ضلال کا مفہوم ہے، راہِ ہدایت سے بھٹک جانا، جبکہ غفلت کا مفہوم ہے، راہِ ہدایت سے قطعی لاپروا ہو جانا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جس طرح ضلال (گمراہی) وحی سے پہلے کی حالت کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہو سکتا ہے، اسی طرح نزولِ وحی سے پہلے کی انسانی حالت کو بیان کرنے کے لیے غفلت کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ سورۃ الفرقان، آیت ۴۱ میں ہم نے دیکھا کہ کفار کی حالت کا موازنہ جانوروں سے کیا گیا ہے کہ وہ گمراہی کی حالت میں ہیں۔ بالکل یہی صورتِ حال ان کی غفلت کی کیفیت ہے جو ان سے مخصوص ہے۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۫ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔ (الاعراف: ۱۷۸-۱۷۹)

جسے خدا ہدایت کرتا ہے، وہ ہدایت پاتا ہے۔ جسے خدا راہ سے بھٹکا دیتا ہے، وہ نقصان میں رہتا ہے۔ ہم نے جہنم کے لیے بہت بڑی تعداد میں جن اور انسان پیدا کیے جو دل تو رکھتے ہیں، لیکن ان کے ذریعے سمجھتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں، نہیں بلکہ ان سے زیادہ بھٹکے ہوئے۔ وہ غافل (بے پروا) ہیں۔

تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ۔ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ۔ (یٰس: ۵-۶)

یہ وحی زبردست اور رحیم کی طرف سے ہے، تاکہ تم ان لوگوں کو خبردار کرسکو، جن کے آباؤ اجداد کو کبھی خبردار نہیں کیا گیا اور جو اس وجہ سے بے پروا ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ خود حضرت محمد ﷺ کی نزولِ وحی سے پہلے کی حالت کو غفلت کی حالت بتایا گیا ہے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ۔ (یوسف: ۳)

ہم تمھیں بہترین کہانیاں سناتے ہیں۔ ہم نے تم پر قرآن نازل کیا، اگرچہ اس سے پہلے تم غفلت میں تھے (علم نہیں تھا)۔

مندرجہ ذیل آیت میں غفلت کا کفر، ظلم اور شرک سے بہت قریبی تعلق بیان کیا گیا ہے۔

وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِیَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ط یٰوَیْلَنَا قَدْ کُنَّا فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ کُنَّا ظٰلِمِیْنَ۔ اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ط اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ۔

(الانبیاء:۹۷-۹۸)

جب وقتِ مقرر قریب آتا ہے تو دیکھو کفار کی آنکھیں کس طرح پھٹی نظر آتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں: افسوس ہماری حالت پر، ہم اس سے غافل رہے۔ نہیں، ہم نے ظلم کیا۔ یقیناً تم اور تمہارے معبود سب جہنم کا ایندھن ہیں۔ اب تم اس میں داخل ہونے والے ہو۔

اب ہم دو مثالیں پیش کرتے ہیں، جن سے کفر اور غفلت کی معنوی مساوات واضح ہوتی ہے۔

اَنَّ اللّٰهَ لَایَهْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ج وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔

(النحل:۱۰۷-۱۰۸)

خدا کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔ یہ وہ لوگ ہیں، جن کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مُہر لگا دی ہے۔ یہ غافل لوگ ہیں۔

وَاَنْذِرْهُمْ یَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِیَ الْاَمْرُ م وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَایُؤْمِنُوْنَ۔ (مریم:۳۹)

آپ انہیں اس المناک دن کے بارے میں خبردار کیجیے، جب آخری فیصلہ دیا جائے گا۔ حالت یہ ہے کہ یہ لوگ غافل ہیں، اور یقین نہیں کرتے۔

گمراہی کا فوری سبب ہویٰ (خواہش):

قرآن کریم میں ھویٰ (اھواء)، ضلال (گمراہی) کا بنیادی اور فوری سبب بیان کیا گیا ہے۔ جو شخص بھی ایسے معاملات میں جن کا تعلق مذہب سے ہے، ھویٰ (ذاتی خواہش) کا راستہ اختیار کرتا ہے، وہ صحیح راستے سے بھٹک جاتا ہے۔ اور جو لوگ ایسے شخص کے پیچھے چلتے ہیں، جو ھویٰ کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہے، وہ بھی اللہ کے راستے سے دُور ہو جاتے ہیں۔

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ۔ (الانعام:٥٦)

ان سے کہہ دیجیے، مجھے اُن (بتوں) کی پوجا سے منع کیا گیا ہے، جن کو تم خدا کے علاوہ پوجتے ہو۔ ان سے کہہ دیجیے کہ میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا، کیونکہ پھر میں صحیح راستے سے بھٹک جاؤں گا اور ہدایت نہیں پاؤں گا۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَیْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَایَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۔ (القصص:٥٠)

اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہوگا، جو اللہ کی ہدایت کی بجائے اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے۔ یقیناً خدا ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِیْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ۔ (المائدہ:٧٧)

ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو، جو پہلے ہی گمراہ ہو گئے تھے اور بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا اور اب وہ سیدھی راہ سے بہت دُور بھٹک گئے ہیں۔

یہ بات نہایت اہم ہے کہ بعد میں علم الکلام میں گمراہ لوگوں کے لیے ''اہلِ ہوا'' کی اصطلاح استعمال ہونے لگی،(۹) فکرِ اسلامی میں یہ لفظ کلیدی اصطلاح بن گیا۔ اس سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں بھی اسے بہت اہمیت حاصل تھی۔ اس کی مثال جاہلی شاعر تابط شرا کا مشہور شعر ہے:

قليل التشكئى للملم يصيبه
كثير الهوى شتى النوى والمسالك(۱۰)

''وہ ایسا شخص ہے، جو کبھی شکایت نہیں کرتا، خواہ کتنی ہی مصیبت میں ہو۔ اس کی خواہشات بے شمار ہیں۔ کئی سمتیں ہیں اور کئی راستے ہیں۔''

اسی طرح کسی نامعلوم شاعر کا مندرجہ ذیل شعر ہے، جس میں وہ ہم قبیلہ لوگوں کو کہتا ہے کہ جاگو اور غور کرو، اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے، یعنی اس سے پہلے کہ قبیلہ ٹوٹ کر بکھر جائے۔

افیقوا بنی حزن و اھواؤنا معنا
و ارحامنا موصولة لم تقضب(۱۱)

''(اپنی غفلت سے) جاگو (اس سے پہلے کہ جنگ چھڑ جائے) جاگو اے بنی حزن! جبکہ ہماری خواہشات ہمارے ساتھ ہیں اور ہمارے خون کے رشتے باقی ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ ٹوٹ کر الگ ہو جائیں۔''

اس لفظ کے بُرے معنوں میں استعمال کی ایک مثال عنترہ سے ہے:

لا اتبع النفس اللجوج ھواھا(۱۲)

''میں اپنے سرکش نفس کی پیروی نہیں کرتا، جو اپنی خواہشات کے پیچھے بھاگتا ہے (یعنی میں کبھی آپے سے باہر نہیں ہوتا، جب میرا نفس کسی چیز کی خواہش کرتا ہے تو یہ جانتے ہوئے کہ یہ مجھے خطرے میں ڈال دے گا، میں اپنے کو روک لیتا ہوں۔''

کہا جا سکتا ہے کہ غیر اصطلاحی مفہوم میں لفظ ھویٰ کا معنیٰ ہے، نفسِ انسانی کا قدرتی میلان جو حیوانی خواہشات اور حرص سے پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کے سیاق میں یہ ہمیشہ برائی کا میلان ہے، جو انسان کو صحیح راستے سے بھٹکا سکتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم

میں ھوی، علم (یعنی حق کے بارے میں وحی سے حاصل شدہ علم) کے متضاد کے طور پر بیان ہوا ہے۔

وَلَئِنْ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَاجَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ لا اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (البقرة:١٤٥)

اے محمد ﷺ اگر آپ علم حاصل ہونے کے بعد بھی ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی کریں تو یقیناً آپ ظالموں میں شمار ہوں گے۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْآ اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ج فَمَنْ يَّهْدِىْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ط وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ۔ (الروم:٢٩)

نہیں، بلکہ ظالم لوگ علم کی بجائے اپنی خواہشات کا اتباع کرتے ہیں، جسے اللہ نے گمراہ کیا، اسے کون ہدایت دے سکتا ہے۔ ان کے کوئی مددگار نہیں۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ط قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ط وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَ هُمْ بَعْدَ الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ لا مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ۔ (البقرة:١٢٠)

(اے محمد ﷺ!) یہود آپ سے خوش نہیں ہوں گے، نہ ہی عیسائی جب تک ان کے عقائد کا اتباع نہ کریں۔ کہہ دیجیے: 'ہدایت صرف اللہ کی طرف سے ہدایت ہے۔' اگر آپ علم کے آ جانے کے بعد، اُن کی خواہشات کی پیروی کریں تو اللہ کے خلاف کوئی آپ کا نہ محافظ ہوگا، نہ مددگار۔

اوپر کی بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ 'علم' کی بجائے اپنی خواہشات کی پیروی کرنا، انجامِ کار ایسا فعل ہے، جو خدا اور اس کی وحی کے بارے میں دور از کار اندازوں اور ظن کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے بعض اوقات ھویٰ کے بدل کے طور پر اور

الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ظن اس کی بہت واضح مثال ہے۔ (۱۳)

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ۔

(الانعام:۱۱٦)

اگر آپ رُوئے زمین پر اکثر لوگوں کی پیروی کریں گے، تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے، کیونکہ وہ تو صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ تو صرف اندازے لگاتے ہیں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ علم کی جگہ حق کا لفظ بھی بطور بدل استعمال ہو سکتا ہے، کیونکہ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، یہ دونوں الفاظ ایک ہی شے یعنی وحی کے دو پہلو ہیں۔

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ هُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ۔

(المائدہ:٤٩)

ان کے درمیان آپ صرف اس بنیاد پر فیصلہ کیجیے جو اللہ نے آپ پر نازل کیا ہے، اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں، مبادا آپ اس سچائی (حق) سے دور ہو جائیں جو آپ پر اُتاری گئی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض اوقات ان لوگوں کا یہ رویّہ جو ہدایتِ الٰہی کی بجائے اپنی خواہشات کا اتباع کرتے ہیں، قرآنِ کریم نے ایک بہت ہی اہم عبارت کے ذریعے بیان کیا ہے۔ ''اپنی خواہشات کو خدا بنا لینا''۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ (الجاثیہ:۲۳)

کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے، جو اپنی خواہش کو

خدا بنا لیتا ہے، اور خدا نے اسے جان بوجھ کر راستے سے بھٹکا دیا ہے۔ اس کے سننے کی قوت اور دل پر مُہر لگا دی ہے۔ اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ خدا کے علاوہ اسے کون ہدایت دے سکتا ہے:

هوىٰ کا ایک مترادف شهوة ہے جو اہمیت میں اس سے کم ہے، لیکن اس کے معنی بھی 'خواہش، بھوک اور حرص' ہیں۔ بعض سیاق و سباق میں یہ هوىٰ کا بدل بھی بن جاتا ہے اور معنوں میں کوئی زیادہ تبدیلی بھی نظر نہیں آتی۔

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۣ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا۔ (النساء:۲۷)

اللہ تعالیٰ آپ کی طرف توجہ کرنا چاہتا ہے، لیکن جو لوگ اپنی شہوات (خواہشات) کی پیروی کرتے ہیں، چاہتے ہیں کہ آپ (سچ کے راستے سے) دُور بہت دُور ہو جائیں۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ (مریم:۵۹)

اُن (یعنی ابراہیمؑ، موسیٰؑ، اسماعیلؑ جیسے پیغمبروں) کے بعد ایسی نسل آئی، جنھوں نے نماز ترک کر دی اور اپنی شہوات کی پیروی کرنے لگے۔

غرور کا رویّہ:

کفر کی معنویاتی ترکیب کا ایک اور بنیادی عنصر غرور اور تکبر ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قرآنِ کریم میں کفر کے بہت سے خصائص میں سے ذہن کا فطری تکبر محض ایک خصوصیت نہیں، بلکہ قرآن کفر کی معنویاتی ساخت میں اس عنصر پر بار بار خصوصی طور پر زور دیتا ہے، اتنا کہ بعض آیات میں تو یہ کافر کی بہت ہی خاص خصوصیت بن کر ابھرتا ہے۔ ایک کافر مذہبی طور پر بھی مغرور اور خود سر شخص ہے۔ قرآنِ کریم کے سرسری

مطالعے سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنِ کریم میں کفر کے اظہار کو اسی زاویے سے دیکھا گیا ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ خود سر شیخی خور یوں چلتا پھرتا نظر آتا ہے، جیسے وہ منفی صفات کی دُنیا کا مرکزی کردار ہو۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ۔ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِیْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ۔ (الاعراف:۷۵-۷۶)

تب (حضرت صالحؑ کی) قوم (ثمود) کے سرداروں نے ان لوگوں سے جن سے وہ بے حد نفرت اور تکبر سے پیش آتے تھے کہا: ''کیا تم لوگ یقین سے کہہ سکتے ہو کہ صالحؑ ہی ہے، جسے اس کے خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ ان لوگوں نے کہا، ہم یقیناً اس پر یقین رکھتے ہیں جو وہ لے کر آیا ہے۔ تاہم ان متکبر لوگوں نے کہا ہم تو جس چیز پر تم ایمان لائے ہو، یقین نہیں کرتے۔

بَلٰی قَدْ جَآءَتْكَ اٰیٰتِیْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ۔ (الزمر:۵۹)

ہاں میری نشانیاں یقیناً تمہارے پاس آئیں، لیکن تم نے انہیں جھٹلایا اور تکبر کیا۔ تم کفر کرنے والوں میں سے ہو گئے۔

ظاہر ہے کہ 'تکبر' اپنے مثبت معنوں میں قطعی طور پر 'ایمان' کی ضد ہے۔ نتیجتاً جو لوگ اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے، وہ محض تکبر کا رویّہ اپنائے ہوئے ہیں۔

وَقَالَ مُوْسٰۤی اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ۔ (غافر/مؤمن:۲۷)

(حضرت موسیٰ نے کہا، میں اپنے اور تمہارے رب سے پناہ مانگتا ہوں، ایسے شخص سے جو تکبر میں پھول گیا ہے، اور

جو یومِ حساب پر یقین نہیں رکھتا۔

یاد رہے کہ اس ضمن میں مروّہ (مروّت) کی بدوی قدر، جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے، انسانی طاقت پر حد سے زیادہ اعتماد کی پیداوار ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ قدرتی بات سمجھی جاتی تھی کہ جو شخص اس طاقت کے جبلی طور پر اپنے اندر موجود ہونے کا احساس رکھتا ہو، فطری طور پر اس کے ہر رویّے سے اس کا اظہار ہوگا اور اس کا ہر عمل غرور اور تکبر پر مبنی ہوگا۔ حتیٰ کہ بت پرستی کے دائرہ اختیار کو بھی جو زمانۂ جاہلیت کا مسلمہ مذہب تھی، محدود رکھا گیا تاکہ ایسے لوگوں کے فخر و غرور کو نقصان نہ پہنچے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے، انسان کا ایسا رویّہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ کے خلاف انتہائی سرکشی اور طغیان کا اعلان تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، روزمرہ کے معاملات میں بھی اسلام حلم پر زور دیتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں بار بار ایسے لوگوں کی مذمت کی گئی ہے، جو اس غیر معقول غرور سے پھول کر زمین پر اکڑ کر چلتے ہیں، انتہائی ناپسندیدہ آواز میں ڈکارتے ہیں اور اپنی اندھی تذلیل سے کمزوروں اور غریبوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ؕ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ۔ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ۔

(لقمان: ۱۸-۱۹)

اور (از راہِ غرور) لوگوں سے گال نہ پھلانا اور زمین میں اکڑ کر نہ چلنا، کہ خدا کسی اترانے والے خود پسند کو پسند نہیں کرتا، اور اپنی چال میں اعتدال کیے رہنا اور (بولتے وقت) آواز نیچی رکھنا، کیونکہ (اونچی آواز گدھوں کی ہے اور کچھ شک نہیں) کہ سب آوازوں سے بری آواز گدھوں کی ہے۔

یہ رویّہ جو انسانوں کے ساتھ برتاؤ میں بھی اللہ کی ناراضی کا باعث بنتا ہے، اگر اللہ، اس کے رسولوں اور وحی کے بارے میں اپنایا جائے تو انتہائی گھناؤنا جرم بن جاتا ہے۔

یہ نکتہ سمجھنے کے لیے ہمیں صرف یہ یاد رکھنا چاہیے کہ خود لفظ اسلام کے معنی عاجزی اور سپردگی کے ہیں۔ ذیل میں چند آیات درج کی جاتی ہیں، جن میں اللہ کی نشانیوں کے خلاف کفار کے ردعمل کو بہت واضح انداز میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ۔ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ۔ ثُمَّ نَظَرَ۔ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ۔ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ۔ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ۔ (المدثر:۱۸–۲۵)

یہ مارا جائے، اس نے کیسے اندازہ لگایا، پھر یہ مارا جائے، اس نے کیسے اندازہ لگایا۔ اس نے دیکھا، پھر تیوری چڑھائی اور منہ بسور لیا، پھر پیٹھ پھیر کر چلا گیا اور تکبر کیا اور کہنے لگا یہ تو جادو ہے، جو اگلوں سے منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔ یہ تو محض بشر کا کلام ہے۔

قرآن کریم میں غرور کی اس قسم کے لیے سب سے زیادہ **استکبر** کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کا مادہ **ک ب ر** ہے، جس کے بنیادی معنی ''بڑا پن'' کے ہیں۔ **استکبر** کے لفظی معنی ہیں، ''غرور کی بنا پر پھول جانا، بڑا بننا''۔

اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسْتَكْبِرُوْنَ۔ وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ۔ (الصفت: ۳۵–۳۶)

وہ ایسے لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا تھا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں تو غرور کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ بھلا ہم ایک دیوانے شاعر کے کہنے سے کہیں اپنے معبودوں کو چھوڑ دینے والے ہیں۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ۔ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ۔

فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ۔ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ۔ (المومنون:٤٥-٤٧)

پھر ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیاں اور دلیلِ ظاہر دے کر بھیجا۔ (یعنی) فرعون اور اس کی جماعت کی طرف، تو اُنھوں نے تکبر کیا اور وہ سرکش لوگ تھے، کہنے لگے کہ کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں، اور ان کی قوم کے لوگ ہمارے خدمت گار ہیں۔ تو ان لوگوں نے ان کی تکذیب کی سو (آخر) ہلاک کر دیئے گئے۔

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآنی آیات میں دو الفاظ استکبر اور عالی استعمال ہوئے ہیں، جو اسی ایک حالت کے دو مختلف پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔ پہلا لفظ فعل ہے جو غرور اور تکبر کی ایسی حالت کو بیان کرتا ہے، جس کا اظہار کسی فوری لیکن عارضی حرکت سے ہوتا ہے۔ جیسے نفرت اور غصے کے شدید جذبات کا دفعتہً بھڑک اُٹھنا۔ دوسری اصطلاح اسمِ صفت ہے، جو غرور کی ایسی جبلی خصوصیات کو ظاہر کرتا ہے جو ایک کافر کے ذہن کی تہ میں ہمیشہ موجود رہتی ہے اور ذرا سے اشتعال پر کسی بھی وقت پھوٹ پڑتی ہے۔ اگلی آیت سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ۔ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ۔ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ۔ اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ۔ قَالَ یٰٓاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ۔ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ۔ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ۔ (ص ٧١-٧٧)

جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے انسان بنانے والا ہوں، جب اس کو درست کر لوں اور اس

میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔ تو تمام فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر شیطان اکڑ بیٹھا اور کافروں میں ہو گیا۔ (خدا نے) فرمایا کہ اے ابلیس جس شخص کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا، اس کے آگے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے منع کیا؟ کیا تو غرور میں آ گیا یا اونچے درجے والوں میں تھا؟ بولا کہ میں اس سے بہتر ہوں (کہ) تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے بنایا۔ فرمایا، یہاں سے نکل جا تو مردود ہے۔

وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ۔ مِنْ فِرْعَوْنَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ۔ (الدخان: ۳۰-۳۱)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو ذلت کے عذاب سے نجات دی (یعنی) فرعون سے۔ بے شک وہ سرکش (اور) حد سے نکلا ہوا تھا۔

بعض آیات میں لفظ عالی کا مصدر علو بعینہ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۔ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ۔ (النمل: ۱۳-۱۴)

جب ان کے پاس ہماری روشن نشانیاں پہنچیں، کہنے لگے یہ صریح جادو ہے۔ اور بے انصافی اور غرور سے ان کا انکار کیا، حالانکہ ان کے دل اُن کو مان چکے تھے۔ سو دیکھ لو کہ فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ (القصص: ۸۳)

وہ (جو) آخرت کا گھر (ہے)، ہم نے اسے ان لوگوں کے لیے (تیار) کر رکھا ہے، جو ملک میں ظلم اور فساد کا

ارادہ نہیں کرتے۔ اور انجام (نیک) تو پرہیزگاروں ہی کا ہے۔

اسی سلسلے کا ایک اور لفظ تکبر ہے جو ک ب ر مادے کا ہی ایک صیغہ ہے۔ یہ لفظ بھی اسی قسم کے سیاق میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس لفظ خصوصاً اس کے اسم فاعل ''متکبر'' کے استعمال کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ ''تکبر''، ''استکبر'' اور ''عالی'' کے درمیان کا درجہ ہے، جو موخر الذکر کی جانب جھکاؤ رکھتا ہے۔ بالفاظِ دیگر متکبر کا لفظ ایسے غرور کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کافر کی مستقل صفت ہے، وقتی جذبہ و جوش کا اظہار نہیں۔ بیضاوی نے مندرجہ ذیل آیت کی تفسیر کرتے ہوئے متکبر کے لفظ کی تشریح کے لیے ''اعلاء'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ (۱۴)

> سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ۔ (الاعراف:۱٤٦)
>
> جو لوگ زمین میں ناحق غرور کرتے ہیں، ان کو اپنی آیتوں سے پھیر دوں گا۔ اگر یہ سب نشانیاں بھی دیکھ لیں، تب بھی ان پر ایمان نہ لائیں۔ اور اگر راستی کا راستہ دیکھیں تو اسے (اپنا) راستہ نہ بنائیں۔ اور اگر گمراہی کی راہ دیکھیں تو اسے (اپنا) رستہ بنا لیں۔ یہ اس لیے کہ اُنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے غفلت کرتے رہے۔

اگلی آیت خاص اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ یہ ان بنیادی معنویاتی رشتوں پر روشنی ڈالتی ہے، جن کے ذریعے شرک، کفر اور تکبر کے الفاظ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔

> اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ؕ يُسْحَبُوْنَ۔ فِي الْحَمِيْمِ ۙ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ۔ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ۔ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْئًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ۔ ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ

تَفۡرَحُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ وَبِمَا کُنۡتُمۡ تَمۡرَحُوۡنَ۔ اُدۡخُلُوۡۤا اَبۡوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ۚ فَبِئۡسَ مَثۡوَی الۡمُتَكَبِّرِیۡنَ۔

(المومن: ۷۱-۷۶)

جب کہ ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی (اور) گھسیٹے جائیں گے (یعنی) کھولتے ہوئے پانی میں۔ پھر آگ میں جھونک دیئے جائیں گے۔ پھر ان سے کہا جائے گا کہ وہ کہاں ہیں جن کو تم (خدا کے) شریک بناتے تھے (یعنی غیر خدا) کہیں گے، وہ تو ہم سے جاتے رہے بلکہ ہم تو پہلے کسی چیز کو پکارتے ہی نہیں تھے۔ اسی طرح خدا کافروں کو گمراہ کرتا ہے۔ یہ اس کا بدلہ ہے کہ تم زمین میں حق کے بغیر (یعنی اس کے خلاف) خوش ہوا کرتے تھے اور اس کی (سزا ہے) کہ تم اترایا کرتے تھے۔ (اب) جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، ہمیشہ اسی میں رہو گے۔ متکبروں کا کیا برا ٹھکانا ہے۔

مندرجہ ذیل آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ افترا (الکذب) اور تکبر کے رویئے کے درمیان معنوی مشابہت کا رابطہ موجود ہے، بلکہ اس سیاق میں افترا اور تکبر ایک دوسرے کے مساوی ہیں۔ اس آیت سے ایک اور اہم بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ تقویٰ یعنی ''خشیتِ الٰہی'' ان دونوں الفاظ کا متضاد ہے۔

وَیَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ تَرَی الَّذِیۡنَ كَذَبُوۡا عَلَی اللّٰهِ وُجُوۡهُهُمۡ مُّسۡوَدَّةٌ ؕ اَلَیۡسَ فِیۡ جَهَنَّمَ مَثۡوًی لِّلۡمُتَكَبِّرِیۡنَ۔ وَیُنَجِّی اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا بِمَفَازَتِهِمۡ ۫ لَا یَمَسُّهُمُ السُّوۡٓءُ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ۔ (الزمر: ۶۰-۶۱)

اور جن لوگوں نے خدا پر جھوٹ بولا تم قیامت کے دن دیکھو گے، کہ ان کے منہ کالے ہو رہے ہوں گے۔ کیا غرور کرنے والوں کا ٹھکانہ دوزخ میں نہیں ہے۔ اور جو لوگ (شرک و کفر

سے) بچتے تھے، اللہ ان کو کامیابی کے ساتھ جہنم سے نجات دے
گا، نہ ان کو تکلیف پہنچے گی اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اسی بات کو لفظ کِبر سے بھی یاد کیا جا سکتا ہے، جو علمِ معنویات کی اصطلاح میں مصدر کی شکل ہے جس میں ک ب ر کے مادے کا معنی اور مفہوم کسی زمانے (ماضی، حال) سے تعلق کے بغیر بیان کیا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل آیت اس مفہوم کے استعمال کی مثال ہے، جہاں ضمنی طور پر اللہ کے ساتھ جھگڑے کو ''دل کا تکبر'' کی ترکیب سے بیان کیا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰـهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ۔ (المومن:۵٦)

جو لوگ بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو، خدا کی آیتوں میں جھگڑتے ہیں، ان کے دلوں میں اور کچھ نہیں (ارادہ) عظمت ہے اور وہ اس کو پہنچنے والے نہیں، سو خدا کی پناہ مانگو۔ بے شک وہ سننے والا (اور) دیکھنے والا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ مندرجہ بالا بحث میں بے دین قسم کے غرور کے لیے صرف استکبر کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ ہم نے اس ضمن میں لفظ عالی کا ذکر بھی کیا ہے، جو صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ قدیم عربی میں بہت سے اور بھی لفظ ہیں، جو استکبر یا تکبر کے تقریباً ہم معنی ہیں۔ ان میں سے بعض کا ذکر قرآنِ کریم میں خاصی کثرت سے ہوا ہے، اور ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص معانی میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسانی غرور کے رویے کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔

(الف) بغی:

اس بات کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں کہ اگر انسان کا علم اپنے ہی مزعومہ مفروضات پر مبنی ہو تو وہ اسے سماجی زندگی میں مقررہ حدود سے بغاوت کے لیے

اکساتا ہے۔ بغی کے فعل کے بنیادی معنی ہیں ''خود پسندی'' کی زیادتی کی وجہ سے دوسروں کے خلاف غیرقانونی اور بے انصافی پر مبنی قدم اُٹھانا۔ ''کھلم کھلا غلط کام کرنا''۔ اوّلین مسلمانوں کے خلاف مشرکینِ مکہ کے شدائد اور مظالم کا ذکر کرتے ہوئے ابنِ اسحاق نے یہی لفظ استعمال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

فلما عتت قریش علی اللہ عزوجل، وردوا علیہ ما ارادھم بہ من الکرامہ، وکذبوا نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم، و عذبوا ونفوا من عبدہ ووحدہ وصدق نبیہ واعتصم بدینہ، اذن اللہ عزوجل لرسولہ صلی اللہ علیہ وسلم فی القتال والانتصار ممن ظلمھم وبغی علیھم۔[۱۵]

قریش نے اللہ کے خلاف سرکشی کی۔[۱۶] اس کے فضل کا انکار کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان تراشے، وہ ان لوگوں کو اذیتیں دیتے جو توحید کا اعلان کر کے اللہ کی عبادت کرتے اور اس کے رسول پر ایمان لاتے اور اپنے دین پر قائم رہتے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو لڑائی کی اجازت دے دی کہ ان لوگوں کی مدد کریں جن پر ظلم کیے گئے اور سرکشی کی گئی۔

اس لفظ کے قرآنِ کریم میں استعمال کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ۔ (الشوریٰ:۲۷)

اور اگر خدا اپنے بندوں کے لیے رزق میں فراخی دیتا ہے تو زمین میں فساد کرنے لگتے ہیں، لیکن وہ جو چیز چاہتا ہے، اندازے کے ساتھ نازل کرتا ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں کو جانتا اور دیکھتا ہے۔

بیضاوی کے الفاظ میں ''وہ سرکشی کریں گے'' کا مطلب ہے وہ خود پسندی (بطر) کی بنا پر تکبر اور فساد کریں گے۔[۱۷] ہم بطر کی تشریح تھوڑی دیر میں کریں گے۔

ابھی تک یہ کہنا مقصود ہے کہ بیضاوی جیسی اہم تفسیر میں بغی کے لفظ کی تشریح تکبر کے لفظ سے کی گئی ہے۔ مزید یہ کہ اس میں انتہاپسندانہ خود اعتمادی کی وجہ سے فساد کا ارتکاب بھی شامل ہے۔ اس تفسیر کی تائید مندرجہ ذیل آیت میں بہت صراحت کے ساتھ موجود ہے۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ص وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ق اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَاتَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَايُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ۔ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰـكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَاتَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَاتَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ط اِنَّ اللّٰهَ لَايُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ۔ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ط اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ط وَلَايُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ۔ (القصص: ۷۶-۷۸)

قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا، اور ان پر تعدی کرتا تھا۔ اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دیئے تھے کہ ان کی کنجیاں ایک طاقت ور جماعت کو اُٹھانی مشکل ہوتیں۔ جب اس سے اس کی قوم نے کہا کہ اِتراؤ مت کہ خدا اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو (مال) تم کو خدا نے عطا فرمایا ہے، اس سے آخرت کی بھلائی طلب کرو۔ اور دُنیا سے اپنا حصہ نہ بھلاؤ۔ اور جیسی خدا نے تم سے بھلائی کی ہے (ویسی) تم بھی (لوگوں سے) بھلائی کرو۔ اور ملک میں طالبِ فساد نہ ہو۔ کیونکہ خدا فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ بولا کہ یہ (مال) مجھے میری دانش (کے زور سے) ملا ہے۔ کیا اس کو معلوم نہیں کہ خدا نے اس سے پہلے بہت سی اُمتیں جو اس سے قوت میں بڑھ کر اور جمعیت میں

بیشتر تھیں، ہلاک کر ڈالی ہیں۔ اور گنہگاروں سے ان کے گناہوں
کے بارے میں پوچھا نہیں جائے گا۔

یہاں لفظ بغی کو گویا سیاقی تفسیر دی گئی ہے۔ اوّل تو اس آیت میں 'بغی' کو ایک اور فعل 'فرح' کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ لاتفرح، ناز نہ کر۔ یعنی کسی بات پر خوشی سے پھولے نہ سمانا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ بغی کا لفظ یہاں خاص طور پر اس بات کو بیان کرتا ہے کہ قارون کو اپنی دولت پر حد سے زیادہ ناز تھا، وہ اپنی دنیاوی قوت کے نشے میں چور تھا۔ بغی کی اندرونی کیفیت کا اظہار جس رویّے اور عمل سے ہوتا ہے، اس کے لیے لفظ ''فساد'' استعمال کیا گیا۔ فساد کے معنی کی مزید وضاحت اس سباق سے بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ فساد کے مقابلے میں احسان (نیکی کرنا) کا ذکر ہے، جس کا مطلب ہے، رحم دلی اور بھلائی کے جذبے کے ساتھ کام کرنا۔ مندرجہ ذیل آیت میں بغی (اسمِ فعل) کا لفظ حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے خلاف فرعون کے رویّے کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ
وَجُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰٓی اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ
اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآئِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ آٰلْئٰنَ
وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ۔ (یونس: ۹۰-۹۱)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار کر دیا تو فرعون اور اس کے لشکر نے سرکشی اور تعدی سے ان کا تعاقب کیا۔ یہاں تک کہ جب اس کو غرق (کے عذاب) نے آ پکڑا تو کہنے لگا، میں ایمان لایا کہ جس (خدا) پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں فرماں برداروں میں ہوں۔ (جواب ملا کہ) اب (ایمان لاتا ہے) حالانکہ تو پہلے نافرمانی کرتا رہا، اور مفسد بنا رہا۔

اس آیت میں ''عدوٗ'' کے لفظ کے جو بغی کے ساتھ مل کر آیا ہے، (اس کی

ایک اور مثال قرآنِ کریم کی آیت ۶:۱۴۶ میں بھی ہے، معنی ہیں 'اپنی حد سے بڑھ جانا' اور پھر غلط کام کرنا۔ دیکھیے اس سیاق میں پھر فساد کے عنصر کا ذکر ہے۔ عصیت (تم نے نافرمانی کی ہے) کی عبارت بغی کے ایک اور مفہوم کو ظاہر کرتی ہے۔ مندرجہ ذیل آیت میں تشدد اور فساد کے عناصر کی بہتر وضاحت ملتی ہے۔

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ؕ
اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ
الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (الشوریٰ: ٤١ - ٤٢)

اور جس پر ظلم ہوا ہو،[۱۸] اگر وہ اس کے بعد انتقام لے تو ایسے لوگوں پر کچھ الزام نہیں۔ الزام تو ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد پھیلاتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں، جن کو تکلیف دینے والا عذاب ہوگا۔

(ب) بطر:

ہم نے گزشتہ سطور میں تفسیر بیضاوی سے ایک اقتباس کے ضمن میں اس لفظ کا ذکر کیا تھا۔ بطور فعل اس کے معنی ہیں، حد سے زیادہ ناز کرنا۔ (مثلاً اپنی دولت پر)۔ اس میں اشارہ ہے کہ انسان اپنی دولت وغیرہ پر جب حد سے زیادہ خوش ہوتا ہے تو شیخی خوری اور تکبر پر اتر آتا ہے۔ قرآنِ کریم سے اس لفظ کے معنویاتی ڈھانچے کے بارے میں زیادہ معلومات تو نہیں ملتیں تاہم مندرجہ ذیل آیت سے اس کے ایک بہت ہی اہم معنویاتی پہلو کی وضاحت ضرور ہوتی ہے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ
مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَكُنَّا نَحْنُ
الْوٰرِثِيْنَ۔ (القصص:٥٨)

اور ہم نے بہت سی بستیوں کو ہلاک کر ڈالا جو اپنی (فراخی) معیشت میں اترا رہے تھے۔ سو یہ ان کے مکانات ہیں

جو ان کے بعد آباد ہی نہیں ہوئے مگر بہت کم۔ اور ان کے پیچھے
ہم ہی ان کے وارث ہوئے۔

اس آیت کو ذیل میں ''عتی'' (سورہ ۸:۴۷) کی بحث میں دی گئی دوسری آیت کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو بطر کے معانی پر زیادہ مفید روشنی پڑتی ہے۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ یہ عبارت ''ہم نے کتنے شہر اس لیے تباہ کر دیے کہ---'' کفار کے افسوس ناک انجام کو بیان کرنے کے لیے قرآنِ کریم میں بار بار استعمال ہوئی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بطر کا تعلق کفر کی دُنیا سے ہی ہے۔

(ج) عتی:

''عتی''، ''استکبر'' کا مترادف ہے اور اس کا قریب قریب مفہوم ہے، 'حد سے بڑھا ہوا'، 'غرور'، 'تکبر سے پیش آنا'، جب یہ حرف عن کے ساتھ استعمال ہو تو اعراض کا مفہوم پیدا ہوتا ہے یعنی ''کسی حکم کی تعمیل سے نفرت کے ساتھ منہ موڑنا''، ''کسی حکم کے خلاف بغاوت کرنا''۔ اس لفظ کے استعمال کی متعدد مثالوں کے جائزے کی بنیاد پر ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ لفظ عتی قول یا عمل کے ذریعے غرور اور تکبر کے ٹھوس اور خارجی اظہار کے لیے بولا جاتا ہے، جبکہ استکبر غرور کی اندرونی حالت کے بیان کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کی مندرجہ ذیل آیات میں سے پہلی اس تعبیر کی تائید کرتی ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ
اَوْ نَرٰى رَبَّنَا لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا۔
(الفرقان: ۲۱)

اور جو لوگ ہم سے ملنے کی اُمید نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں
کہ ہم پر فرشتے کیوں نہ نازل کیے گئے یا ہم اپنی آنکھ سے اپنے
پروردگار کو دیکھ لیں۔ یہ اپنے خیال میں بڑائی رکھتے ہیں اور (اسی
بنا پر) بڑے سرکش ہو رہے ہیں۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰـهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّعَذَّبْنٰـهَا عَذَابًا نُّكْرًا۔ (الطلاق:۸)

اور بہت سی بستیوں (کے رہنے والوں) نے اپنے پروردگار اور اس کے پیغمبروں کے احکام کی سرکشی کی تو ہم نے ان کو سخت حساب میں پکڑ لیا اور ان پر (ایسا) عذاب نازل کیا جو نہ دیکھا تھا نہ سنا۔

فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّانُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ۔ (الاعراف:۱۶۶)

غرض جن اعمال (بد) سے ان کو منع کیا گیا تھا، جب وہ ان (پر اصرار اور ہمارے حکم) سے گردن کشی کرنے لگے تو ہم نے ان کو حکم دیا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ۔

(د) طغی:

طغی بھی استکبر کا مترادف لفظ ہے اور قرآنی الفاظ میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے ابتدائی معنی کے حوالے سے دریا یا سمندر کے پانی کی ایسی تصویر ذہن میں آتی ہے، جو اوپر اُٹھتے ہوئے اپنی حدوں کو پھلانگ کر کناروں سے باہر نکل آتا ہے۔ چنانچہ یہ تصویر بے ادبی، اور باغیانہ غرور کے رویّے کا استعارہ بن گئی۔ بقول منٹگمری واٹ، طغی کے معنی ہیں، ''کسی قسم کی رکاوٹوں، خصوصاً اخلاقی اور مذہبی اعتبارات کا خیال کیے بغیر آگے بڑھتے چلے جانا یعنی ایسا شخص جسے کوئی بات روک نہ سکے اور جسے اپنی طاقت پر بے حد بھروسہ ہو۔'' قرآنِ کریم کے خصوصی سیاق میں اس کا مطلب ہے، مخلوق ہونے کے احساس کی غیر موجودگی-- اور اس کے ساتھ ساتھ خالق کا انکار یا بے اعتنائی --۔[19]

عرب ماہر لسانیات بیضاوی ایک آیت (المومنون:۷۷) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ''طغیان (طغی کا حاصل مصدر) کے معنی ہیں، کفر میں حد سے بڑھنا، انسان کا

غرور سے پھول کر حقیقت کے قبول سے انکار کر دینا، اور نبیوں اور مومنین کی کھلم کھلا مخالفت کرنا۔''[۲۰] طغیان اور کفر دونوں الفاظ اکثر مرکب کے طور پر استعمال ہوئے ہیں، جن سے ان کے ہم معنی ہونے کی تائید ہوتی ہے۔

وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ۔ (المائدہ:٦٨)

اور یہ (قرآن) جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے، ان میں سے اکثر کی سرکشی اور کفر اور بڑھے گا۔ تو تم قومِ کفار پر افسوس نہ کرو۔

اس سے پہلے فرمایا:

وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا۔ (المائدہ:٦٤)

اور جو کچھ آپؐ کے پاس آپؐ کے پروردگار کی طرف سے بھیجا جاتا ہے، وہ ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور کفر کو زیادہ کرنے کا باعث بنتا ہے۔

وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَن يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا۔ (الکهف:٨٠)

اور وہ جو لڑکا تھا، اس کے ماں باپ دونوں مومن تھے، ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ (بڑا ہو کر جو بدکردار ہوتا کہیں) ان کو سرکشی اور کفر میں نہ پھنسا دے۔

بعض آیات میں طغیان کو تکذیب کا سبب بیان کیا گیا ہے۔ دیکھیے، مندرجہ ذیل آیت میں یہ لفظ ایک مختلف صیغے کے ساتھ (طغوا) آیا ہے۔ معانی وہی ہیں...

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا۔ إِذِ انبَعَثَ أَشْقَاهَا۔

(الشمس:١١-١٢)

قومِ ثمود نے اپنی سرکشی کے سبب (حضرت صالحؑ)

کی تکذیب کی، جبکہ ان میں سے جو سب سے بدبخت تھا، وہ
(اونٹنی کو قتل کرنے کے لیے) اُٹھ کھڑا ہوا۔

بعض آیات میں طغیان نفاق کے بدل کے طور پر آیا ہے۔ نفاق ایسے لوگوں کا رویّہ ہے جو مومنین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں، ''ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم اللہ اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔'' لیکن جب وہ ''اپنے شیاطین سے تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم بے وقوفوں کی طرح کیسے ایمان لا سکتے ہیں۔ ہم تو صرف مذاق کر رہے تھے۔'' قرآنِ کریم نے بدنیت قسم کے رویّے کو طغیان کے لفظ سے بہت صحیح طریقے سے بیان کیا ہے۔

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۔
(البقرة:۱۵)

ان (منافقوں) سے خدا ہنسی کرتا ہے اور انہیں مہلت
دیے جاتا ہے کہ شرارت و سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔

یاد رہے کہ قرآنِ کریم میں عمه (اندھوں کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارنا) اور طغیان اکثر اکٹھے آئے ہیں اور دونوں کا مرکب قرآنِ کریم میں بہت زیادہ استعمال ہونے والی ترکیب ہے۔ اس کا مکمل مطلب ہے ''طغیان (سرکشی) میں اندھوں کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارنا''۔ یہ مفہوم اس وقت اور زیادہ واضح ہو کر سامنے آتا ہے جب اس کے ذریعے ان لوگوں کا حال بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، جو اپنی دنیوی زندگی سے بہت خوش ہیں اور اللہ تعالیٰ کی آیات کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمُ النَّارُ
بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ
رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ۔
دَعْوٰهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ
اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ

اَسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۔ (یونس:۷-۱۱)

جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی توقع نہیں اور دُنیا کی زندگی سے خوش اور اسی پر مطمئن ہو بیٹھے اور ہماری نشانیوں سے غافل ہو رہے ہیں، ان کا ٹھکانا ان (اعمال) کے سبب جو وہ کرتے ہیں، دوزخ ہے (اور) جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے، ان کو پروردگار ان کے ایمان کی وجہ سے (ایسے محلوں کی) راہ دِکھائے گا (کہ) ان کے نیچے نعمت کے باغوں میں نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ (جب وہ) ان میں (ان کی نعمتوں کو دیکھیں گے تو بے ساختہ) کہیں گے، سبحان اللہ!۔ اور آپس میں ان کی دُعا سلام علیکم ہوگی اور ان کا آخری قول یہ (ہوگا) کہ خدائے رب العالمین کی حمد (اور اس کا شکر) ہے۔ اور اگر خدا لوگوں کی برائی میں جلدی کرتا جس طرح وہ طلبِ خیر میں جلدی کرتے ہیں، تو ان کی (عمر کی) میعاد پوری ہو چکی ہوتی۔ سو جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی توقع نہیں، اُنہیں ہم چھوڑے رکھتے ہیں کہ اپنی سرکشی میں بھکتے رہیں۔

مندرجہ ذیل آیت میں جس میں ''سرکشی کی (طغی) اور موجودہ زندگی کی عیاشیوں میں پڑا رہا'' کی عبارت اس عبارت کے بالکل برعکس ہے۔''جو اللہ سے ڈرتا ہے اور اپنے نفس کو دنیوی خواہشات سے روک کر رکھتا ہے۔''

فَاَمَّا مَنْ طَغٰی۔ وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا۔ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی۔ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی۔ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی۔ (النازعات:۳۷-۴۱)

تو جس نے سرکشی کی اور دُنیا کی زندگی کو مقدم سمجھا۔ اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا

ہونے سے ڈرتا اور جی کو خواہشوں سے روکتا رہا، اس کا ٹھکانا
بہشت ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں ضمنی طور پر اس بات کا اشارہ ہے کہ ''خوف'' طغیان کی ضد ہے۔ دراصل آیت میں مذکور لفظ خاف کا لفظی مطلب ہے، ڈرنا۔ لیکن قرآنِ کریم میں یہ اکثر تقویٰ کے معنوں میں آتا ہے۔ (بلکہ زیادہ صحیح یوں ہے کہ اسی مادے کا اس سے مماثل فعل ''اتقا'' استعمال ہوا ہے۔ اتقا کا لفظ بعض اوقات آیت کے متن میں اس طریقے سے آتا ہے کہ وہ باقاعدہ طغی کا متضاد بنتا ہے۔ ذیل کی آیت اس کی ایک مثال ہے۔

هٰذَا ذِكْرٌ ؕ وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ۔ جَنّٰتِ عَدْنٍ
مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ۔ (ص ۴۹-۵۰)

یہ نصیحت ہے اور پرہیزگاروں کے لیے تو عمدہ مقام ہے۔ ہمیشہ رہنے کے باغ جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوں گے۔

(ہ) استغنی:

استغنی کے معنی طغی کے بہت قریب ہیں۔ یہ لفظ بھی انسان کے خود پر اعتماد کے معنوں میں آتا ہے۔ لیکن دونوں کے معنویاتی ڈھانچے یقیناً ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا، طغی کے لفظ سے جو تصور ابھرتا ہے، وہ کناروں سے باہر نکلتے ہوئے پانی کا ہے۔ استغنی میں بنیادی طور پر امیر اور دولت مند ہونے کا مفہوم ہے، اس کا مادہ غ ن ی ہے۔

قرآن کے ہر قاری کو معلوم ہے کہ قرآنِ کریم ہمیشہ اللہ کے غنی ہونے پر زور دیتا ہے۔ یعنی وہ اتنا امیر ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں، وہ خودمختار اور مستقل بالذات ہے۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے، اس کی خودمختاری دراصل مخلوق ہونے کے احساس و شعور کی نفی کی غماز ہے۔ یہ محض خودفریبی اور تکبر ہے اور خدا کے خالق ہونے کے انکار

کے مترادف ہے۔ استغنا میں اسی قسم کی خود پسندی کا مفہوم ملتا ہے۔ لفظی طور پر اس کا معنی ہے ''اپنے کو امیر سمجھنا'' اور انجامِ کار اس کا مفہوم یہ بنتا ہے۔ ''اپنی ذاتی طاقت میں بے حد اعتماد۔'' دلچسپ بات ہے کہ ذیل کی آیت میں، یہ دونوں الفاظ انسانی فطرت کی ساخت کو بیان کرنے کے لیے اس طرح ساتھ ساتھ آئے ہیں کہ قریب قریب مترادف نظر آتے ہیں۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى۔ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى۔ (العلق:٦–٧)

مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے، جبکہ اپنے تئیں غنی دیکھتا ہے۔

اگلی آیت میں متوازی ترکیب کی شکل میں استغنا کے فعل کو اتقا (یعنی خوفِ خدا) کے مقابل استعمال کیا گیا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى۔ (اللیل:٥)

تو جس نے (خدا کے راستے میں مال) دیا اور پرہیزگاری کی۔

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى۔ (اللیل:٨)

اور جس نے بخل کیا اور بے پروا بنا رہا۔

پورا سیاق یوں ہے:

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى۔ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى۔ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى۔ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى۔ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى۔ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى۔ وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى۔ (اللیل:٥–١١)

تو جس نے (خدا کے رستے میں مال) دیا اور پرہیزگاری کی اور نیک بات کو سچ جانا۔ اس کو ہم آسان طریقے کی توفیق دیں گے۔ اور جس نے بخل کیا اور بے پروا بنا رہا اور نیک بات کو جھوٹ سمجھا، اسے سختی میں پہنچائیں گے۔ اور جب (دوزخ کے گڑھے میں) گرے گا تو اس کا مال اس کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔

مندرجہ بالا آیات میں تقویٰ کے ساتھ عطا (اللہ کے راستے میں خرچ) کا اور استغنا کے ساتھ بخل کا ذکر اس انداز سے آیا ہے کہ ان سے نہ صرف ان کے باہمی ربط پر روشنی پڑتی ہے، بلکہ تقویٰ اور استغنا کی تراکیب کے متوازی استعمال سے ان کے متصل ذکر ہونے والے الفاظ یعنی عطا اور بخل کا باہمی تضاد، علمِ معنویات کے اصولوں کی رُو سے لفظ استغنا کے معنوی ڈھانچے پر مزید روشنی ڈالتا ہے۔

(و) جبار:

جو شخص اپنے کو اتنا بڑا اور آمر سمجھتا ہے کہ وہ اپنے کو مکمل طور پر خود مختار قرار دیتا ہے، وہ فطری طور پر اپنے ساتھیوں پر ہر طرح سے غلبہ پانے کی فکر میں رہتا ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ سب پر بلا روک ٹوک استبدادی تسلط حاصل کرلے۔ ایسے شخص کے لیے جبار سے بہتر لفظ نہیں۔ مندرجہ ذیل آیات میں پہلی آیت میں جبار کی صفت انسان کے بجائے اس کے 'دل' کے لیے آئی ہے۔ البتہ یہ بات ظاہر ہے کہ اس سے عام کفار مراد ہیں۔ یہاں یہ بھی قابلِ غور ہے کہ اس کے ساتھ پھر ''متکبر'' کا لفظ آیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''جبار'' اور ''متکبر'' ہم معنی ہیں۔

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ۔

(المومن: ۳۵)

اسی طرح خدا ہر متکبر سرکش کے دل پر مُہر لگا دیتا ہے۔

اگلی آیت سے ''جبار'' کے معنی پر مزید اہم روشنی پڑتی ہے۔ اس آیت میں جبار کی صفت ''باغی'' بیان ہوئی ہے اور اس کے متضاد ایسے الفاظ ہیں، جن کے معنوں میں محبت، نرمی اور تقویٰ کے مفاہیم شامل ہیں۔

وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا۔ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً وَكَانَ تَقِيًّا۔ وَّبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا۔ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا۔ (مریم: ۱۲-۱۴)

اور ہم نے (ان (یحیٰی) کو لڑکپن ہی میں دانائی عطا

فرمائی تھی۔ اور اپنے پاس سے شفقت اور پاکیزگی دی تھی۔ اور وہ پرہیزگار تھے۔ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے والے تھے اور سرکش اور نافرمان نہیں تھے اور جس دن وہ پیدا ہوئے اور جس دن وفات پائیں گے اور جس دن زندہ کر کے اُٹھائے جائیں گے، ان پر سلام اور رحمت (ہے)۔

ذیل کی آیت میں جبار کے لفظ کے استعمال کی ایک اور اہم مثال ملتی ہے، جس میں مذکورہ بالا حالت حضرت عیسیٰ کی زبان سے بیان ہوئی ہے۔

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُاللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا۔ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَادُمْتُ حَیًّا۔ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا۔ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا۔ (مریم: ۳۰-۳۳)

بچے نے کہا کہ میں خدا کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے۔ اور نبی بنایا ہے۔ اور میں جہاں ہوں (اور جس حال میں ہوں) مجھے صاحبِ برکت کیا ہے۔ اور جب تک زندہ ہوں، مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا ارشاد فرمایا ہے۔ اور (مجھے) اپنی ماں کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا (بنایا ہے) اور سرکش و بدبخت نہیں بنایا۔ اور جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مروں گا اور جس دن زندہ کر کے اُٹھایا جاؤں گا، مجھ پر سلام (و رحمت) ہے۔

وحی کے ساتھ تمسخر کا رویہ:

غرور اور تکبر کا رویہ جس کی بات ابھی ہو رہی تھی، ایسے لوگوں کا خاص رویہ ہے جو ایمان لانے سے انکار کرتے ہیں۔ اس رویے کی بہت سی شکلیں ہیں۔ درحقیقت کفر کے سارے نمایاں رویے اسی غرور کے بنیادی رویے کے مظاہر ہیں۔ تاہم ان مختلف رویوں میں سے دو ایسے ہیں، جن کا تعلق قرآن کریم کفار کے تکبر کے ساتھ براہِ

راست بتاتا ہے، ایک ہے نبی کریمؐ کے پیغام کا تمسخر اور دوسرا ہے جھگڑا۔

قرآنِ کریم بار بار اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ کفار اللہ اور اس کی وحی کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ تمسخر کے اس رویّے کو اُن کی سب سے خاص صفت بیان کیا گیا ہے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ قرآنِ کریم میں ایامِ جاہلیت کے لوگوں کی جو تصویر ابھرتی ہے، وہ لہو ولعب اور احمقانہ بے پروائی سے رنگین نظر آتی ہے۔

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ یہ بے پروائی ان کی مادیت پرستی کا نتیجہ تھی۔ ان لوگوں کے لیے جو اس ارضی زندگی کے بعد کسی زندگی کے قائل نہ تھے، ایک ایسا مذہب جو مستقل ابدی زندگی کی تعلیم دے، مضحکہ خیز تصور تھا۔ تمسخر کے اس رویّے کو بیان کرنے کے لیے قرآنِ کریم نے عموماً اتخذ ھزوا (مذاق بنانا) اور استھزی (مذاق اُڑانا) کے الفاظ استعمال کیے ہیں، جن کا مادہ ھزء ہے۔ ذیل کی آیات معنویاتی لحاظ سے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص انداز میں شرک، کفر اور استہزا کے معنوی رشتے کی قربت کو ظاہر کرتی ہے۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ۔ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِئِيْنَ۔ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ۔ (الحجر: ٩٤-٩٦)

پس جو حکم تم کو (خدا کی طرف سے) ملا ہے، وہ (لوگوں کو) سنا دو اور مشرکوں کا (ذرا) خیال نہ کرو۔ ہم تمہیں ان لوگوں (کے شر) سے بچانے کے لیے جو تم سے استہزا کرتے ہیں، کافی ہیں۔ جو خدا کے ساتھ اور معبود قرار دیتے ہیں، سو عنقریب ان کو (ان باتوں کا انجام) معلوم ہو جائے گا۔

وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ۔ (الانبیاء: ٣٦)

اور جب کافر تم کو دیکھتے ہیں تو تم سے استہزا کرتے

ہیں۔ کیا یہی شخص ہے، جو تمہارے معبودوں کا ذکر (برائی سے)
کیا کرتا ہے، حالانکہ وہ خود رحمٰن کے نام سے منکر ہیں۔

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْآ اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا۔ (الکھف:۱۰۶)

یہ ان کی سزا ہے (یعنی) جہنم، اس لیے کہ انھوں نے
کفر کیا اور ہماری آیتوں اور ہمارے پیغمبروں کی ہنسی اُڑائی۔

سخر یا استخر (مادہ س خ ر) ایک اور لفظ ہے جس کے معنی بالکل وہی ہیں جو استہزا کے ہیں اور قرآنِ کریم میں یہ لفظ عین ملتے جلتے سیاق میں استعمال ہوا ہے۔ جس طرح استھزی کے مفہوم کو ایک ایسی عبارت میں ترتیب دیا جا سکتا ہے، جس میں ایک فعل اور ایک اسم ہو (یعنی اتخذ ھزوا) اسی طرح سخر یا استخر کو بھی اتخذ سخریا کی عبارت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے، جس میں سخریا اسم ہے جو س خ ر کے مادے سے حاصل کیا گیا ہے۔ استہزاء اور سخر میں ترادف (ہم معنی) کا رشتہ مندرجہ ذیل آیات میں بہت واضح نظر آتا ہے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۔ (الانعام:۱۰)

اور تم سے پہلے بھی پیغمبروں کے ساتھ تمسخر ہوتے رہے
ہیں۔ سو جو لوگ ان میں سے تمسخر کیا کرتے تھے، ان کو تمسخر کی
سزا نے آ گھیرا۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۔ (الانبیاء:۴۱)

اور تم سے پہلے بھی پیغمبروں کے ساتھ استہزا ہوتا رہا
ہے تو جو لوگ ان میں سے تمسخر کیا کرتے تھے، ان کو اسی
(عذاب) نے جس کی ہنسی اُڑاتے تھے، آ گھیرا۔

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ۔ وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ۔

وَإِذَا رَأَوْا آيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ۔ وَقَالُوْآ إِنْ هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۔
(الصفٰت: ۱۲-۱۵)

ہاں تم تو تعجب کرتے ہو اور یہ تمسخر کرتے ہیں۔ اور جب ان کو نصیحت دی جاتی ہے تو نصیحت قبول نہیں کرتے۔ اور جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو ٹھٹھے کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو صریح جادو ہے۔

إِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ۔ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ۔ (المومنون: ۱۰۹-۱۱۰)

میرے بندوں میں ایک گروہ تھا جو دُعا کیا کرتا تھا کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے۔ تُو ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تُو سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔ تو تم ان سے تمسخر کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کے پیچھے میری یاد بھی بھول گئے اور تم (ہمیشہ) ان سے ہنسی کرتے رہتے تھے۔

جدال:

کفار کا غرور اپنے اظہار کے لیے ایک مختلف اور زیادہ شدید راستہ بھی اختیار کر سکتا ہے، یعنی جدال۔ جیسا کہ اوپر وضاحت ہوئی، کفار فطری طور پر شکّی اور عقل پرست ہیں۔ وہ رسولوں کے ذریعے بھیجے گئے احکامِ خداوندی کو اتنی آسانی سے قبول نہیں کرتے، خاص طور پر اگر اس وحی میں کوئی چیز اس کی مخالفت کرے، جسے ان کی عقل سچ مانتی ہے۔ مثلاً خدا کی توحید کا نظریہ اور موت کے بعد حشر کا عقیدہ، ان کے شکّی ذہنوں کے لحاظ سے قطعاً بے معنی اور ناقابلِ قبول ہے۔ چنانچہ ان کا غالب رجحان یہ ہے کہ وہ خدا اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت کے بارے میں ''جھگڑا'' کرنے لگتے ہیں۔

قرآنِ کریم شکی ذہنوں کی بہت ہی خاص صفت یہ بیان کرتا ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ سے ان کی نبوت کے بارے میں زچ کر دینے والے سوال کرتے ہیں اور وحی کی صداقت کے بارے میں آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ۔

(البقرۃ:۱۰۸)

کیا تم رسول سے ایسے ہی سوال کیے جاؤ گے، جیسے اس سے پہلے حضرت موسیٰ سے کرتے تھے؟ تاہم جو بھی ایمان کی جگہ کفر اختیار کرے، وہ صحیح راستے سے بھٹک جاتا ہے۔

خدا اور وحی کے بارے میں خواہ مخواہ کی حجت اور جھگڑا کفر کا خصوصی اظہار ہے۔ ج د ل کا مادہ جس کا بنیادی معنی ہے (رسے کی طرح کی چیز کو) مروڑ کر سخت اور ٹھوس بنا دینا، اس قسم کی شدید حجت بازی کی صحیح تصویر پیش کرتا ہے۔

مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْ بَعْدِهِمْ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ۔ (غافر:۳-٤)

اللہ کی آیات کے بارے میں صرف وہ لوگ جھگڑتے ہیں، جنھوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا۔ لہٰذا علاقے میں ایسے لوگوں کی کثرت سے آپ دھوکے میں نہ آئیں۔ ان سے پہلے نوح کی قوم نے بھی ان کو جھٹلایا اور اس کے بعد بھی بہت سے لوگوں نے ایسا کیا۔ ہر قوم اپنے رسول پر گرفت چاہتی تھی اور اس سے خواہ مخواہ جھگڑا کرتی تھی تاکہ وہ سچائی کو جھٹلا سکیں۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَا

اُنْذِرُوْا ھُزُوًا۔ (الکھف:٥٦)

ہم رسولوں کو صرف اس لیے بھیجتے ہیں کہ وہ خوشخبری اور وعید لے کر جائیں، لیکن جو لوگ ان کو نہیں مانتے، وہ خواہ مخواہ کا جھگڑا کرتے ہیں، تاکہ وہ سچ کو جھٹلا سکیں۔ وہ میری نشانیوں کا اور وعید کا جو وہ رسول لے کر آتے ہیں، مذاق اُڑاتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ثَانِیَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهٗ فِی الدُّنْيَا خِزْیٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ۔ (الحج:٨-٩)

ان میں وہ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں کسی علم کے بغیر کسی ہدایت اور کسی روشن کتاب کے بغیر جھگڑا کرتے ہیں۔ وہ پیٹھ موڑ کر لوگوں کو اللہ کے راستے سے بھٹکاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے اس دُنیا میں بدنامی ہے اور یومِ حشر میں بھی۔ ہم انہیں آگ کا عذاب چکھائیں گے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجٰدِلُ فِی اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ۔ (لقمان:٢٠)

اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر کسی علم اور رہنمائی کے جھگڑتے ہیں، نہ ہی ان کے پاس کوئی روشن کتاب ہے۔

اگرچہ اس اقتباس میں لفظ کفر کا صراحت سے ذکر نہیں، تاہم سیاق و سباق سے کسی شک و شبہ کے بغیر واضح ہے کہ ''وہ لوگ جو جھگڑا کرتے ہیں'' کفار کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ ذیل کی آیات میں بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ پہلی آیت معنویاتی نقطۂ نظر سے خصوصی اہمیت رکھتی ہے کہ یہ ذہن کے غرور اور تکبر کے حوالے سے دونوں میں (یعنی جھگڑے اور غرور میں) ایک طرح کا بدل پایا جاتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰهُمْ كَبُرَ

مقتًا عِندَاللّٰهِ وَعِندَ الَّذِينَ اٰمَنُوا ؕ كَذٰلِكَ يَطۡبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلۡبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ۔ (غافر:۳۵)

جو لوگ اللہ کی آیات کے بارے میں بغیر کسی اختیار کے جھگڑا کرتے ہیں، اللہ کے اور مومنوں کی نظر میں یہ بات انتہائی قابلِ نفرت ہے۔ اس طرح اللہ ہر سرکش اور مغرور دل پر مُہر لگا دیتا ہے۔

وَلَمَّا ضُرِبَ ابۡنُ مَرۡيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوۡمُكَ مِنۡهُ يَصِدُّوۡنَ وَقَالُوۡآ ءَاٰلِهَتُنَا خَيۡرٌ اَمۡ هُوَمَا ضَرَبُوۡهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلۡ هُمۡ قَوۡمٌ خَصِمُوۡنَ۔ (الزخرف:۵۸)

جب ابنِ مریم کی مثال دی جاتی ہے، تو تمہارے لوگ منہ پھیر لیتے ہیں، اور کہتے ہیں: کیا ہمارے خدا بہتر ہیں یا وہ؟ وہ اس کا ذکر تمہارے سامنے صرف اس لیے کرتے ہیں کہ جھگڑا کر سکیں۔ نہیں، وہ تو شدید جھگڑالو لوگ ہیں۔

مندرجہ بالا آیت میں جھگڑالو کے لیے لفظ خصیم استعمال ہوا ہے۔ اس کا مادہ خ ص م ہے۔ خصیم کا لفظی معنی، ایسا شخص ہے جسے جھگڑنے کا خصوصی شوق ہو اور جو جھگڑے میں بہت شدت اختیار کرتا ہو۔

اسی طرح کی بے شمار مثالوں سے خود اللہ تعالیٰ یہ نتیجہ پیش کرتا ہے کہ ساری مخلوقات میں انسان سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔

وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا فِىۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لِلنَّاسِ مِنۡ كُلِّ مَثَلٍ وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ اَكۡثَرَ شَىۡءٍ جَدَلًا۔ (الکهف:۵٤)

یقیناً ہم نے قرآن میں انسان کو بہت سی مثالوں سے بیان کیا ہے، تاہم انسان ہر شے سے زیادہ جھگڑالو ہے۔

حواشی:

(۱) قَالَ أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِينَ۔ (سورۃ الشعراء: ۱۸-۱۹) [حاشیہ مترجم]

ترجمہ: فرعون حضرت موسیٰ سے کہتا ہے۔کیا ہم نے تمہارے بچپن میں تمہاری پرورش نہیں کی اور تم ہمارے درمیان کئی سال نہیں رہے۔ پھر بھی تم نے یہ کام کیا۔تم تو ناشکرے ہو۔

(۲) اس تجزیاتی طریقہ کے لیے ملاحظہ ہو، بابِ دوم۔

(۳) بیضاوی، انوار التنزیل و اسرار التاویل، جلد اوّل، استانبول، مطبع عثمانیہ،۱۳۱۴ھ،ص ۶۹۵۔

[حاشیہ مترجم]

(۴) لفظ ظلم کے معانی کا تجزیہ اگلے ابواب میں آئے گا۔

(۵) صحیح بخاری، کتاب الایمان، حدیث نمبر ۲۸۔

(۶) کرمانی، شرح صحیح بخاری، (قاہرہ،۱۹۳۳ء-۱۹۳۹ء)، جلد اوّل،ص ۱۳۴۔

(۷) علم اور ظن پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو، پروفیسر ازتسو کی کتاب 'قرآن میں خدا اور انسان'۔

(۸) [حاشیہ مترجم]

(۹) علم الکلام میں ھویٰ کی اصطلاح عموماً انتہائی مذمت کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً ابوالحسن اشعری کا یہ قول: ''معتزلہ اور قدریہ جو صداقت سے بھٹک گئے، وہ اپنی ذاتی خواہشات کی پیروی میں اپنے ائمہ اور آباء کی اندھی تقلید میں مبتلا ہو گئے اور قرآنِ کریم کی دل پسند تعبیر کرنے لگے۔'' (کتاب الابانہ، حیدرآباد، دکن، ۱۹۴۸ء،ص ۳)

(۱۰) ابو تمام، الحماسہ، ج ۱،ص ۴۷۔

(۱۱) ابوتمام، الحماسۃ،ص ۱۶۴۔

(۱۲) عنترہ، دیوان، تحقیق: عبدالرؤف، قاہرہ، ت۔ن، جلد اوّل،ص ۱۸۶۔

(۱۳) ظن اور علم کس طرح بنیادی طور پر ایک دوسرے کی ضد ہیں، ہم 'شرک' کے لفظ کے تجزیے میں اس پر بحث کر چکے ہیں۔

(۱۴) بیضاوی، انوار التنزیل، ج ۱،ص ۴۴۶۔ [حاشیہ مترجم]

(۱۵) ابنِ اسحاق، بحوالہ ابنِ ہشام، سیرۃ النبی، ج ۲، (قاہرہ محمد علی صبیح، ۱۹۶۳ء)،ص ۳۲۰۔

[مصنف کا حوالہ غیر مکمل ہے]

(۱۶) لفظ عتی (سرکشی) کا تجزیہ آئندہ صفحات میں آ رہا ہے۔ [حاشیہ مترجم]

(۱۷) بیضاوی، انوار التنزیل، ج ۲،ص ۳۰۸۔ [حاشیہ مترجم]

(۱۸) عربی زبان میں صمم اور عمی ہمیشہ سے ایک دوسرے سے قریباً مترادف رہے ہیں۔ اس کا ثبوت مشہور جاہلی شاعر عنترہ کا یہ شعر ہے:

اذکر قومی ظلمهم لی وبغیهم

واقلة انصافی علی القرب والبعد

(دیوان عنترہ، ج ٥، ص ٦٢)

میں اپنی قوم کو ان کے ظلم اور بغاوت یاد دلاتا ہوں، کہ انہوں نے ہمیشہ میرے ساتھ ناانصافی کی۔

یہاں شاعر اپنے ہم قبیلہ لوگوں کے رویّے کا ذکر کرتا ہے، جن کی عنترہ نے اپنی تلوار کے ذریعے ماضی میں اتنی مدد کی تھی اور جواب اسے ''کالا آدمی'' کہہ کر اس کی بے عزتی کرتے تھے۔

(۱۹) منٹگمری واٹ، محمد ایٹ مکہ (آکسفورڈ، کلیرنڈن، ۱۹٦۰ء)، ص ٦۷۔

(۲۰) بیضاوی، انوار التنزیل، ج ۲، ص ۱۲۵۔

باب ہشتم

کفر کا معنویاتی دائرہ

گذشتہ باب میں ہم نے کفر کے تصور کی اندرونی ساخت کا تجزیہ پیش کیا۔ تاہم یہ تصویر تبھی مکمل ہوگی، جب ہم ان دیگر کلیدی الفاظ کا بھی جائزہ لیں جو اس اہم تصور کے اردگرد کا دائرہ بناتے ہیں۔ یہ قریب المعنی الفاظ باہم مل کر جو معنوی رابطے قائم کرتے ہیں، اسے ہم نے کفر کے تصور کے معنویاتی دائرہ کا نام دیا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ لفظ ''کفر'' سب سے جامع اصطلاح ہی نہیں جو ان تمام منفی مذہبی اخلاقی اقدار کا احاطہ کیے ہوئے، جن کا قرآن میں ذکر ہے، بلکہ ان منفی اقدار کے نظام کا مرکزی نقطہ بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم کفر کے مزاج کو صحیح طور پر تبھی سمجھ سکتے ہیں، جب ہم ان تمام عناصر کے مزاج کو جان لیں، جس سے یہ سارا نظام ترتیب پاتا ہے۔ اس باب میں ہم انہی پانچ عناصر کا معنویاتی تجزیہ پیش کر رہے ہیں:

ا۔ فاسق:

فکرِ اسلامی کے نقطۂ نظر سے یہ لفظ بہت ہی خاص اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ دوسرے چار الفاظ کے برعکس اسے آگے چل کر علم الکلام میں ایک انتہائی اہم کردار ادا کرنا تھا۔

اس لفظ کا کردار بطور ایک کلیدی اصطلاح تھا، جس کا مفہوم بہت واضح طور پر ''مرتکب کبیرہ'' تھا، یعنی ایسا شخص جس سے کبیرہ گناہ سرزد ہوا ہو۔ تاہم قرآن کریم کی حد تک اس لفظ کا یہ اصطلاحی مفہوم ابھی تشکیل نہیں پایا تھا۔ آئندہ جب ہم قرآنِ کریم میں ان الفاظ کے معنویاتی ڈھانچے کا جائزہ لیں تو یہ نکتہ ہمارے پیشِ نظر رہنا چاہیے۔

'فاسق'، 'کافر' کے مترادف:

فاسق اور— ان معنوں میں دوسرے چار الفاظ بھی— اپنے معنویاتی ڈھانچوں کے لحاظ سے لفظ ''کافر'' سے بہت سی باتوں میں مشترک ہیں، حتیٰ کہ اکثر اوقات ان میں فرق واضح کرنا مشکل دکھائی دیتا ہے۔

ہم گفتگو کا آغاز ایک مخصوص مثال سے کرتے ہیں جہاں لفظ 'فاسق'، 'کافر' کے مترادف استعمال ہوا ہے۔ ابوعامر زمانۂ جاہلیت میں اپنے زُہد کی وجہ سے مشہور تھا، لوگ اسے راہب کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ ہجرت کے وقت وہ مدینے میں بہت اثر ورسوخ کا مالک تھا۔ اگرچہ اس کے سارے قبیلے نے اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہا اور آخری دم تک ایمان نہیں لایا، حتیٰ کہ وہ اپنے قبیلے کو چھوڑ کر اپنے چند وفادار ساتھیوں کے ساتھ مکہ چلا گیا۔ روایت ہے کہ یہ سن کر حضرت محمد ﷺ نے فرمایا: 'اسے آئندہ راہب نہ کہا جائے، بلکہ 'فاسق' کہا جائے۔ (۱)

حضرت محمد ﷺ، ابوعامر کے لیے 'فاسق' کی بجائے 'کافر' کا بھی استعمال کر سکتے تھے۔ درحقیقت اس مختصر سی روایت سے ایک نہایت ہی اہم بات کا پتہ چلتا ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے فاسق کا لفظ کس قسم کے رویّے کے لیے بولا جاتا ہے، لیکن اس روایت نے کفر اور فسق کے فرق پر بالکل روشنی نہیں پڑتی۔ شاید اس روایت ہی سے اشارہ ملتا ہے کہ ان دونوں میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ درجے کا ہے، معیار کا نہیں۔ بالفاظِ دیگر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کفر جب چند درجوں سے تجاوز کر جائے تو وہ فسق ہو جاتا ہے، یعنی فسق، کفر سے چند درجے بڑھ کر ہے اور فاسق ایسے کافر کو کہا جاتا ہے جو ضدی اور ہٹ دھرم ہو۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مفسر بیضاوی نے لکھا ہے کہ فاسق وہ ہے جو کفر پر قائم رہے۔ (۲)

عموماً اس بات پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ فسق کا معنی ہے **خروج عن الطاعة** یعنی نافرمانی یا احکامِ الٰہی سے سرتابی۔ جو شخص بھی، کسی بھی معنی میں اللہ کی نافرمانی کرتا ہے، اسے فاسق کہا جائے گا۔ جب کہ کافر کا مفہوم مقابلتاً محدود ہے۔ یہ بات صحیح تو

ہے، لیکن اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس لفظ فسق کو جس طرح قرآنِ کریم میں استعمال کیا گیا ہے، اس کا معنویاتی ڈھانچہ کیا ہے۔

بہرکیف، سرِدست ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ فاسق کافر کا ہم معنی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اس کے استعمال کے واضح کوائف کا جائزہ لیں، ہم مزید گفتگو سے پہلے ایک قرآنی آیت کا حوالہ دیتے ہیں، جس میں کفر اور فسق ایک دوسرے کے برابر استعمال ہوتے ہیں۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ۔ (البقرۃ:۹۳)

اور ہم نے تیری طرف روشن آیات اُتاریں، ان کا انکار (کفر) وہی کریں گے جو نافرمان (فاسق) ہیں۔

بظاہر اگلی آیت سے بھی مسئلہ زیادہ واضح نہیں ہوتا، کیونکہ اس آیت میں بھی صرف یہ صراحت ملتی ہے کہ معنویاتی لحاظ سے کفر اور فسق باہم مساوی ہیں۔

اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَا تُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ۔ (التوبہ:۸۵)

وہ اللہ کے منکر (کفر) ہوئے اور اس کے رسول کے اور وہ فاسق ہی مر گئے۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ فسق ایسی حالت کا نام ہے، جو اللہ اور رسول سے انکار کے کافرانہ عمل کا نتیجہ ہے۔ تاہم جب اس آیت کو اس کے حقیقی سیاق میں رکھ کر اس کا بغور مطالعہ کریں تو واضح ہوتا ہے کہ اس آیت کا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے، جو اگرچہ عام طور پر ایک ''اچھے مسلمان'' کی طرح اپنے مذہبی جذبے کا بہت زیادہ اظہار کرتے تھے، لیکن حیلے بہانے سے جہاد کے مشترکہ مقصد میں حصہ لینے کے انکار سے ان کی اصلیت ظاہر ہو گئی یعنی اُنہوں نے اس پُرخطر کام میں اپنی جان و مال کو خطرے میں ڈالنے سے احتراز کیا۔

زبانی جمع خرچ، بغیر عمل کا اصول اور زبانی عقیدت کا اظہار اور عملی طور پر

بدعہدی وہ عناصر ہیں، جو فاسق کے خصوصی کردار کا تعین کرتے ہیں۔ قرآنی آیات میں بہت اہم حیثیت کی حامل ہیں۔

مندرجہ ذیل آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے جو الفاظ کہلوائے گئے ہیں، وہ بعینہٖ ایسی ہی ملتی جلتی صورتِ حال میں لفظ فاسق کے استعمال کی مثال ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ۔ (المائدہ:۲۷)

حضرت موسیٰ ؑ نے کہا، اے میرے رب میری جان اور میرے بھائی کے سوا میرے اختیار میں کچھ نہیں۔ سو ہمارے اور اس نافرمان (فاسق) قوم میں جدائی کردے۔

حضرت موسیٰ ؑ یہ دُعا اس وقت کر رہے ہیں، جب ان کی قوم جو اس وقت تک ان کا حکم مانتی آئی تھی، اب اچانک یہ اعلان کرتی ہے کہ وہ لاتعداد دشمنوں سے لڑنے کے لیے تیار نہیں، حالانکہ حضرت موسیٰ ؑ نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا تھا، ''ان کے مقابلے میں دروازے سے داخل ہو جاؤ، اگر داخل ہو گئے تو تمہاری فتح یقینی ہے۔ اگر تم واقعی مومن ہو تو خدا پر بھروسہ کرو۔'' تجزیے کے بعد بالآخر ہم اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بلاشک وشبہ یہ بھی کفر کا اظہار تھا، لیکن اس اظہار میں ایک خاص معنی کا اضافہ تھا، جس کی وجہ سے معنوی طور پر یہ لفظ خالصتاً کفر کی بجائے نفاق یعنی مذہبی منافقت سے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔ بلکہ مندرجہ ذیل آیت تو علانیہ طور پر لفظی اعتبار سے بھی فسق اور نفاق کے درمیان معنویاتی مساوات کی تصدیق کرتی ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (التوبہ:۶۸)

تحقیق منافق ہی فاسق ہیں۔

مندرجہ ذیل آیات میں ایسے امیر لوگوں کا ذکر ہے، جو حضرت محمد ﷺ کو خوش کرنے کے لیے ان سے صرف زبانی طور پر عقیدت کا اظہار کرتے تھے، لیکن جب ان کی جان و مال کی قربانی کا موقع آتا تو پیٹھ پھیر لیتے اور جہاد میں شریک نہ ہوتے۔

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ۔ (التوبہ:۹٦)

وہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں، تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ۔ اگر تم راضی ہو بھی گئے تب بھی اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں سے راضی نہیں ہوگا۔

یہی مفہوم اس سورت کی مندرجہ ذیل آیت سے بھی نکلتا ہے۔ ہم اس آیت کا ذکر اس لیے بھی کر رہے ہیں کہ اس میں ان عناصر کا تفصیل سے ذکر ہے جو تذبذب کے شکار مومنین ایمان کے راستے سے ہٹ کر فسق کی برائی میں مبتلا ہونے کا سبب بن سکتے ہیں۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔ (التوبہ:۲٤)

اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بیویاں اور برادری اور مال جو تم نے کمائے اور تجارت جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور حویلیاں جن کو تم پسند کرتے ہو، تم کو اللہ، اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ پیارے ہیں، تو انتظار کرو، حتیٰ کہ اللہ اپنا فیصلہ سنائے۔ اللہ فاسق لوگوں کو راستہ نہیں دیتا۔

اسی سورت میں آیات ۴۹-۶۰ میں فاسق کے بنیادی خصائل مزید تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ ہم ان تمام آیات کو نقل کرنے کی بجائے ان آیات میں بیان کردہ ان خصوصیات کی فہرست اختصار کے ساتھ درج کر دیتے ہیں۔

(۱) فاسق اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ وہ مومنین کے ساتھ ہیں۔ وہ ایسا صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی عسکری قوت سے خوف زدہ ہیں۔

(۲) اندر سے یہ لوگ کافر ہیں اور مرتے دم تک کفر کی حالت میں رہیں گے۔

(۳) ان کا کفریہ مزاج ان کے رویئے سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ عبادت میں سستی کرتے ہیں، اور اللہ کی راہ میں بے دلی سے خرچ کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں حضرت محمد ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ اعلان کر دیں۔

قُلۡ اَنۡفِقُوۡا طَوۡعًا اَوۡ كَرۡهًا لَّنۡ يُّتَقَبَّلَ مِنۡكُمۡ‌ؕ اِنَّكُمۡ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا فٰسِقِيۡنَ۔ (التوبہ:۵۳)

کہہ دو کہ تم خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے، تم سے ہرگز قبول نہ ہوگا، تم بے شک فاسق لوگ ہو۔

(۴) جب انہیں نیکی پر مجبور کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں: ائۡذَنۡ لِّىۡ وَلَا تَفۡتِنِّىۡ (التوبہ:۲۹)۔ (مجھے چھوڑ دو اور لبھاوے نہ دو۔)

(۵) اگر حضرت محمد ﷺ کو خوش بختی ملتی ہے تو وہ تنگ پڑتے ہیں، لیکن اگر کوئی مشکل پڑتی ہے تو باغ باغ ہو جاتے ہیں اور خوشی کے مارے پیٹھ پھیر کر چلے جاتے ہیں۔

(۶) وہ زکوٰۃ اور خیرات کی تقسیم پر ہمیشہ کُڑھتے ہیں، اگر انہیں حصہ مل جائے تو خوش ہو جاتے ہیں ورنہ ناراض رہتے ہیں۔ وہ یا تو بھول جاتے ہیں یا اس بات کو نظرانداز کرتے ہیں کہ زکوٰۃ اور خیرات غریبوں اور محتاجوں کی مدد کے لیے استعمال ہوتی ہے اور امیر ہونے کی وجہ سے ان کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔

ہم اس تفصیل سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ فاسق بالکل کافر تو نہیں ہے، کیونکہ نام نہاد ہی سہی، وہ مسلمانوں کے گروہ میں شامل تو ہے۔ صرف یہ ہے کہ وہ تذبذب میں ہے اور ایسا مسلمان ہے جس پر پورا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ وہ ہر موقع پر اپنے نفاق کے مزاج کا اظہار کیے بغیر نہیں رہتا۔

بدعہدی اور فریب:

قول اور فعل کا تضاد ان معاملات میں کھل کر سامنے آتا ہے، جن کا تعلق ایسے وعدوں یا معاہدوں کی پابندی سے ہوتا ہے، جو کسی سے کیے جائیں۔

یہ لوگ جس طرح حضرت محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو خوش کرنے کے لیے کچھ بھی کہنے کے لیے تیار رہتے ہیں، پھر ایفائے عہد فریضے کو جس طریقے سے مکمل طور پر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کے قول و فعل کے اس تضاد کو مندرجہ ذیل پہلی آیت بہت وضاحت سے بیان کرتی ہے۔

> كَيْفَ وَإِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ إِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ۔ (التوبہ:۸)
>
> کیونکر ہو جبکہ اگر وہ تم پر قابو پا جائیں تو پھر قرابت کا خیال کریں، نہ عہد کا۔ اپنے منہ کی باتوں سے وہ تم کو راضی کر لیتے ہیں، جبکہ ان کے دل اس کو نہیں مانتے، ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔
>
> وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ۔ (الاعراف:۱۰۰)
>
> ہم نے ان میں سے اکثر میں عہد کا نباہ نہیں پایا اور ان میں سے اکثر کو فاسقین پایا۔
>
> فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (آلِ عمران:۸۲)
>
> پھر اس کے بعد جو پھر جائے، تو یہ لوگ فاسق ہیں۔
>
> الْفٰسِقِيْنَ۔ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ ۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ (البقرہ:۲۷)

فاسق وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے مضبوط معاہدہ کرنے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں اور جس کا اللہ نے ملانے کا حکم دیا، اس کو کاٹ ڈالتے ہیں۔ یہ زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ یہ لوگ گھاٹے میں ہیں۔

سورۃ الزخرف میں آیات ۴۵-۵۵ میں فسق کی نسبت فرعون اور اس کی قوم سے کی گئی ہے۔ اس کی وجہ ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو واضح نشانیاں دے کر بھیجا اور انہیں کہا کہ وہ اعلان کر دیں:

اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (الزخرف:٤٦)

میں تمام جہانوں کے رب کا بھیجا ہوا ہوں۔

وہ لوگ اللہ کی آیات کا مذاق اُڑاتے رہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو دردناک عذاب سے پکڑا تو وہ حضرت موسیٰؑ سے کہنے لگے۔

وَقَالُوْا یٰٓاَیُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ۔ (الزخرف:٤٩)

اور کہنے لگے: اے جادوگر ہمارے واسطے اپنے رب کو پکار، جیسا کہ اس نے تم سے عہد کیا ہے تو ہم ضرور راہِ راست پر آ جائیں گے۔

لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان سے عذاب ہٹا لیا، تو کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اُنہوں نے اپنا وعدہ توڑ ڈالا۔ مزید یہ کہ فرعون نے یہ دعویٰ کیا:

قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔ اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ ۙ وَّلَا یَكَادُ یُبِیْنُ۔ (الزخرف:٥١-٥٢)

بولا، اے میری قوم، بھلا مصر کی حکومت میرے ہاتھ میں نہیں، اور میرے نیچے یہ نہریں نہیں بہتیں؟ کیا تم نہیں دیکھتے؟

پھر میں اس شخص سے بہتر نہیں جو درجے میں نیچا ہے اور ٹھیک سے بات نہیں کر سکتا۔

اسی طرح اس کی قوم تذبذب کا شکار ہو گئی اور آخر میں اس کی طاعت کا دم بھرنے لگی۔

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ۔

(الزخرف: ٥٤)

اس کی قوم عقل کھو بیٹھی اور اس کی اطاعت کرنے لگی، بے شک یہ فاسق لوگ تھے۔

مشیتِ الٰہی کی مخالفت:

اللہ تعالیٰ کی مشیت کی مخالفت خواہ وہ نواہی سے بغاوت کی شکل میں ہو یا اوامر پر عمل نہ کرنے کی صورت میں ہو، قرآنِ کریم اسے ایسے فسق سے تعبیر کرتا ہے جو شدید ترین عذاب کا مستحق ہے۔ بعض اوقات اس سے بھی بڑھ کر خود فسق ایسے اعمال کی علامت ہے، جن کو اللہ تعالیٰ شدت سے ناپسند کرتا ہے:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ۔ (الكهف: ٤٨)

جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا۔ وہ جنوں کی قوم سے تھا۔ چنانچہ اس نے اللہ کے حکم سے بغاوت (فسق) کی۔

اس آیت سے یہ بات بھی صراحت سے واضح ہو جاتی ہے کہ بعض عبادات میں فسق سے مراد اللہ کے اوامر کو ترک کرنا ہے۔ ذیل کی آیت میں اس کے بالکل برعکس فعل کی مثال وہ فعل بجا لانا ہے، جس سے منع کیا گیا ہے:

وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۖ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ (البقرة: ٢٨٢)

جب تم آپس میں سودا کرو تو گواہ کر لیا کرو۔ نہ لکھنے
والا نقصان کرے نہ گواہ، اگر تم ایسا کرو گے تو اپنے ساتھ فسوق
(گناہ) کی بات ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو۔

''جس سے خدا نے منع کیا ہے'' کا مطلب فطری طور پر یہی ہے کہ جسے اللہ نے قابلِ مذمت قرار دیا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات فسق قریب قریب (اللہ کے نزدیک) ''قابلِ مذمت'' کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ قرآنِ کریم میں ''میسر'' کا کھیل (تیروں کے ذریعے قسمت معلوم کرنے کا جوا)، اللہ کے ماسوا دوسروں کے نام پر ذبح کیے ہوئے جانوروں کا کھانا، لواطت، سب وشتم وغیرہ فسق میں شمار کیے گئے ہیں۔

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ
(الانعام: ۱۲۱)

جس ذبیحہ پر اللہ کا نام نہ لیا جائے، اسے نہ کھاؤ، یہ
فسق ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ
فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (النور: ٤)

جو لوگ محفوظ (شادی شدہ) عورتوں پر الزام لگاتے
ہیں اور چار گواہ پیش نہیں کرتے تو انہیں اسّی (۸۰) درے مارو
اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو، بے شک یہ لوگ فاسق ہیں۔

عمومی انداز میں ایسے تمام افعال کو جن میں ایمان کے مقابلے میں کفر مضمر ہے، فسق کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل دو آیات میں فاسق، مومن کے مقابل استعمال ہوا ہے۔

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا
اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۔ (المائدہ: ۸٤)

اگر یہ لوگ اللہ پر، نبی پر اور جو اس پر اُترا ہے، اس پر

یقین رکھتے تو ان کو دوست نہ بناتے، لیکن ان میں سے اکثر
فاسق ہیں۔

اس آیت میں واضح طور پر اہلِ کتاب یعنی یہود کو فاسق کہا جا رہا ہے، کیونکہ وہ اللہ اور اس کے نازل کردہ احکامات پر یقین نہیں رکھتے۔ اس بات کا ناقابلِ تردید ثبوت یہ ہے کہ وہ مشرکین کے ساتھ دوستی کا دم بھر رہے ہیں۔

وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (آلِ عمران:۱۱۰)

اگر اہلِ کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہتر
ہوتا۔ ان میں سے بعض تو مومن ہیں، لیکن اکثر فاسق ہیں۔

اگلی آیت میں قریب قریب یہی صورتِ حال ذرا مختلف انداز سے بیان ہوئی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، ''ان کے دل پتھر کے ہو گئے ہیں۔'' کی عبارت، ضدی پن کے اس رویّے کو بیان کرنے والی بار بار استعمال ہونے والی عبارت ہے جو کافروں سے مخصوص ہے، جبکہ ''دل کی نرمی'' سچے مومنوں کی خصوصی علامت ہے۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۔ (الحدید:۱۶)

کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، وقت نہیں آیا
کہ ان کے دل اللہ کی یاد سے اور اس کے نازل کردہ کی وجہ سے
نرم ہوں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہوں جن کو پہلے کتاب دی
گئی تھی، پھر ان کو بہت لمبی مہلت دی گئی۔ ان کے دل سخت ہو
گئے، ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔

چونکہ ایمان سے مراد اللہ کی ہدایت کی پیروی اور اس اعتبار سے سیدھے

راستے پر چلنا ہے، اس لیے جو ایسا نہیں کرتا، وہ فاسق ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۔

(الحدید:۲۶)

ہم نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو بھیجا اور ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب ٹھہرائی، ان میں سے کوئی راہِ راست پر ہے اور اکثر فاسق ہیں۔

اسی وجہ سے ''اللہ کو بھول جانا'' فسق کا ارتکاب ہے۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ مندرجہ ذیل آیت میں یہ بات اس طرح بیان کی گئی ہے: جو خدا کو بھلا دیتا ہے، اللہ اسے ایسا بنا دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھول جائے، حتیٰ کہ وہ فاسق بن جائے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (الحشر:۱۹)

تم ان جیسے نہ ہو جاؤ، جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا، پھر اللہ نے ان کو ان کے جی بھلا دیے، یہی لوگ فاسق ہیں۔

یہاں ہم یہ اضافہ کرتے چلیں کہ سورۃ یونس (آیت ۳۳) میں الذین فسقوا سے مراد مشرکین ہیں۔ چنانچہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شرک بھی فسق کی ایک صورت ہے۔

فاجر:

فاسق کے برعکس جس کا ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں، لفظ ''فاجر'' (فجر، فجور) بعد میں اسلامی علم الکلام کی اصطلاح کے طور پر نہیں ابھرا۔ ان مخصوص معنی میں اس لفظ کا قرآنِ کریم کے بعد کے دور میں کوئی تاریخی وجود نظر نہیں آتا، لیکن ایک عام لفظ اور ایک غیر اصطلاحی اخلاقیاتی لفظ کے طور پر قرآن کے بعد کے ادب میں بھی یقیناً اس کا اتنا ہی اہم کردار رہا ہے، جتنا زمانۂ جاہلیت میں تھا۔

بعض اوقات یہ لفظ علم الکلام کی کتابوں میں ملتا ضرور ہے، لیکن محض لفظ مومن کے تصور کے سیاق میں جہاں یہ اس کے منفی اور متضاد مفہوم کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں مثبت مفہوم کے لیے لفظ بر، بار (برّ، نیکی) استعمال ہوا ہے۔ یہاں لفظ فاجر سے مراد وہ مومن ہے، جو غلط عمل کا مرتکب ہوا ہے، مثلاً اس نے شراب پینے کا گناہ کیا ہے۔

کتاب الفقہ الاکبر میں جو امام ابوحنیفہ سے منسوب کی جاتی ہے، مثلاً یہ لکھا ہے کہ الصلوٰۃ خلف کل برو فاجر من المؤمنین جائزہ۔ (مومنین میں سے کسی کے بھی پیچھے نیکوکار یا فاجر، نماز جائز ہے)[۳] ظاہر ہے یہاں فاجر سے مراد ایسا مومن ہے جس سے غلط عمل تو سرزد ہوا ہے، لیکن ابھی وہ امتِ مسلمہ کا ایک فرد شمار ہوتا ہے۔ تاہم قرآن کریم میں ایسی واضح معنویاتی تحدید نہیں ملتی۔

لفظ ''فاجر'' کے بارے میں قرآن کریم کی آیت سے اس سے زیادہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کسی حد تک کافر کے مترادف ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کا بنیادی معنی راستے سے ہٹ جانا ہے، اس لیے استعاراتی طور پر اس کے معنی ہیں (صحیح) راستے سے ہٹ جانا اور پھر قابلِ مذمت فعل کا ارتکاب کرنا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ ایک قرآنی آیت میں فجر کا صیغہ بعینہٖ کفر کے فعل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے: یعنی قیامت کے بارے میں اسلام کی اخروی تعلیمات سے انکار کا ارتکاب۔

> اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَہٗ۔ بَلٰی قَادِرِیْنَ
> عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ۔ بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَہٗ۔ یَسْئَلُ
> اَیَّانَ یَوْمُ الْقِیٰمَۃِ۔ (القیمۃ:۳-۶)
>
> کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہیں کر سکیں گے۔ کیوں نہیں ہم تو اس کی انگلیوں کی پوریں تک درست کر سکتے ہیں۔ انسان تو چاہتا ہے کہ اپنے سامنے کی بات کا انکار (یَفْجُرَ) کر دے۔ وہ پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب آئے گا؟

يَفْجُرَ اَمَامَهٗ کی مندرجہ بالا تعبیر کو قطعی نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم اگر یہ درست ہے اور اس کے درست ہونے کے قوی امکانات ہیں، تو امامہ (اس کے آگے) کا اشارہ وقوعِ قیامت کی طرف ہے۔ اور اس کا سیاق میں یہ ٹکڑا بے حد اہم ہے۔ اس تعبیر کی تائید میں ایک اور آیت کا حوالہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس آیت میں قیامت کے جھٹلانے (تکذیب) کو فاجر کی خصوصیات کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

كلا ان كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِي سِجّينٍ، وَمَا اَدْرٰكَ مَا سِجّينٌ كِتٰبٌ مَرْقُومٌ، وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِيْنَ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيومِ الدِّينِ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ۔ (التطفیف: ۷-۱۲)

ہرگز نہیں، بے شک فاجروں کا اعمال نامہ سجین میں ہے اور تم کو کیا خبر ہے سجین کیا ہے؟ یہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے۔ خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی جنھوں نے روزِ جزا کو جھٹلایا۔ اس کو وہی جھٹلاتا ہے جو حد سے بڑھ نکلنے والا (معتدی)[۴] گنہ گار ہے۔

مندرجہ ذیل آیت میں (فجر کے حاصلِ مصدر) فجور کو باقاعدہ تقویٰ یعنی خوف (خدا) کے متقابل لایا گیا ہے۔ تقویٰ کے بارے میں پہلے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔ (الشمس: ۷-۸)

قسم ہے نفس کی اور جیسا کہ اس کو ٹھیک بنایا۔ پھر اسے نافرمانی (فجور) اور ڈر (تقویٰ) کی سمجھ دی۔

اس آیت میں یہ بات زور دے کر کہی گئی ہے کہ ہر انسانی جان کو پیدا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر نیکی اور خوف کی اور اس کے برعکس ''فجور'' کا جذبہ ڈال دیا ہے۔ صرف اسی بات سے ہمیں لفظ فجور کی معنوی ساخت کے بارے میں

بہت کچھ پتہ چلتا ہے۔ یہاں کم از کم اس بات کی واضح نشان دہی موجود ہے کہ ''فجور'' کے معنی کا کفر کے اس پہلو سے بہت زیادہ تعلق ہے جو براہِ راست خوفِ خدا کی ضد ہے۔

دراصل قرآنِ کریم میں بعض اوقات ''فاجر'' کا لفظ ''کافر'' کے ساتھ بھی مذکور ہے۔

> وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَاتَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا۔ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَايَلِدُوْآ اِلَّافَاجِرًا كَفَّارًا۔
> (النوح:۲۷-۲۸)
>
> حضرت نوح نے کہا: اے رب زمین پر کافروں کا ایک گھر بھی نہ چھوڑنا، یقیناً اگر تو ان کو چھوڑ دے گا تو وہ تیرے بندوں کو بہکائیں گے اور ان کے ہاں صرف فاجر اور کفار پیدا ہوں گے۔
>
> وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ۔ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ۔ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ۔ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ۔
> (عبس:۳۸-۴۲)
>
> اس روز (قیامت) بعض چہرے روشن، ہنستے مسکراتے ہوں گے اور کچھ چہرے گرد آلود سیاہی چڑھے ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کافر اور فاجر ہیں۔

آخر میں ہم ایسی آیت کا ذکر کریں گے، جہاں فاجر ''بار'' (نیکوکار) کے بالمقابل استعمال ہوا ہے۔ ''فاجر'' اور ''بار'' کے معنویاتی تضاد کا ذکر اوپر ''الفقہ الاکبر'' کی ایک عبارت کے حوالے سے ہو چکا ہے۔ وہاں ہم نے فاجر کے معنی بدعمل اور بار کا معنی نیکوکار کیا تھا۔ تاہم قرآنی سیاق و سباق میں لفظ بار کا معنویاتی ڈھانچہ اتنا سادہ نہیں۔

''بار'' ایسا مبہم لفظ ہے جس کا معنویاتی مرکزی نقطہ نکالنا بہت مشکل کام

ہے۔ ہم آئندہ چل کر اس پر بات کریں گے۔ سرِدست ہم یہ کہنے پر اکتفا کریں گے کہ یہ لفظ ایسے انسان کی خصوصیات کو بیان کرتا ہے جو اللہ کا خصوصی طور پر فرماں بردار ہے اور اس متقی طبیعت کا اپنے رویّے سے اس طرح اظہار کرتا ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ غیرمعمولی حد تک نرمی اور محبت سے پیش آتا ہے، خواہ وہ رشتہ دار ہوں یا اجنبی۔ اس طرح کے لوگ قدرتی طور پر جنت میں جائیں گے۔ ''فجار'' جو ان کے بالکل برعکس ہیں، وہ دوزخ میں جائیں گے۔

> اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ۔ وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ۔ یَّصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ۔ وَمَاهُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ۔ (الانفطار: ۱۳-۱۶)
>
> بے شک نیک لوگ جنت میں ہیں اور فاجر دوزخ میں ہیں، وہ روزِ جزا اس میں ڈالے جائیں گے اور اس سے کبھی نہ نکالے جائیں گے۔

ظالم:

جیسا کہ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ ظالم کا ترجمہ برائی کرنے والا، غلط کام کرنے والا کیا جاتا ہے اور ظلم کے معنی برائی، خرابی، بے انصافی اور استبداد کرتے ہیں۔ یہ مادہ قرآنِ کریم میں نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ کہنا کافی نہیں کہ لفظ قرآنِ کریم میں منفی انداز کے حامل الفاظ میں سب سے اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ قرآنِ کریم کے تقریباً ہر صفحے پر کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔

بہت مستند ماہرینِ لغت کی رائے میں ظلم کے بنیادی معنی ہیں: ''کسی شے کو غلط جگہ پر رکھنا۔'' اخلاقیات میں اس کا معنی یوں بیان کیا جاتا ہے کہ: ''کوئی کام اس طرح کرنا کہ مقررہ حدود کی خلاف ورزی ہو اور کسی دوسرے شخص کے حق میں دخل اندازی ہو۔'' مختصر اور عام الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ظلم بے انصافی کا نام ہے، ان معنوں میں کہ آدمی اپنی حدود سے تجاوز کر جائے اور وہ کام کرے، جس کا اسے حق

نہیں ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قرآن میں بار بار کہا گیا ہے کہ اللہ کسی کے ساتھ ظلم نہیں کرتا، چیونٹی کے وزن جتنا بھی نہیں اور ایک کھجور کے ریشے کے برابر بھی نہیں۔ (مثلاً ملتے جلتے مفہوم کے لیے دیکھیے، سورۃ النساء:۴۰،۴۹، ۵۲) ایک آیت میں اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ وہ مومنوں کے ساتھ ظلم نہیں کریں گے۔

وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ۔ (ق:۲۸)

اور میں بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ کے حوالے سے ظلم کا اشارہ زیادہ تر یومِ حساب کی طرف ہے۔ بالفاظِ دیگر اور زیادہ واضح عبارت میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر روح کو اس کے ان اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا جو اس نے زمین پر زندگی کے دوران کیے۔ اگر نیک عمل ہیں تو وہ دُگنا بدلہ دے گا۔ اگر برے عمل ہیں تو ان کی مناسب سزا دے گا۔ کسی بھی صورت میں انسان کے ساتھ ظلم نہیں ہوگا۔

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ

(المومن:۱۷)

آج ہر جی کو جیسے اس نے کام کیے، بدلہ ملے گا۔ آج کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ (البقرۃ:۲۸۱)

اور اس دن سے ڈرو جب تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، اور ہر شخص کو اس نے جو کمایا ہے، اس کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں ہوگا۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ۔ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ۔ (الانفال:۵۰-۵۱)

اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی جان قبض

کرتے ہیں اور وہ ان کے منہ پر اور پیچھے مارتے ہیں اور کہتے ہیں جلنے کا عذاب چکھو۔ یہ اس کا بدلہ ہے جو تم نے آگے بھیجا۔ یہ طے ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

انسانوں کے کسی گروہ پر عذابِ الٰہی اسی دُنیا میں روزِ قیامت سے پہلے بھی آ سکتا ہے۔ پرانے زمانے کی بستیوں کے بہت سے کھنڈرات اللہ کے قہر و غضب کے شواہد مانے جاتے ہیں۔ لیکن ان مثالوں میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ خدا نے ان بستیوں کو اسی وقت تباہ کیا، جب وہ اس کی پوری طرح سزاوار ہو گئیں۔ اس نے اپنے رسولوں کے ذریعے بار بار انتباہ کے بعد ہی ان پر عذاب بھیجا، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس وقت سزا دیتا، جب وہ نیک کام کر رہے ہوں یا برائی کرنے والوں کو بغیر تنبیہہ کے سزا دیتا تو یہ ظلم ہوتا۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ۔ (ھود:۱۱۹)

اور تیرا رب ہرگز ایسا نہیں کہ بستیوں کو ظلم سے ہلاک کرے، جبکہ ان کے لوگ نیک ہوں۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ۔ (الانعام:۱۳۱)

یہ اس لیے کہ تیرا رب بستیوں کو ظلم سے ہلاک کرنے والا نہیں، جبکہ اس کے لوگ بے خبر ہوں۔

انسانوں کو ان کے اعمال کے نتائج بھگتنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ دوزخ کی آگ کا عذاب جو برائی کرنے والے بھگتیں گے، وہ بھی درحقیقت ان کے اپنے کیے کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ ظالموں کے لیے عذابِ الٰہی کے سلسلے میں قرآنِ کریم میں بار بار ظلم نفسہ (نفس کے ساتھ برائی یعنی انسان جو اپنی روح کے ساتھ یا اپنے ساتھ ظلم یا برائی کرتا ہے) کی اصطلاح مذکور ہے۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ اللہ کسی کے ساتھ ظلم نہیں کرتا، انسان اپنے ساتھ خود ظلم کرتا ہے۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (البقرۃ:۲۳۱)

جو ایسا کرے گا (یعنی اپنی بیویوں پر زیادتی کرے گا)
وہ بے شک اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ۭ وَمَا ظَلَمَھُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَھُمْ يَظْلِمُوْنَ۔ (آلِ عمران:۱۱۳)

جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے مال اولاد ان کے کسی کام نہیں آئیں گے۔ یہ لوگ دوزخ کی آگ والے ہیں، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اس دُنیاوی زندگی میں وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں، اس کی مثال ایک ہوا کی ہے، جس میں پالا ہو اور وہ ان لوگوں کی کھیتی کو لگ جائے اور اسے ہلاک کر دے جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ اپنے اوپر خود ظلم کر رہے ہیں۔

اب اللہ کے افعال کے اعلیٰ درجے سے نیچے اتر کر ہم انسانی اعمال کی طرف آئیں تو ابتدا ہی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ظلم کا وقوع دو مختلف جہتوں میں ممکن ہے۔(۱) انسان کا اللہ پر اور (۲) انسان کا انسان پر۔ پہلی جہت میں ظلم یہ ہے کہ انسان ان حدود سے تجاوز کرے جو اللہ تعالیٰ نے انسانی رویّے کے لیے مقرر کی ہیں۔ دوسری جہت میں ظلم کا مطلب ہے کہ کسی معاشرے میں سماجی زندگی کے لیے جو مناسب رویّہ سمجھا جاتا ہے، اس کی حدود کی خلاف ورزی کرے۔ اگرچہ درحقیقت ان دونوں جہتوں میں تمیز کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے، کیونکہ خدا کا قرآنی تصور یہ ہے کہ وہ انسانی معاملات کے ہر لمحے میں دخیل ہے۔ چنانچہ سورۂ یوسف میں چوری کے ارتکاب کو خالص انسانی اصطلاح اور انسانی درجے پر ظلم کی مثال بتایا گیا ہے۔

قَالُوا جَزَآؤُهٗ مَنۡ وُّجِدَ فِیۡ رَحۡلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجۡزِی الظّٰلِمِیۡنَ۔ (یوسف:۷۵)

کہنے لگے، اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے اسباب میں سے ملے، وہی اس کے بدلے میں جائے، ہم ظالموں کو یہی سزا دیتے ہیں۔

لیکن سورۂ مائدہ میں اسی فعل کو اللہ تعالیٰ کے خلاف ظلم کا ارتکاب بیان کیا گیا ہے۔

فَمَنۡ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِ ظُلۡمِهٖ وَاَصۡلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ یَتُوۡبُ عَلَیۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ۔ (المائدہ:۳۹)

جس نے اپنے ظلم (چوری کا ارتکاب) کے بعد توبہ کی اور اصلاح کی تو اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

قرآنِ کریم میں معاشرے میں انسانی رویّے کے ان ضابطوں کو جو اللہ نے انسانوں پر لاگو کیے ہیں، حدود اللہ کہا گیا ہے۔ جو شخص ساری زندگی اللہ کی مقررکردہ حدود کے اندر رہے گا، قیامت کے دن اسے اُس جنت میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی، جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ اس کے برعکس وہ شخص جو ان حدود سے تجاوز کرے گا، اسے آگ میں ڈالا جائے گا، جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا اِنَّمَا یَاۡكُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِهِمۡ نَارًا ؕ وَسَیَصۡلَوۡنَ سَعِیۡرًا۔ (النساء:۱۰)

جو لوگ یتیموں کا مال ظلم کر کے کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں، وہ برے ٹھکانے تک پہنچیں گے۔

تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَمَنۡ یَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ۔ (البقرۃ:۲۲۹)

یہ اللہ کی حدود ہیں، سو ان سے آگے مت بڑھو اور اللہ

کی حدود سے آگے بڑھے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

اس بات کو ظلمِ نفس سے بھی عبارت کیا گیا ہے۔

وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ (الطلاق: ۱)

یہ اللہ کی حدود ہیں، جو اللہ کی حدود سے آگے بڑھے تو وہ اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔

مشیتِ الٰہی اتنی گہری ہے کہ اس کی کوئی تہ نہیں۔ انسانی ذہن اس کی گہرائیوں میں اتر نہیں سکتا اور نہ سمجھ سکتا ہے کہ اللہ جو کرتا ہے، وہ کیوں کرتا ہے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی مخصوص حد کا سبب انسانوں کے لیے لاینحل سا ہی رہتا ہے۔ حد بس اسی لیے ہے کہ اللہ نے اسے مقرر کر دیا ہے۔ مثلاً یہی جنت کے درخت کے بائبلی تصور کی ہے، جس کا قرآنِ کریم میں اس طرح ہے۔

وَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (البقرۃ: ۳۵)

اور ہم نے کہا: اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ اس میں جو چاہو، جہاں کہیں سے چاہو، کھاؤ اور اس درخت کے پاس مت جانا، پھر تم ظالم ہو جاؤ گے۔

تاہم بہت سی ایسی مثالیں ہیں، جن میں حدوں کا مقرر کرنا، سماجی بھلائی کے معنوں میں ہے۔ یہ ان صورتوں میں ہے جب ایک مخصوص حد سے کسی معاشرے کے لوگوں کی زندگی میں واضح طور پر براہِ راست فائدہ مطلوب ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن میں سود کی ممانعت کا حکم فرماتا ہے اور سود کو ظلم کا نام دیتا ہے۔ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔ (البقرۃ: ۲۷۹) ''نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم ہو۔'' سورۃ النساء میں وراثت کے احکام کی تفصیل کے بعد اعلان ہوتا ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ

جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ وَ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ۔ وَمَنۡ یَّعۡصِ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوۡدَہٗ یُدۡخِلۡہُ نَارًا خَالِدًا فِیۡہَا ۪ وَلَہٗ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ۔ (النساء:۱۷-۱۸)

یہ اللہ کی حدیں ہیں، جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا، جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ جو شخص اس کی حدود سے آگے بڑھے گا، اسے وہ آگ میں ڈالے گا، جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔

طلاق کے قوانین جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا، اسی سلسلے کی ایک اور مثال ہیں۔

یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوۡہُنَّ لِعِدَّتِہِنَّ وَاَحۡصُوا الۡعِدَّۃَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰہَ رَبَّکُمۡ ۚ لَا تُخۡرِجُوۡہُنَّ مِنۡۢ بُیُوۡتِہِنَّ وَلَا یَخۡرُجۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّاۡتِیۡنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ ؕ وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰہِ ؕ وَمَنۡ یَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰہِ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَہٗ ؕ (الطلاق:۱)

اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت پر طلاق دو اور عدت کو گنتے رہو اور اللہ سے ڈرو، جو تمہارا رب ہے۔ ان کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور وہ بھی نہ نکلیں، مگر جب وہ صریح بے حیائی کا ارتکاب کریں۔ یہ اللہ کی حدود ہیں، جو کوئی اللہ کی حدود سے آگے بڑھتا ہے، وہ اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔

یہاں بہت آسانی سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ اسی طرح کی حدود ہیں، جو بعد میں بتدریج قانونِ الٰہی یعنی شریعت بنیں۔

تاہم حدود بہت زیادہ وسیع معانی کی حامل ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، حدود سے تجاوز کے معنوں میں ظلم سے مراد وہ انسانی فعل ہے، جو مقرر کردہ حد

سے بڑھ جائے اور دوسروں کے حق میں دخیل ہو۔ یہاں یہ ذکر بیحد دلچسپ ہوگا، کہ ظلم کا یہ معنی مشرکین کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، ایک آیت میں مومنوں کے بت توڑ ڈالنے کا ذکر ہے اور اس فعل کو بت پرستوں کے نقطۂ نظر سے ظلم کی کھلی مثال بتایا گیا ہے۔

فَجَعَلَهُمْ جُذَاذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ۔ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (الانبیاء: ۵۹ - ۶۰)

پھر اس نے ان (بتوں) کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، سوائے ان میں سے بڑے کے شاید وہ ان کی طرف رجوع کریں۔ وہ کہنے لگے، ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ فعل کس نے کیا، وہ تو کوئی ظالم ہے۔

ظلم کے فعل کے ارتکاب کا مطلب ہے، کسی شخص کو بلاوجہ شدید تکلیف پہنچانا۔ چنانچہ اگر تجزیہ کیا جائے تو بالآخر نتیجہ نکلتا ہے کہ ظلم کے معنی کا انحصار اس نسبت پر ہے، جس سے آپ اس فعل کو دیکھتے ہیں۔ مذکورہ بالا آیت میں بتوں کی توڑ پھوڑ ظلم کی مثال بنتی ہے، کیونکہ مشرکین کے نقطۂ نظر سے یہ فعل بلاوجہ ہے۔ اس کے برعکس مومنین کے نقطۂ نظر سے یہ فعل ہر طرح سے جائز ہے۔ اسی طرح اگر کافر مسلمانوں کو ان کے گھروں سے صرف اس لیے نکال دیں کہ مسلمان کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے تو یہ فعل مسلمانوں کی نظروں میں سراسر ظلم ہے، کیونکہ اس کا کوئی ممکن جواز نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس کافروں کے نقطۂ نظر سے مسلمانوں کا عقیدۂ توحید ان کے خلاف ایسے سلوک کے لیے بہت بڑی وجہ جواز ہے۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ۔ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (الحج: ۴۰ - ۴۱)

ان لوگوں کو جن سے کافر لڑتے ہیں، اجازت دی جاتی

ہے، کیونکہ ان پر ظلم ہوا اور اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں، جن کو ناحق ان کے گھروں سے نکالا گیا، (اُن کا کوئی جرم نہیں) سوائے اس کے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے۔

اسی طرح اگر مسلمان اپنے غریب بھائیوں سے صرف اس لیے نفرت کریں کہ وہ غریب ہیں تو یہ بھی ظلم ہوگا، کیونکہ یہ بات کسی طرح بھی اس کا جواز نہیں بنتی۔

وَلَاتَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَاعَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (الانعام: ۵۲)

ان لوگوں کو جو (دعوتِ حق پر ایمان رکھتے ہیں اور) صبح و شام خدا کے حضور مناجات کرتے اور اس کی رضامندی چاہتے ہیں، اپنے پاس سے نہ نکالو، ان کے اعمال کی جواب دہی تمہارے ذمے نہیں ہے، نہ تمہاری جواب دہی ان کے ذمے ہے کہ (اس ڈر سے) انہیں نکال دو۔ (ایسا نہ کرو) اگر کرو گے تو ظلم کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

ایک اور آیت میں مسلمانوں کو فہمائش کی جا رہی ہے، اگر وہ یتیموں کے مال و جائیداد کے والی بنائے گئے ہیں تو اس کو بلاوجہ ہضم کر کے ظلم کا ارتکاب نہ کریں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا۔ (النساء: ۱۰)

بلاشبہ جو لوگ یتیموں کا مال بلا استحقاق کھاتے ہیں، وہ اپنے شکموں میں آگ بھر رہے ہیں، اور وہ عن قریب جلتی آگ میں داخل ہوں گے۔

بنیادی طور پر قرآنِ کریم میں ظلم کا لفظ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے استعمال ہوا ہے، اس لیے فطری طور پر اس کا تعلق کافروں کے اس مخصوص رویے سے ہے، جو وہ

اللہ اور مسلمانوں کے خلاف روا رکھتے ہیں۔

آیئے ان مثالوں سے ابتدا کریں جہاں ظلم کفر کے تقریباً مترادف کے طور پر آیا ہے۔ چلتے چلتے یہ ذکر بھی کر دیں کہ سورۃ الانعام آیت ۱۳۵ میں کافر کی جگہ ظالم کا جو لفظ استعمال ہوا ہے، اس کے بارے میں علامہ بیضاوی کہتے ہیں کہ معنوی طور پر ظلم کفر سے زیادہ جامع اور وسیع معانی کا حامل ہے۔(۵)

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْآ اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَايَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (آلِ عمران:۸۶)

خدا ایسے لوگوں کو کیوں کر ہدایت دے جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے، حالانکہ پہلے اس بات کی گواہی دے چکے کہ یہ پیغمبر برحق ہیں، اور ان کے پاس دلائل بھی آ گئے۔ اور خدا ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض خصوصیات جو صرف کفر سے مخصوص ہیں، ظلم کے لفظ کے ساتھ بھی بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً جو شخص وحی الٰہی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مذاق اُڑاتا ہے اور رسول کو جادوگر اور شاعر بناتا ہے، ایسے شخص کو بعض اوقات کافر کی بجائے ظالم کہا گیا ہے۔

مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ۔ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ۔ قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ بَلْ قَالُوْآ اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۢ بَلِ افْتَرٰهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ ۖ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ۔ (الانبیاء:۲-۵)

ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نصیحت کی باتیں پیہم آتی ہیں، مگر کبھی ایسا نہ ہوا کہ اُنہوں نے جی لگا کر سنا ہو۔ وہ

سنتے ہیں مگر اس طرح کہ کھیل کود رہے ہیں۔ اور دل ہیں کہ یک قلم غافل اور (دیکھ) ظلم کرنے والوں نے چپکے چپکے سرگوشیاں کیں، ''یہ شخص اس کے سوا کیا ہے کہ ہماری طرح کا ایک آدمی ہے۔ پھر کیا تم جان بوجھ کر ایسی جگہ آتے ہو، جہاں جادو کے سوا اور کچھ نہیں؟''

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ (الکہف:۵۵)

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے، جسے اس کے پروردگار کی آیات یاد دلائی جائیں اور وہ ان سے گردن موڑ لے اور اپنی بداعمالیاں بھول جائے، جو پہلے کر چکا ہے۔

تکذیب یعنی اللہ کی آیات کا جھٹلانا جسے ہم کفر کی مخصوص خصلت کے طور پر ذکر کر چکے ہیں، بھی فطری طور پر ظلم کے دائرے میں شامل ہے۔ صرف ایک مثال کافی ہے۔

بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (الجمعه:۵)

جو لوگ خدا کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں، ان کی مثال بُری ہے، اور خدا ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اللہ پر جھوٹ باندھنا (افتری الکذب علی اللہ) جس کا تجزیہ ہم پہلے کر چکے ہیں، بھی ایسی ہی برائی ہے۔ تکذیب اور افتری میں فرق یہ ہے کہ تکذیب کسی دوسرے کی بیان کردہ سچائی کو جھٹلانے کو کہتے ہیں اور افتری جھوٹ گھڑنا ہے۔ بعض اوقات دونوں ایک ہی آیت میں ساتھ ساتھ آتے ہیں، اور دونوں کے لیے ظلم کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (الانعام:۲۱)

اس شخص سے بڑا ظالم کون ہے، جس نے خدا پر جھوٹ
افترا کیا یا اس کی آیتوں کو جھٹلایا، بے شک ظالم لوگ نجات نہیں
پائیں گے۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَذَبَ عَلَی اللّٰهِ وَکَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ
جَآءَهٗ اَلَیْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًی لِّلْکٰفِرِیْنَ۔ (الزمر: ۳۲)

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے، جو خدا پر جھوٹ بولے
اور سچی بات جب اس کے پاس پہنچ جائے تو اسے جھٹلائے۔ کیا
جہنم میں کافروں کا ٹھکانہ نہیں؟

مندرجہ ذیل آیت اس سلسلے کی ایک عمدہ مثال ہے، جس میں ایسے جعل سازوں کی اس خاص خصلت کو حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ
اِلَیَّ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ شَیْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
وَلَوْ تَرٰٓی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِکَةُ بَاسِطُوْٓا
اَیْدِیْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَکُمْ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا
کُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ وَکُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَکْبِرُوْنَ۔
(الانعام: ۹۳)

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ
باندھے یا یہ کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے، حالانکہ اس پر کچھ بھی وحی
نہ آتی ہو، اور جو یہ کہے کہ جس طرح کی کتاب خدا نے نازل کی
ہے، اس طرح کی میں بھی بنالیتا ہوں۔ کاش تم ان ظالم لوگوں کو
اس وقت دیکھو، جب وہ موت کی سختیوں میں مبتلا ہوں اور فرشتے
ان کی طرف عذاب کے لیے ہاتھ بڑھا رہے ہوں کہ نکالو اپنی
جانیں۔ آج تم کو ذلت کے عذاب کی سزا دی جائے گی۔ اس
لیے کہ تم خدا پر جھوٹ بولا کرتے تھے اور اس کی آیتوں سے سرکشی

کرتے تھے۔

یہی حال ان لوگوں کا ہے، جو اللہ کی آیات میں ضرورت سے زیادہ ڈوب جاتے ہیں۔ یہ وسیع الاستعمال عبارت اس مذہبی شک پسندی کے لیے بولی گئی ہے، جو اللہ تعالیٰ اور اس کی وحی کے بارے میں بے مقصد استدلال اور کٹ حجتی کو خالص ایمان اور عقیدے میں داخل کر دیتی ہے۔

ہم تفصیل سے واضح کر چکے ہیں(۶) کہ اس طرح کی کٹ حجتی کو کفر کہا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل آیت میں ایسے لوگوں کو ظالم بتایا گیا ہے۔

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ۔ (الانعام:۶۷)

اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو، جو ہماری آیتوں میں (انکار و شرارت سے) کاوشیں کرتے ہیں تو (تم ان کے ساتھ بحث کرنے میں وقت ضائع نہ کرو اور) ان سے کنارہ کش ہو جاؤ، یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں بحث و گفتگو کرنے لگیں، اور اگر ایسا ہو کہ شیطان تمہیں (یہ بات) بھلا دے تو چاہیے کہ یاد آ جانے کے بعد ایسے گروہ کی مجلسوں میں نہ بیٹھو جو ظلم کرنے والے ہیں۔

اسی طرح ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ ''وہ لوگ جن کے دل سخت ہو چکے ہیں''، کا جملہ عام طور پر کافروں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ سورۂ یوسف آیت ۵۲ میں ایسے لوگوں کو بھی ظالم کہا گیا۔ ہم یہ بھی معلوم کر چکے ہیں کہ اللہ کا راستہ روکنے کا بدنیت رویہ بھی کافروں کے مخصوص خصائل میں سے ہے۔ حضرت محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کے خلاف سازش کے تمام اعمال کے بیان سے جتنا کفر کا لفظ استعمال ہوا ہے، اتنا ہی ظلم کا لفظ ہوا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ

وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا۔ (البقرة:١١٤)

اور غور کرو، اس سے بڑھ کر ظلم کرنے والا انسان کون ہوسکتا ہے، جو اللہ کی عبادت گاہوں میں اس کے نام کی یاد سے مانع اور ان کی ویرانی میں کوشاں ہو۔

بعض اوقات دونوں الفاظ ایک ہی آیت میں ساتھ ساتھ بھی آتے ہیں۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ۔ الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ط وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ۔ (هود:١٨-١٩)

سن رکھو کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہے جو خدا کے رستے سے روکتے ہیں اور اس میں کجی چاہتے ہیں۔ اور وہ آخرت سے بھی انکار کرتے ہیں۔

لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ۔ الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ج وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ۔ (الاعراف:٤٤-٤٥)

ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو، ان ظالموں پر جو خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں اور چاہتے ہیں، وہ سیدھی راہ نہ ہو، اس میں کجی ڈال دیں، اور آخرت کی زندگی سے بھی روکتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ یَكُنِ اللّٰهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِیَهْدِیَهُمْ طَرِیْقًا۔ (النساء:١٦٧-١٦٨)

جن لوگوں نے کفر کیا اور ظلم (میں بے باک ہو گئے، اور مرتے دم تک اسی حالت میں سرشار رہے) تو خدا انہیں کبھی بخشنے والا نہیں، اور نہ انہیں (کامیابی و سعادت کی) کوئی راہ دکھائے گا۔

حضرت موسیٰؑ کی قوم کے تذکرے میں سونے کے بچھڑے کے حوالے سے

کہا گیا:

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (البقرۃ:۲ ۹ - ۹۳)

اور پھر دیکھو یہ واقعہ ہے کہ موسیٰ سچائی کی روشن دلیلوں کے ساتھ تمہارے پاس آیا، لیکن جب (چالیس دن کے لیے) تم سے الگ ہو گیا تو تم بچھڑے کے پیچھے پڑ گئے اور ایسا کرتے ہوئے تم اپنے آپ پر ظلم کر رہے تھے۔ اور جب ہم نے تم لوگوں سے عہدِ واثق لیا اور کوہِ طور کو تم پر اُٹھا کھڑا کیا (اور حکم دیا کہ) جو (کتاب) ہم نے تم کو دی ہے، اس کو زور سے پکڑو اور جو تمہیں حکم ہوتا ہے، (اس کو) سنو، تو وہ (جو تمہارے بڑے تھے) کہنے لگے کہ ہم نے سن تو لیا، لیکن مانتے نہیں، اور ان کے کفر کے سبب بچھڑا (گویا) ان کے دلوں میں رچ گیا تھا۔ (اے پیغمبر! ان سے) کہہ دو کہ اگر تم مومن ہو، تو تمہارا ایمان تم کو بری بات بتاتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ۔ (البقرۃ:٤ ٥)

اور (پھر وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ پکار رہا تھا۔ اے میری قوم! (افسوس تمہاری حق فراموشی پر) تم نے بچھڑے کی پوجا میں اپنے آپ پر ظلم کیا۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ۔ (البقرۃ:۱ ٥)

اور پھر وہ واقعہ بھی یاد کرو جب ہم نے موسیٰ سے
چالیس راتوں کا وعدہ کیا تھا۔ پھر تم نے ایک بچھڑے کی پرستش
اختیار کر لی اور تم ظالم تھے۔

صرف کافروں کو ہی ظالم نہیں کہا گیا، بلکہ ان لوگوں کو بھی ظالم کہا گیا جو کافروں کو دوست بناتے ہیں، حتیٰ کہ اگر خود ان کے والدین اور بھائی کافر ہوں۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ رویّہ زمانۂ جاہلیت کے اس سماجی اصول سے مکمل علیحدگی کا غماز ہے، جس میں خون کے رشتے کو فطری رشتہ سمجھا جاتا تھا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ
اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ
فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (التوبہ:۲۳)

اے اہلِ ایمان! اگر تمہارے (ماں) باپ اور (بہن)
بھائی ایمان کے مقابل کفر کو پسند کریں، تو ان سے دوستی نہ رکھو،
اور جو اُن سے دوستی رکھیں گے، وہ ظالم ہیں۔

جس طرح کہ ذکر ہوا، اگر کفر اور اس کے تمام پہلوؤں کو ظلم کے تحت شمار کیا جائے تو یہ بات بہت فطری لگتی ہے کہ قرآنِ کریم نے شرک کو ظلم کی ایک مثال کے طور پر بیان کیا ہے۔ ایک آیت میں لقمان حکیم اپنے بیٹے کو فہمائش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

يٰبُنَيَّ لَاتُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔
(لقمان:۱۳)

اے بیٹا! خدا کے ساتھ شرک نہ کرنا، شرک تو بڑا بھاری
ظلم ہے۔

اس آیت میں ظلم کو شرک کی براہِ راست خبر بیان کیا گیا ہے۔ اگلی آیات بھی معنویاتی لحاظ سے کچھ کم اہم نہیں، کیونکہ ان میں کفر، شرک اور ظلم میں سہ جہتی معنویاتی رشتے کا بیان ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ

وَقَالَ الْمَسِيحُ يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ۔ (المائدہ:۷۲)

وہ لوگ بے شبہ کافر ہیں، جو کہتے ہیں کہ مریم کے بیٹے مسیح، خدا ہیں۔ حالانکہ مسیح یہودیوں سے کہا کرتے تھے کہ اے بنی اسرائیل! خدا ہی کی عبادت کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔ جو خدا سے شرک کرے گا، خدا اس پر جنت حرام کر دے گا، اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ۔ (البقرۃ:۱٦٥)

بعض لوگ غیراللہ کو خدا کا شریک بناتے اور ان سے خدا کی سی محبت کرتے ہیں۔ لیکن جو لوگ ایمان دار ہیں، وہ تو سب سے زیادہ خدا ہی سے محبت کرتے ہیں۔ اے کاش ظالم لوگ جو بات، عذاب کے وقت دیکھیں گے، اب دیکھ لیتے کہ سب طرح کی طاقت خدا ہی کی ہے۔ اور یہ کہ خدا سخت عذاب کرنے والا ہے۔

اسی طرح حضرت موسیٰؑ کی قوم جنہوں نے زیورات کو پگھلا کر سونے کا بچھڑا بنایا اور اس کی عبادت کرنے لگے تھے، انہیں ظلم کے ارتکاب کا ملزم قرار دیا۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ۔ (الاعراف:۱٤۸)

اور قومِ موسیٰؑ نے موسیٰؑ کے بعد اپنے زیور کا ایک

بچھڑا بنا لیا۔ وہ ایک جسم تھا، جس میں سے بیل کی آواز نکلتی تھی۔
ان لوگوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ ان سے بات کر سکتا ہے اور نہ اُن
کو راستہ دکھا سکتا ہے۔ اُنہوں نے اس کو (معبود) بنا لیا اور اپنے
آپ پر ظلم کیا۔

اسی طرح فسق جس پر اس باب کے شروع میں گفتگو ہوئی، ظلم کی ایک متوازی عبارت نظر آتی ہے۔ یہاں حضرت موسیٰؑ کی قوم کا ذکر ہے، جس نے وحی کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا تاکہ اس کا مذاق اُڑا سکیں اور اسے اس طرح بدل دیا کہ اگرچہ بظاہر اس کی شکل نہیں بدلی، لیکن درحقیقت وہ اصل سے بالکل مختلف ہو گیا۔
ان لوگوں کو جنہوں نے ایسا کیا ''ظالم'' کہا گیا۔ (الاعراف:۱۶۲) اگلی آیت میں ان لوگوں کو جنہوں نے سبت کے احکام کی خلاف ورزی کی، فاسق کہا گیا۔ (الاعراف:۱۶۳)

معتدی:

معتدی، اعتداء سے اسم فاعل ہے، جس کا مطلب ہے اپنی مخصوص حد سے بڑھنا یا آگے گزر جانا۔ بالفاظِ دیگر کسی کے خلاف جارحیت یا ظلم کا ارتکاب کرنا۔ یہ بات بہت آسانی سے معلوم ہو جاتی ہے کہ اعتدا اور ظلم جس کا تجزیہ اوپر تفصیل سے پیش کیا گیا، دونوں کا بیشتر معنویاتی علاقہ مشترک ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بہت سی اہم آیات میں لفظ معتدی ظالم کا مکمل طور پر مترادف ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل آیت کو ہی لیجیے:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَاتَعْتَدُوْا ؕ
اِنَّ اللّٰهَ لَايُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔ (البقرۃ:۱۹۰)

جو لوگ تم سے لڑتے ہیں، تم بھی خدا کی راہ میں ان
سے لڑو، مگر زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو
پسند نہیں کرتا۔

لفظ ''حد سے نہ بڑھو'' (لَاتَعْتَدُوْا، اعتدی) کا زیادہ صریح مفہوم ہوگا، ''دشمن

کو لڑنے کے لیے للکارنے میں پہل نہ کرو۔" تقریباً یہی بات "ظلم" کے لفظ سے بھی کہی جا سکتی تھی۔ اس آیت میں سورۃ الحج کی آیت ۴۰ سے، جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، موازنہ کریں تو یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے۔

ظلم اور اعتدا میں یہ معنویاتی ربط ایک اور آیت سے براہِ راست روشن ہوتا ہے۔ سورۃ المائدہ (آیت ۱۰۶) میں جائیداد کی وصیت کے وقت جو لوگ قانونی گواہوں کے طور پر موجود ہوں، ان کے لیے گواہی دینے کے لیے جو الفاظ بیان ہوئے ہیں، اس سے یہ بات صراحت سے کہی گئی ہے کہ کسی کا ظالم ہونا، اس کی جارحیت کا فوری نتیجہ ہوتا ہے، آیت مندرجہ ذیل ہے:

فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَآ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (المائدہ:۱۰۷)

اگر یہ معلوم ہو جائے کہ ان دونوں نے (جھوٹ بول کر) گناہ حاصل کیا ہے، تو جن لوگوں کا اُنھوں نے حق مارنا چاہا تھا، ان میں سے ان کی جگہ اور دو گواہ کھڑے ہوں، جو (میت سے) قرابت قریبہ رکھتے ہوں۔ پھر وہ خدا کی قسمیں کھائیں کہ ہماری شہادت اُن کی شہادت سے بہت اچھی ہے اور ہم نے کوئی زیادتی نہیں کی، ایسا کیا ہو تو ہم ظالم ہوں۔

یہاں یہ یاد رکھنا مفید ہوگا کہ ظلم کا ایک اہم پہلو اللہ کی مقرر کردہ حدود کی خلاف ورزی ہے۔ بالکل ایسی ہی صورتِ حال بیان کرنے کے لیے لفظ اعتدی بھی استعمال ہوا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِى السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ۔ (البقرۃ:۶۵)

اور تم ان لوگوں کو خوب جانتے ہو، جو تم میں سے ہفتے

کے دِن (مچھلی کا شکار کرنے) میں حد سے تجاوز کر گئے تھے، تو ہم نے ان سے کہا ذلیل وخوار بندر ہو جاؤ۔

سورۃ الاعراف، آیت ۱۶۳ میں اس میں ملتی جلتی عبارت یعتدون، وہ سبت کی خلاف ورزی کرتے ہیں، کی تفسیر میں علامہ بیضاوی لکھتے ہیں کہ: ''اس کا مطلب ہے کہ وہ ہفتے کے روز مچھلی کا شکار کر کے اللہ کی حدود کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔''

مندرجہ ذیل دو مثالوں میں بھی یہی صورتِ حال بیان ہوئی ہے۔

عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ۚ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ۚ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ۔ (المائدہ:۹۶)

جو گذر چکا، اللہ نے اسے معاف کر دیا، لیکن اس کے بعد جو بھی اس کی خلاف ورزی کرے گا، اللہ اس سے بدلہ لے گا، اور اللہ تعالیٰ زبردست بدلہ لینے والا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔ (المائدہ:۸۷)

ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں خدا نے تمہارے لیے حلال کی ہیں، ان کو حرام نہ قرار دو، اور حد سے نہ بڑھو۔ خدا حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

حلال اور حرام دو انتہائی اہم اصطلاحات ہیں جو حرمت اور ممانعت کی زبان کے قدیم اور ابتدائی دور سے ورثے میں آئی ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں تقریباً قانونی اصطلاحات کی حیثیت سے ان کا کردار بہت نمایاں ہے اور بعد میں اسلامی فقہ کے نظام میں اپنا لی گئیں۔ ہم ان کا تفصیلی تجزیہ تو آئندہ کریں گے، سردست یہ کہنا کافی ہے کہ قرآنِ کریم میں یہ اصطلاحات اللہ کی حدود کا حصہ ہیں اور اللہ کے نازل کردہ حلال و حرام کے نظام میں کوئی تبدیلی اعتداء (جارحیت) کی حقیقی مثال ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ لواطت کو بعض اوقات ''اعتداء'' کا فعل بتایا گیا ہے۔ ایسی صورت میں ''حدود اللہ کی خلاف ورزی'' کا مفہوم بہت واضح

طور پر ''قابلِ نفرت'' کے مفہوم کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ یا زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایسا فعل ہے جو اللہ کی نفرت کا براہِ راست مستوجب ہے۔ اس نقطۂ نظر کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ لواطت کو عموماً فاحشہ بتایا گیا جو قابلِ مذمت شے کے لیے بولا جاتا ہے۔

اَتَاْتُوْنَ الذُّکْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِیْنَ۔ وَتَذَرُوْنَ مَاخَلَقَ لَکُمْ رَبُّکُمْ مِّنْ اَزْوَاجِکُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ۔ (الشعرا: ۱٦۵-۱٦٦)

کیا تم اہلِ عالم میں سے لڑکوں پر مائل ہو جاتے ہو، اور تمہارے پروردگار نے تمہارے لیے جو بیویاں پیدا کی ہیں، ان کو چھوڑ دیتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم حد سے تجاوز کرنے والے ہو۔

اب تک جو گفتگو ہوئی ہے، اس سے واضح ہو گیا ہوگا کہ اعتدی کے معنی عصی، ''باغی ہونا'' یا کسی (کے احکام) کی نافرمانی کے بہت قریب ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں فعل قرآنِ کریم میں اکثر ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ ہم ذیل میں ایک مثال دیتے ہیں، جو معنویاتی اعتبار سے خاص طور پر بہت اہم ہے۔ آیت بنی اسرائیل کے بارے میں ہے، جو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ مصر سے نکلے اور پھر ہر قسم کی بے دینی میں مبتلا ہو گئے۔ ان کی اس بغاوت اور خلاف ورزی کو کفر کہا گیا ہے۔

وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْکَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ۔ (البقرۃ: ٦۱)

اور ذلت اور محتاجی ان سے چمٹا دی گئی اور وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گئے، اس لیے کہ وہ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے، نیز وہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔

مندرجہ ذیل مثال میں تکذیب کا لفظ، جس کے بارے میں ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ وہ کفر کی امتیازی خصوصیت ہے، جارحیت اور خلاف ورزی کے لفظ سے معنوی طور پر بہت قریب استعمال ہوا ہے۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ۔ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ۔
وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ۔ (المطففین: ۱۰-۱۲)

(قیامت کے دن) جھٹلانے والوں کی تباہی ہے، وہ لوگ جو انصاف کے دن کو جھٹلاتے ہیں۔ اس کو وہی جھٹلاتا ہے جو حد سے تجاوز کرنے والا گنہگار ہے۔

مسرف:

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ظالم اور معتدی دونوں کی معنویاتی ساخت میں ''حدود کی خلاف ورزی'' کا مفہوم مرکزی نقطے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسرف ایک اور لفظ ہے جس کی معنویاتی ترکیب بھی ایسی ہی ہے۔ یہ لفظ اسرف کے فعل سے بنا ہے، جو س ر ف کے مادے سے مشتق فعل کا چوتھا باب ہے، جس کا بنیادی معنی ہے ''حد سے گزرنا''، ''صحیح مقدار سے تجاوز کرنا''۔ لیکن ظلم اور اعتدی کے برعکس (خصوصاً ظلم کے اعتبار سے واضح طور پر) جن کے مفہوم میں عناد، جارحیت اور دوسرے کی حق تلفی کا عنصر غالب، اسراف کے معنی، مذکورہ احتمالات کے بغیر کسی بھی معاملے میں مناسب حدود سے آگے بڑھنا، بہت زیادہ فضول خرچی، اعتدال کی مخالفت اور زیادتی کا ارتکاب ہیں۔ مندرجہ ذیل دو آیات میں اسراف کی صفت غیر معتدل کھانے پینے کے فعل کے ساتھ آئی ہے، اصل فعل میں بجائے خود کوئی برائی نہیں ہے، لیکن فضول حد تک پہنچ کر یہ فعل بھی اخلاقی طور پر برائی بن جاتا ہے۔ اسی کو اسراف کہتے ہیں اور اسی کی اللہ تعالیٰ نے مذمت کی ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ۔ (الاعراف: ۳۱)

اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنے آپ کو مزین کیا
کرو اور کھاؤ پیو، اسراف نہ کرو کہ خدا اسراف کرنے والوں کو
دوست نہیں رکھتا۔

وَهُوَ الَّذِىٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ
وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا
وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ
وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ۔ (الانعام: ۱۴۱)

اور خدا ہی تو ہے جس نے باغ پیدا کیے، چھتریوں پر
چڑھائے ہوئے بھی اور چھتریوں پر نہیں چڑھائے ہوئے بھی۔
اور کھجور اور کھیتی جن کے طرح طرح کے پھل ہوتے ہیں اور
زیتون اور انار ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور بعض باتوں
میں نہیں ملتے۔ جب یہ چیزیں پھلیں تو ان کے پھل کھاؤ اور جس
دن کاٹو تو خدا کا حق بھی اس میں سے ادا کرو۔ اور اسراف نہ کرو
کہ اللہ اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں بناتا۔

اگلی مثال میں اسراف کا لفظ قومِ لوط کے رواج کے بارے میں استعمال ہوا
ہے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا
مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۔ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ
النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ۔ (الاعراف: ۸۰-۸۱)

اور لوط نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایسی بے حیائی کا کام
کیوں کرتے ہو، جو تم سے پہلے دُنیا والوں میں سے کسی نے نہیں
کیا، یعنی اپنی خواہشِ نفسانی پوری کرنے کے لیے عورتوں کو چھوڑ
کر لونڈوں پر گرتے ہو، حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ اسراف کرنے
یعنی حد سے نکل جانے والے ہو۔

ذیل کی مثال حضرت صالحؑ کی تقریر سے لی گئی ہے، جس میں اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے اُنہوں نے ان کے بے دین طرزِ زندگی پر اُنہیں فہمائش کی ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ۔ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ۔
الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ۔ (الشعراء:
۱۵۰-۱۵۲)

تم اللہ سے ڈرو اور میرے کہنے پر چلو اور حد سے تجاوز کرنے والوں کی بات نہ مانو، جو ملک میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

جہاں تک ''فساد'' اور ''نیکی'' کے مفاہیم کا تعلق ہے، جو اس آیت میں مسرف کے تصور کی اندرونی ساخت کو متعین کرتے ہیں، ان کے بارے میں ہم اس وقت زیادہ تفصیل سے بحث کریں گے، جب قرآنِ کریم میں نیکی اور بدی کے مسئلے پر بات ہوگی۔

اگرچہ یہ بات مکمل قطعیت سے نہیں کہی جا سکتی، تاہم مندرجہ ذیل آیت میں مسرف کا معنی گذشتہ بحث کی روشنی میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ سیاق و سباق یہ ہے کہ جب فرعون حضرت موسیٰؑ کو یہ وجہ بیان کر کے سزائے موت دینا چاہتا تھا کہ اگر اُنہیں زندہ آزاد چھوڑ دیا گیا تو وہ فساد پھیلائیں گے اور آخرکار لوگوں کے روایتی مذہب کو بھی خراب کر دیں گے، تو فرعون کی قوم کے ایک شخص نے جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا، فرعون کو یہ انتہائی قدم اُٹھانے سے روکتے ہوئے کہا:

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ
اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ
رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ
بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ۔
(المومن:۲۸)

اور فرعون کے لوگوں میں سے ایک مومن شخص جو اپنے

ایمان کو پوشیدہ رکھتا تھا، کہنے لگا، کیا تم ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو کہتا ہے کہ میرا پروردگار خدا ہے، اور وہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانیاں بھی لے کر آیا ہے۔ اور اگر وہ جھوٹا ہوگا تو اس کے جھوٹ کا ضرر اسی کو ہوگا، اور اگر سچا ہوگا تو کوئی سا عذاب جس کا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے، تم پر واقع ہو کر رہے گا۔ بے شک خدا اس شخص کو ہدایت نہیں دیتا، جو اسراف کرنا والا (اور) جھوٹا ہو۔

اس آیت میں لفظ کذاب، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، کاذب کا اسمِ مبالغہ ہے، جس کا معنی کچھ اس طرح ہوگا، ایک بہت بڑا عادی جھوٹ بولنے والا۔ مسرف کا اشارہ غالباً فرعون کے ان الفاظ کی طرف ہے، جن کا مطلب تھا کہ موسیٰ یقیناً ملک میں فساد پھیلائیں گے۔ اگر یہ تعبیر درست ہے تو اس مومن شخص کا کہنے کا مطلب یوں بیان کیا جا سکتا ہے: ''اگر جیسا کہ فرعون کا اصرار ہے، حضرت موسیٰ سچ مچ بہت بڑے جھوٹے ہیں اور اگر وہ ملک میں فساد کے علاوہ کچھ نہیں کرتے، تو وہ خود ہی تباہ ہو جائیں گے، کیونکہ ایسی قابلِ مذمت صفات کے حامل شخص کو اللہ کبھی ہدایت نہیں دیتا۔''

اب بہت آسانی سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ اس قسم کے موقع پر مسرف کا معنی بہت واضح طور پر کافر اور ظالم کے قریب آ جاتا ہے۔ بلکہ اس کے بعد چند آیات میں ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ مسرف ان لوگوں کے لیے بولا گیا جو اللہ کے رسولوں کے اخلاص پر شک کرتے ہیں اور اللہ کی آیات کے بارے میں خواہ مخواہ کے جھگڑوں میں الجھتے ہیں۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ
شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ؕ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْ
بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ۨ ۚ
الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ
اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ

جَبَّارٍ۔ (المومن:۳٤-۳۵)

اور پہلے یوسف بھی تمہارے پاس نشانیاں لے کر آئے تھے، تو جو وہ لائے تھے، اس سے تم ہمیشہ شک ہی میں رہے۔ یہاں تک کہ جب وہ فوت ہو گئے تو تم کہنے لگے کہ خدا اس کے بعد کبھی کوئی پیغمبر نہیں بھیجے گا۔ اسی طرح خدا اس شخص کو گمراہ کر دیتا ہے جو حد سے نکل جانے والا اور شک کرنے والا ہے۔ جو لوگ بغیر اس کے کہ اُن کے پاس کوئی دلیل آئی ہو، خدا کی آیتوں میں جھگڑتے ہیں، خدا کے نزدیک اور مومنوں کے نزدیک یہ جھگڑا سخت ناپسند ہے۔ اسی طرح خدا ہر متکبر سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

اس آیت سے زیادہ اس امر کی واضح مثال نہیں مل سکتی کہ بعض مواقع پر اسراف کفر کے تقریباً ہم معنی ہو جاتا ہے۔ وحی الٰہی کے بارے میں شکوک و شبہات، اللہ کے بارے میں خواہ مخواہ کی بحث و تمحیص، تکبر اور غرور سے بھرے دل جو اللہ پر ایمان نہ لائیں، یہ تمام ہی کافروں کی معروف نشانیاں ہیں۔ اس تاثر کی مزید توثیق اس سے ہوتی ہے کہ مسرف کا لفظ ایسے لوگوں کے لیے استعمال ہوا ہے، جو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں اور بت پرستی میں مشغول ہیں، گویا مشرک = مسرف۔

تَدْعُوْنَنِیْ لِاَکْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَالَيْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ۔ لَاجَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِی الدُّنْيَا وَلَا فِی الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ۔ (المؤمن: ٤٢-٤٣)

تم مجھے اس لیے بلاتے ہو کہ خدا کے ساتھ کفر کروں اور اس چیز کو اس کا شریک مقرر کروں، جس کا مجھے کچھ بھی علم نہیں، اور میں تم کو خدائے غالب اور بخشنے والے کی طرف بلاتا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ جس چیز کی طرف تم مجھے بلاتے ہو، اس کو

دُنیا اور آخرت میں بلانے (یعنی قبول کرنے) کا مقدور نہیں، اور
ہم کو خدا کی طرف لوٹنا ہے اور حد سے نکل جانے والے دوزخی
ہیں۔

اگلی آیت میں یہی لفظ اپنی فعلی شکل یعنی اسراف کی صورت میں آیا ہے، جس کا لفظی معنی ہے، اس نے مناسب حد کی خلاف ورزی کی۔ سیاق و سباق سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس لفظ کا اشارہ ایسے شخص کی طرف ہے، جس نے ساری زندگی خوش فعلیوں اور عیش وعشرت میں گزار دی۔ اللہ کی نازل کردہ آیات سے قطعاً بے پروا۔

قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ
تُنْسٰى۔ (طٰہٰ:١٢٦)

خدا فرمائے گا کہ تیرے پاس ہماری آیتیں آئیں تو تُو
نے ان کو بھلا دیا، اسی طرح آج ہم تم کو بھلا دیں گے۔

جیسا کہ ہم اوپر تفصیل سے واضح کر چکے ہیں، یہ رویہ بعینہٖ کفر ہے، اس کی حقیقت اس سے زیادہ ہے نہ کم۔

وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ
(طٰہٰ:١٢٧)

اور جو شخص حد سے نکل جائے اور اپنے پروردگار کی
آیتوں پر ایمان نہ لائے، ہم اس کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔

ہم اس فصل کی بحث کو ختم کرتے ہوئے ایک آیت نقل کرتے ہیں، جس میں لفظ مسرف بہت واضح طور پر اللہ کی کھلی ممانعت کے خلاف باغیانہ زیادتی کے فعل کے لیے آیا ہے۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ
نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ
جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَقَدْ
جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۡ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي

الارض لمسرفون۔ (المائدہ:۳۲)

اس قتل کی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ حکم نازل کیا کہ جو شخص کسی کو ناحق قتل کرے گا (یعنی) بغیر اس کے کہ جان کا بدلہ لیا جائے یا ملک میں خرابی کرنے کی سزا دی جائے، اس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کیا۔ اور جو اس کی زندگی کا موجب ہوا، تو گویا تمام لوگوں کی زندگانی کا باعث ہوا۔ اور ان لوگوں کے پاس ہمارے پیغمبر روشن دلیلیں لا چکے ہیں، پھر اس کے بعد بھی ان میں بہت سے لوگ ملک میں اعتدال سے نکل جاتے ہیں۔

حواشی:

(۱) ابن ہشام، سیرۃ النبی، تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید، جلد سوم (قاہرہ، تجاریہ، ت۔ن)، ص ۱۲۔

(۲) قاضی ناصر الدین بیضاوی: انوار التنزیل (استانبول، عثمانیہ، ۱۳۱۴ھ)، ص ۱۰۱۔

(۳) بحوالہ شروح الفقہ الاکبر، حاشیہ نمبر ا، حیدرآباد، دکن، ۱۳۶۵ھ، دوسرا ایڈیشن، ص ۵۳۔ یہ شرح غلط طور پر ماتریدی سے منسوب ہے۔ مزید ملاحظہ ہو، اے۔جے، ونسنک، ''مسلم عقیدہ''، (کیمبرج، ۱۹۳۲ء)، صفحہ ۱۹۲۔

(۴) اس لفظ پر بحث آگے کے صفحات میں موجود ہے۔

(۵) بیضاوی: انوار التنزیل، ج ا، ص ۳۰۴۔

(۶) دیکھیے: گذشتہ باب میں جدال کا تجزیہ۔

باب نہم

مذہبی منافقت

اس مختصر باب میں ہم نفاق کے تصور کا معنویاتی تجزیہ پیش کریں گے۔ عموماً اس لفظ کا ترجمہ منافقت یا دوغلا پن کیا جاتا ہے۔ ہم آسانی کے لیے منافقت کا لفظ استعمال کریں گے، لیکن یاد رہے کہ اہم یہ نہیں کہ ترجمے میں جو لفظ استعمال کیا گیا ہے، وہ اور عربی لفظ نفاق معنی میں مساوی ہیں، بلکہ اہمیت اس بات کو ہے کہ اس لفظ کی معنوی ساخت کیا ہے۔

باریکی میں جائے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ نفاق کا مطلب زبان سے یقین کا اظہار کرنا، لیکن دل میں یقین نہ ہونا ہے۔ چنانچہ یہ ظاہر ہے کہ جن معاملات کا مذہبی ایمان سے تعلق ہے، ان کے بارے میں کہنے اور کرنے میں فرق ہے جو فسق(۱) کی خصوصیت ہے، وہ نفاق کے معانی کا سب سے بنیادی عنصر ہے۔

اس موقع پر ہم نے ایک اہم قرآنی آیت (سورہ توبہ:۶۸) کا حوالہ بھی دیا تھا، جس میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ منافق فاسق ہیں۔ اسی طرح سورۃ المنافقون میں مذہبی معاملات میں منافقت برتنے والوں کے بارے میں مندرجہ ذیل اہم الفاظ استعمال ہوئے:

سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ اَسۡتَغۡفَرۡتَ لَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ؕ لَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ۔ (المنفقون:۶)

تم ان کے لیے مغفرت مانگو یا نہ مانگو، ان کے حق میں برابر ہے۔ خدا ان کو ہرگز نہ بخشے گا۔ بے شک خدا نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

تاہم ہم جس مذہبی منافقت کا ذکر کر رہے ہیں، اس کی کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ فسق کے ساتھ مکمل مطابقت سے قطع نظر لفظ نفاق کی اپنی مخصوص معنویاتی ساخت ہے جو درحقیقت اتنی خاص ہے کہ بعض علماء کے نزدیک یہ ایک مستقل منفرد درجہ ہے جو اسلامی اخلاقیات کی دُنیا کو کفر اور ایمان کے ساتھ مل کر تین بڑے حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ مومن، کافر، منافق۔ (۲)

فخر الدین رازی تفسیر کبیر (البقرۃ ۷) میں لکھتے ہیں:

> ان المفسرین اجمعوا علی ان ذلك فی وصف المنافقین قالوا وصف اللہ الاصناف الثلاثۃ من المومنین والکافرین والمنافقین فبدا بالمومنین المخلصین الذین صحت سرائرھم وسلمت ضمائرھم، ثم اتبعھم بالکافرین الذین من صفتھم الاقامۃ علی الجحود والعناد ثم وصف حال من یقول بلسانہ انہ مومن وضمیرہ یخالف ذلك۔ (۳)

مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت منافقین کی صفت بیان کرتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالٰی نے تینوں اقسام یعنی مومن، کافر اور منافق کی صفات بیان کی ہیں۔ پہلے مومنوں کی صفت بیان کی کہ وہ پاک اور خالص لوگ ہیں۔ ان کے پوشیدہ حالات صحیح اور ان کا ضمیر محفوظ ہے۔ ان کے بعد کافروں کا ذکر ہے، جن کی صفت ہے کہ وہ انکار اور دشمنی پر قائم رہتے ہیں۔ پھر اس (منافق) کا حال بیان کیا جو زبان سے کہتا ہے کہ مومن ہوں، لیکن اس کا ضمیر اس کی مخالفت کرتا ہے۔

فخر الدین رازی کے نزدیک مومن کا یعنی وہ جو ایمان لاتا ہے، دل اور ضمیر مذہبی طور پر صاف اور نیک ہوتا ہے، کافر کی پہچان یہ ہے کہ وہ ایمان سے انکار میں مسلسل ہٹ دھرمی دکھاتا ہے، جب کہ منافق (جو قواعد کے لحاظ سے نفاق کا اسمِ فاعل ہے)، وہ ہے جو ظاہر یہ کرتا ہے کہ وہ ایمان لے آیا ہے، لیکن اس کا ضمیر اسے نہیں مانتا۔

نفاق اور کفر میں ناقابلِ تردید مماثلت پائی جاتی ہے، کیونکہ نفاق آخر کار کفر

کی ہی ایک مخصوص شکل ہے۔ چنانچہ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ قرآن کریم میں ان دونوں اصطلاحوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں پایا جاتا۔ مندرجہ ذیل آیت میں کافر اور منافق دونوں کو اللہ کے دشمنوں کے ایک ہی زمرے میں بیان کیا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۔ (التحریم:۹)

اے پیغمبر! کافروں اور منافقوں سے لڑو اور ان پر سختی کرو۔ ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے، اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

آیت کے آخری الفاظ، یعنی اللہ کا یہ فیصلہ کہ منافق کی آخری منزل دوزخ کی آگ ہے، بے حد اہم ہیں کیونکہ ان سے نفاق اور کفر کے مابین اصلی ربط کا پتہ چلتا ہے۔ کافر اور منافق دونوں کے لیے ایک ہی سزا کا فیصلہ اس بات کا غماز ہے کہ معصیت کی کیفیت اور درجے کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا۔ (النساء:۱۴۵)

کچھ شک نہیں کہ منافق لوگ دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے اور تم ان کا کسی کو مددگار نہ پاؤ گے۔

اگلی آیت میں اگرچہ لفظ ''منافق'' استعمال نہیں ہوا، تاہم اشارہ صریحاً انہی کی طرف ہے، اور یہاں نفاق کی شناخت کفر کے ساتھ بلاواسطہ نظر آتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۚ (المائدہ:۴۱)

اے پیغمبر! جو لوگ کفر میں جلدی کرتے ہیں (کچھ تو) ان میں سے (ہیں) جو منہ سے کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں، لیکن ان کے دل مومن نہیں۔

اس وضاحت سے یہ بات پوری طرح سمجھ میں آتی ہے کہ بعض عرب ماہرینِ لغت بدیہی طور پر ''نفاق'' کو ''کفر'' کی ایک نوع کیوں گردانتے ہیں۔ اور اس کے لیے

''کفر النفاق'' یعنی ''نفاق کا کفر'' کی ترکیب کیوں استعمال کرتے ہیں۔ تاہم ایک اور اعتبار سے نفاق ایک مستقل معنویاتی اصطلاح بھی ہے جو ایمان اور کفر کے درمیانی درجے سے تعلق رکھتی ہے۔

آیئے پہلے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں، جس میں بہت صراحت سے نفاق کی اس درمیانی کیفیت کی عکاسی کی گئی ہے، جو دو مخالف سمتوں کے درمیان تذبذب کا شکار ہے۔

> ان المنٰفِقِینَ یُخٰدِعُونَ اللّٰهَ وھُو خَادِعُھم و إذَا قَامُوا الی الصَّلاۃِ قَامُوا کُسَالی یُرآؤُنَ النَّاسَ ولَایَذْکُرونَ اللّٰه إلا قَلِیلًا، مُذَبذَبِینَ بَیْنَ ذَلِكَ لَا إلی ھَؤلاءِ وَلا إلی ھؤلاءِ ومَن یُضلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِد لَه سَبِیلًا۔ (النساء: ۱٤۲-۱٤۳)
>
> منافق خدا کو دھوکہ دیتے ہیں (یہ اس کو کیا دھوکہ دیں گے)، وہ اُنہی کو دھوکے میں ڈالنے والا ہے۔ اور جب یہ نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو سست اور کاہل ہو کر (صرف) لوگوں کو دِکھانے کو اور خدا کو یاد ہی نہیں کرتے، مگر بہت کم۔ بیچ میں پڑے لٹک رہے ہیں، نہ اِن کی طرف (ہوتے ہیں) نہ اُن کی طرف۔ اور جس کو خدا بھٹکائے تو تم اس کے لیے کبھی بھی رستہ نہیں پاؤ گے۔

یہی بات ذیل کی مثال میں بھی ملتی ہے۔ ان آیات کا تعلق غزوہ احد سے ہے، جس میں صورتِ حال حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کے خلاف ہو گئی۔ سچے مومنوں کی آزمائش تھی اور ایک سنہری موقع بھی تھا کہ وہ خود کو ان لوگوں سے الگ ثابت کرسکیں، جو نئے دین سے صرف زبانی وابستگی ظاہر کر رہے تھے۔

> وَمَا اصابَکُم یومَ التقَی الجَمعٰنِ فَبِاذْنِ اللّٰه وَلِیَعلم المُومِنِینَ وَلِیعلم الّذِینَ نَافقُوا وَقِیلَ لَھُم تَعالَوا قَاتِلُوا فِی سَبِیلِ اللّٰه اوِ ادْفَعُوا قَالُوا لَو نَعْلَمُ قِتَالا لاتَبعنٰکُم ھُم لِلکُفرِ یَومَئِذٍ

أَقْرَبُ مِنْهم لِلايمَان، يَقُولُونَ بِأَفوَاهِهِم مَالَيسَ فِيْ قُلُوبِهِم، واللّٰهُ اعلم بِمَايَكتمُون۔ (آلِ عمران: ۱٦٦-۱٦٧)

اور جو مصیبت تم پر دونوں جماعتوں کے مقابلے کے دِن واقع ہوئی، سو خدا کے حکم سے (واقع ہوئی) اور (اس سے) یہ مقصود تھا کہ خدا مومنوں کو اچھی طرح معلوم کر لے اور منافقوں کو بھی معلوم کر لے اور (جب) ان سے کہا گیا کہ آؤ خدا کے رستے میں جنگ کرو یا (کافروں کے) حملوں کو روکو تو کہنے لگے کہ اگر ہم کو لڑائی کی خبر ہوتی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ رہتے۔ یہ اس دن ایمان کی نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ منہ سے وہ باتیں کہتے ہیں جو اُن کے دل میں نہیں ہیں اور جو کچھ یہ چھپاتے ہیں، خدا اس سے خوب واقف ہے۔

مندرجہ بالا آیات سے واضح ہوتا ہے کہ معنویاتی ''نفاق'' کفر اور ایمان کے درمیان کسی بہت متعین اور محدود خانہ کا نام نہیں، بلکہ اس کے معانی کی حدود خاصی وسیع ہیں۔ بالفاظِ دیگر یوں کہیے کہ یہ ایسی کیفیت ہے جو نمایاں طور پر بدلتی رہتی ہے اور غیرمحسوس انداز میں کفر اور ایمان دونوں سمتوں میں سے کوئی بھی رُخ اختیار کر سکتی ہے۔

بعض اوقات نفاق سے یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ عین ایمان کی حالت میں پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً جب ایک مومن کہتا کچھ اور ہے اور کرتا کچھ اور ہے تو وہ گویا نفاق کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ وہ مومن تو ہے، لیکن اللہ کو اس کا یہ رویہ پسند نہیں۔ مندرجہ ذیل آیت سے یہ بات سامنے آتی ہے۔

یا ایّها الّذِینَ امَنُوا لِمَ تَقُولونَ مَالَا تَفعَلونَ کَبُرَمَقْتًا عِنداللّٰهِ أن تَقُولُوا مَا لَاتفعَلُون۔ (الصف:۲-۳)

مومنو! تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو، جو کیا نہیں کرتے۔ خدا اس بات سے سخت بیزار ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔

یہاں ''تم جو ایمان لائے'' کی عبارت پہ غور کیجیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو مومن گردانتا ہے، اور مومن کہہ کر خطاب کرتا ہے۔ قرآنِ کریم کے لحاظ سے یہ عندیہ شک سے پیدا ہوتا ہے، یعنی وحی الٰہی کی صداقت کے بارے میں مفروضی شک جو دل کو اندر سے کھائے جاتا ہے۔ اس کے باوجود کہ دینِ اسلام کو قبول کر چکا ہے۔

ہمیں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے روز تمام منافقین مرد اور عورتیں جو دوزخ کی آگ کے کنارے پر کھڑے ہوں گے، جنت کی طرف جانے والے مومنین سے پکار کر کہیں گے، ''رُکو! ہمارا انتظار کرو۔ کیا ہم دُنیا میں تمہارے ساتھی نہیں تھے۔'' مومنین جواب دیں گے، ''تم شک میں پڑ گئے، فضول اُمیدوں نے تمہیں ورغلایا، حتیٰ کہ اللہ کا آخری فیصلہ آ پہنچا، اس فریبی نے تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکا دیا۔''

> يُنَادُونَهُمْ أَلَمْ نَكُن مَّعَكُمْ، قَالُوا بَلَىٰ وَلَٰكِنَّكُمْ فَتَنتُمْ أَنفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْأَمَانِيُّ حَتَّىٰ جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ وَغَرَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ۔ (الحدید:۱۴)
>
> تو منافق لوگ مومنوں سے کہیں گے، کیا ہم (دُنیا میں) تمہارے ساتھ نہ تھے۔ وہ کہیں گے، کیوں نہیں تھے۔ لیکن تم نے خود اپنے تئیں بلا میں ڈالا اور (ہمارے حق میں حوادث کے) منتظر رہے اور (اسلام میں) شک کیا اور (لاطائل) آرزوؤں نے تم کو دھوکا دیا، یہاں تک کہ خدا کا حکم آ پہنچا اور خدا کے بارے میں تم کو (شیطان) دغاباز دغا دیتا رہا۔

کفر کی جانب ایک اور قدم یہ ہے کہ ایک شخص وہ کہے جو وہ کرتا نہیں، یہ شخص پورا منافق بن جاتا ہے۔ یہاں منافق کی جس قسم کا ذکر ہو رہا ہے، یہ وہ ہے جو اسلام کے ہوتے ہوئے اللہ کے بارے میں شک و شبہ میں پڑ گیا۔ آگے چل کر ہم منافق کی اس قسم کے بارے میں بھی بات کریں گے جو شروع سے آخر تک اسلام کے دائرے سے باہر رہتا ہے، لیکن اعلانیہ طور پر اپنے کفر کا اعلان کرنے کی بجائے بظاہر

اسلام قبول کر لیتا ہے اور ایمان کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ تاکہ ہر طرح کی برائیاں کر سکے۔ قرآنِ کریم میں اس مخصوص قسم کے منافقین کو مختلف انداز سے بیان کیا گیا۔ ذیل میں ہم صرف دو مثالیں دیں گے، جن سے نفاق کی اصل فطرت واضح ہوتی ہے۔

اِذَا جَاءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اَنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُه وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ، اتَّخَذُوْا اِيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ، ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ آمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ، وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ۔ (المنافقون: ۱ – ۵)

اے محمد ﷺ! جب منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو (از راہِ نفاق) کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ بے شک خدا کے پیغمبر ہیں، لیکن خدا ظاہر کیے دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور ان کے ذریعے سے (لوگوں کو) راہِ خدا سے روک رہے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ جو کام یہ کرتے ہیں، برے ہیں۔ یہ اس لیے کہ یہ (پہلے تو) ایمان لائے، پھر کافر ہو گئے تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی۔ سو اب یہ سمجھتے ہی نہیں، اور جب تم ان کو دیکھتے ہو تو ان کے جسم تمہیں اچھے معلوم ہوتے ہیں اور جب وہ گفتگو کرتے ہیں تو تم ان کی تقریر کو توجہ سے سنتے ہو، گویا لکڑیاں ہیں جو دیوار سے لگائی گئی ہیں۔ (بزدل ایسے کہ) ہر زور کی آواز کو سمجھیں کہ ان پر (بلا آئی) یہ تمہارے دشمن ہیں، ان سے بے خوف نہ رہنا۔ خدا

ان کو ہلاک کرے، یہ کہاں بھٹکے پھرتے ہیں، اور جب ان سے کہا جائے کہ آؤ رسولِ خدا تمہارے لیے مغفرت مانگیں تو سر ہلا دیتے ہیں اور تم ان کو دیکھو کہ تکبر کرتے ہوئے منہ پھیر لیتے ہیں۔

اگلی آیت میں لفظ نفاق کا واضح ذکر تو نہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آیت بہت صریح الفاظ میں منافق کی مخصوص صفات کا ذکر کرتی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَاهُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ۔ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ۔ (البقرۃ:۸–۹)

اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، حالانکہ وہ ایمان نہیں رکھتے، یہ (اپنے پندار میں) خدا اور مومنوں کو چکما دیتے ہیں، مگر (حقیقت) میں اپنے سوا کسی کو چکما نہیں دیتے اور وہ اس سے بے خبر ہیں۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ۔ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۔ (البقرۃ: ۱۳-۱۴)

اور یہ لوگ جب مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں تو (ان سے) کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ہم ہنسی کیا کرتے تھے۔ ان سے خدا ہنسی کرتا ہے اور انہیں مہلت دیے جاتا ہے کہ شرارت و سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ۔ (البقرۃ:۱۳)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جس طرح اور لوگ ایمان لے آئے، تم بھی ایمان لے آؤ تو کہتے ہیں بھلا جس طرح بے وقوف ایمان لے آئے ہیں، اسی طرح ہم بھی ایمان لے آئیں۔ سن لو کہ یہی بے وقوف ہیں، لیکن نہیں جانتے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَاتُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ۔ (البقرۃ:۱۱۔۱۲)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ ڈالو تو کہتے ہیں، ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ دیکھو یہ بلاشبہ مفسد ہیں، لیکن خبر نہیں رکھتے۔

فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ۔ (البقرۃ:۱۰)

ان کے دِلوں میں کفر کا مرض تھا۔ خدا نے ان کا مرض اور زیادہ کر دیا اور ان کے جھوٹ بولنے کے سبب ان کو دُکھ دینے والا عذاب ہوگا۔

دل کی بیماری یا مرض کا استعارہ نفاق کی معنویاتی ساخت کے بہت اہم عناصر میں سے ہے۔ درحقیقت ''وہ جن کے دل میں مرض ہے''، کی عبارت قرآن میں بار بار منافقین کے لیے آئی ہے۔

مَثَلُھُمْ کَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَاحَوْلَہٗ ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِھِمْ وَتَرَکَھُمْ فِیْ ظُلُمٰتٍ لَّا یُبْصِرُوْنَ۔ صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ۔ (البقرۃ:۱۷-۱۸)

ان کی مثال اس شخص کی سی ہے، جس نے آگ جلائی، جب آگ نے اس کے اردگرد کی چیزیں روشن کیں تو خدا نے ان لوگوں کی روشنی زائل کر دی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ

دیا کہ کچھ نہیں دیکھتے۔ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں کہ
(کسی طرح سیدھے رستے کی طرف) لوٹ ہی نہیں سکتے۔

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۔

(البقرۃ:۱۵)

اللہ ان منافقوں سے ہنسی کرتا ہے اور انہیں مہلت
دیے جاتا ہے کہ شرارت اور سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔
اُنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی۔ (۴)

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ آیت کفر اور نفاق کے درمیان مشترک صفات کو بھی اور نفاق کی منفرد اور مخصوص صفات کو بھی کسی تفصیلی بحث سے کہیں بہتر طریقے سے بیان کرتی ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ ابتدا میں لفظ نفاق یا منافق مدینے کے صرف ان لوگوں کے لیے استعمال ہوا، جنھوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مکے سے مدینے ہجرت کے بعد اسلام قبول کیا۔ مکے سے آئے مومنین کے قطعاً برعکس جو اللہ اور رسول پر غیر متزلزل ایمان کے حامل تھے، مدینے کے بہت سے باشندوں کا ایمان بہت کمزور تھا اور وہ ہمیشہ اِدھر یا اُدھر جھکتے رہتے تھے۔ مجبوری میں اسلام قبول کرنے کی بنا پر یہ لوگ موقع پرستی کا شکار تھے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ذرا سے نامساعد حالات پیش آتے تو ان کے دلوں میں شکوک سر اُٹھا لیتے اور ان کا اللہ پر ایمان ڈگمگانے لگتا۔ ایسا لگتا ہے کہ ابتدا میں منافق کا لفظ مدینہ کے اسی قسم کے لوگوں کے لیے بولا گیا۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ نفاق کو مدینہ کے مسلمانوں تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ سورہ توبہ میں بعض بدوی لوگوں کے روّیے کو ان کا فطری نفاق بتایا گیا۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ
مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔ (التوبہ:۹۷)

دیہاتی لوگ سخت کافر اور سخت منافق ہیں اور اس قابل
ہیں کہ جو احکام خدا نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں، ان

سے واقف نہ ہوں۔ خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۣ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۭ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ۔ (التوبہ: ۱۰۱)

اور تمہارے گردونواح کے بعض دیہاتی منافق ہیں اور بعض مدینے والے بھی نفاق پر اڑے ہوئے ہیں، تم انہیں نہیں جانتے، ہم انہیں جانتے ہیں۔ ہم ان کو دوہرا عذاب دیں گے۔ پھر وہ بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

مختصرا یہ کہ ہر وہ شخص جو اپنے دِل میں تاریک شک وشبہ کی بیماری پالتا ہے تاہم یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ وفادار مومن ہے، وہ ہر طرح سے منافق کہلانے کا مستحق ہے۔

حواشی:

(۱) ملاحظہ ہو، باب ہشتم میں فسق کا تجزیہ۔

(۲) ملاحظہ ہو، رئر، حوالہ اوپر گذر چکا ہے۔

(۳) فخر الدین الرازی: تفسیر کبیر، تفسیر آیت نمبر ۷، ۸۔ سورۃ البقرۃ۔

(۴) یاد رہے کہ طغیان اور ضلالت دونوں کا کفر کی خصوصیات کے طور پر باب ہفتم میں ذکر ہو چکا ہے۔

باب دہم

مومن

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جس طرح اخلاقیات کی تمام منفی صفات اور برائی کے خواص کا مرکزی نقطہ کفر ہے، اسی طرح تمام مثبت اخلاقی صفات کے دائرے کا مرکزی نقطہ ایمان ہے۔ درحقیقت اسلام میں تمام اچھائیوں کا حقیقی سرچشمہ ایمان ہے، سب اچھائیاں ایمان سے ہی پیدا ہوتی ہیں اور اسلام میں کسی ایسی نیکی کا تصور نہیں کیا جا سکتا، جس کی بنیاد اللہ اور اس کی نازل کردہ وحی پر نہ ہو۔

جہاں تک لفظ ایمان کی معنوی ساخت کا تعلق ہے، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس کے سارے بنیادی نکات سے واقف ہو چکے ہیں، کیونکہ منفی اقدار کی اہم اصطلاحات کا معنویاتی تجزیہ کرتے ہوئے ہم اسلامی نقطۂ نظر سے ایک سچے مومن کے خواص بھی بیان کر چکے ہیں، اگرچہ یہ ذکر معکوس شکل میں ہوا ہے۔ چنانچہ اس باب میں بنیادی طور پر ان تمام باتوں کا دوسرا رُخ بیان ہوگا، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

مثالی مومن:

قرآن کی نظر میں مومن کیسا شخص ہے؟ ایمان کی خاص باتیں کیا ہیں اور کیا ہونی چاہئیں؟ مختصر یہ کہ ایک مثالی مومن کے بارے میں کیا توقع ہے کہ اس کا معاشرے میں اور مذہبی معاملات میں کیا رویّہ ہوگا؟

یہ وہ اہم ترین سوال ہیں جو ہمیں ایمان کے بارے میں پوچھنے چاہئیں، صرف عام مفہوم میں ہی نہیں بلکہ ہمارے مخصوص نقطۂ نظر سے بھی پوچھنا ضروری ہیں، کیونکہ ان کے جوابات سے ہی قرآن میں ایمان اور مومن کے سیاق کے معنویاتی اجزا کا تعین ہو سکے گا۔ آیئے ہم ایک آیت سے آغاز کرتے ہیں، جس میں ایمان کا ذکر

خالصتاً مذہبی پہلو سے کیا گیا ہے۔ یہ آیت ہماری تحقیق کے لیے خصوصی اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ اس میں ''سچے مومن'' کی مکمل لفظی تعریف ملتی ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۔ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ۔ (الانفال:۲-۴)

مومن تو وہ ہیں کہ جب خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب اُنھیں اس کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں اور وہ جو نماز پڑھتے ہیں اور جو مال ہم نے ان کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یہی سچے مومن ہیں اور ان کے لیے پروردگار کے ہاں (بڑے بڑے) درجے، بخشش اور عزت کی روزی ہے۔

اس آیت میں ''صحیح معنوں میں'' مومن کی لفظی تصویر بیان کی گئی ہے کہ وہ حقیقی طور پر ایک نیک انسان ہے، جس کے سامنے اللہ کا نام لیتے ہی اس کا دل خوف کی شدت سے لرز اُٹھتا ہے۔ وہ ساری زندگی انتہائی سنجیدگی سے گزارتا ہے۔ مندرجہ ذیل آیت میں اندرونی نیکی کے ان بیرونی مظاہر کا ذکر ہے:

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (التوبہ:۱۱۲)

توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیک کاموں کا حکم کرنے والے، بری باتوں سے منع کرنے

والے، خدا کی حدوں کی حفاظت کرنے والے، (اے پیغمبر!)
مومنوں کو (بہشت کی) خوش خبری سنا دو۔

انسانوں کو نیک اعمال کی طرف راغب کرنے کے لیے سچا ایمان سب سے قوی جذبۂ محرکہ عطا کرتا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو ایمان پختہ نہیں ہوتا۔ اللہ کے سامنے ڈر اور ندامت، بے چون و چرا مشیتِ الٰہی کو تسلیم کرنا، اللہ کی نعمتوں پر صمیم قلب سے تشکر کا رویہ --- یہ سب وہ عناصر ہیں، جنھیں اسلام ایمان کے اعلیٰ خصائص شمار کرتا ہے۔ ان کا لازمی نتیجہ معروف اعمالِ صالحہ کی شکل میں نکلنا چاہیے۔ ان اعمال کا جائزہ ہم آئندہ صفحات میں پیش کریں گے۔ مزید برآں زندگی کے عام معاملات میں بھی یہ عناصر انسان کے ہر عمل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ عقیدے اور نیک عمل کا یہ بنیادی رشتہ آگے چل کر علم الکلام میں بے حد اہمیت اختیار کر گیا جب مرجئہ نے یہ کہہ کر اس مسئلے کو اور بھی نازک شکل دے دی کہ عقیدہ اور عمل دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ آدمی کتنا بھی گنہگار ہو، اگر اس کا ایمان سلامت ہے تو وہ سچا مومن ہے۔ ہم اس مسئلے پر اگلے باب میں بات کریں گے۔ جب صالحات اور اس کے متعلق تصورات کا تجزیہ کریں گے۔ ہم ذیل میں دو آیات کا ذکر کرتے ہیں جن سے ایمان کے اسی پہلو کی وضاحت ہوتی ہے۔ ان آیات میں ان اعمال کا بیان ہے جن سے ایک سچے مومن کو خاص طور پر متصف کیا گیا ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا
وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ
سُجَّدًا وَّقِيَامًا۔ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ
اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا۔ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا۔ وَ الَّذِيْنَ
اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا۔ وَالَّذِيْنَ
لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا
بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا۔ يُّضٰعَفْ لَهُ
الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهِ مُهَانًا۔ اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ

وعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولٰئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ
اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا۔ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا
كِرَامًا۔ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا
وَّعُمْيَانًا ۔ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ
اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۔ (الفرقان:٦٣-٧٤)

اور خدا کے بندے تو وہ ہیں، جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کے آگے سجدے کر کے اور (عجز و ادب سے) کھڑے رہ کر راتیں بسر کرتے ہیں اور وہ جو دُعا مانگتے رہتے ہیں کہ اے پروردگار دوزخ کے عذاب کو ہم سے دُور رکھیو کہ اس کا عذاب بڑی تکلیف کی چیز ہے اور دوزخ ٹھہرنے اور رہنے کی بہت بری جگہ ہے اور یہ کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ بے جا اُڑاتے ہیں اور نہ تنگی کو کام میں لاتے ہیں بلکہ اعتدال کے ساتھ، نہ ضرورت سے زیادہ نہ کم۔ اور جو خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس جاندار کو مار ڈالنا خدا نے حرام کیا ہے، اس کو قتل نہیں کرتے مگر جائز طریق (یعنی شریعت کے حکم) سے۔ اور بدکاری نہیں کرتے، اور جو یہ کام کرے گا سخت گناہ میں مبتلا ہوگا۔ قیامت کے دن اس کو دردناک عذاب ہوگا اور ذلت اور خواری سے ہمیشہ اس میں رہے گا، مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو ایسے لوگوں کے گناہوں کو خدا نیکیوں سے بدل دے گا، اور خدا تو بخشنے والا مہربان ہے، اور جو توبہ کرتا اور عمل نیک کرتا ہے، تو وہ بے شک خدا کی طرف رجوع کرتا ہے، اور وہ جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے

اور جب ان کو بے ہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو بزرگانہ انداز سے گزر جاتے ہیں اور وہ کہ جب ان کو پروردگار کی باتیں سمجھائی جاتی ہیں تو ان پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گرتے، (بلکہ غور وفکر سے سنتے ہیں) اور وہ جو (خدا سے) دُعا مانگتے ہیں کہ اے پروردگار ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے (دل کا چین) اور اولاد کی طرف سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔

بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم عرض کریں گے کہ ان آیات کی رُو سے ایک مثالی مومن سے جن خصائص کی فطری طور پر توقع کی جا سکتی ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

☆ حلم و بردباری کا بنیادی رویہ

☆ عبادات میں مداومت

☆ آخرت کا ڈر

☆ صدقہ و خیرات، صحیح تقویٰ کے عمل کی حیثیت سے یہ سب سے اہم صفت ہے۔ تاہم اس ضمن میں جذبات سے مغلوب اور زمانۂ جاہلیت کی شیخی خوری پر مبنی انتہا پسند فیاضی بھی مطلوب نہیں۔

☆ زمانۂ جاہلیت کے ایسے اعمال سے احتراز جن کی اللہ تعالیٰ نے سختی سے ممانعت کی ہے، مثلاً شرک، کسی جاندار کا ناحق قتل، زنا وغیرہ۔

☆ جھوٹی قسم اُٹھانے اور فضول باتوں سے احتراز

☆ وحی الٰہی کے گہرے مطالب کو سمجھنے کے لیے نازک اور حساس جذبہ۔

☆ آخرت کی اُمید پر، دنیوی زندگی میں سنجیدگی اور پُرسکون خوشی کا احساس۔

اگلی آیت میں مثالی مومن کی جو تصویر کھینچی گئی ہے، وہ بنیادی طور پر ایسی ہی ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ

خَاشِعُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ۔ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ۔ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ۔ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔
(المومنون: ۱-۱۱)

بے شک ایمان والے رستگار ہو گئے، جو نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں اور جو بے ہودہ باتوں سے منہ موڑے رہتے ہیں اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں یا (کنیزوں سے) جو ان کی ملک ہوتی ہیں کہ انھیں ملامت نہیں اور جو ان کے سوا اوروں کے طالب ہوں، وہ (خدا کی مقرر کی ہوئی) حد سے نکل جانے والے ہیں، اور جو امانتوں اور اقراروں کو ملحوظ رکھتے ہیں اور جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں، یہی لوگ میراث حاصل کرنے والے ہیں (یعنی) جو بہشت کی میراث حاصل کریں گے (اور) اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اس تصویر کو مکمل کرنے کے لیے ہم صرف ایک اور آیت کا اضافہ کریں گے۔ یہ سورۂ الاحزاب کی ایک آیت ہے، جس میں تمام مومنوں سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ صحیح ایمان کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اللہ کے فیصلے کی مکمل اطاعت کی جائے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (الاحزاب: ۳۶)

اور کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو حق نہیں ہے کہ

جب خدا اور اس کا رسول کوئی امر مقرر کر دیں تو وہ اس کام میں
اپنا بھی اختیار سمجھیں اور جو کوئی خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی
کرے، وہ صریح گمراہ ہو گیا۔

اب تک کی گفتگو سے قرآنِ کریم کی بیان کردہ ایک مثالی مومن کی عمومی تصویر مکمل ہو گئی ہے۔ اب ہم ان چند ذاتی خصوصیات کا تفصیلی تجزیہ پیش کریں گے، جن کو قرآنِ کریم سچے مومنین کی خصوصیات کے طور پر بیان کرتا ہے۔

ایمان کفر کی ضد:

یہ بات کہ ''کفر''، ''ایمان'' کی قطعی ضد ہے، کسی ثبوت کی محتاج نہیں۔ ہمارے خیال میں یہ امر کافی حد تک واضح ہو چکا ہے کہ اسلامی طریقِ فکر میں دراصل ایمان اور کفر کے مابین تضاد ہی وہ معیار مہیا کرتا ہے جس کے مطابق تمام انسانی خصائل کو اخلاقی طور پر دو باہم متضاد خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مومن اور کافر میں جو واضح دوئی موجود ہے، یہی اسلام کے اخلاقی نظام کی اساس اور کلید ہے۔ قرآنِ کریم میں ہر جگہ اس بنیادی تضاد کا حوالہ موجود ہے۔ ہم یہاں چند نمائندہ مثالوں کا ذکر کرتے ہیں:

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ
كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَهُمْ۔ (محمد:۱۲)

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، ان کو
خدا بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں بہہ رہی ہیں، داخل
فرمائے گا اور جو کافر ہیں وہ فائدے اُٹھاتے ہیں اور (اس طرح)
کھاتے ہیں، جیسے حیوان کھاتے ہیں اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔

اس آیت میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ مومن اور کافر کے درمیان بنیادی تقابل کو مندرجہ ذیل دو اساسی نکات کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔

(۱) دنیاوی اعمال۔ مومن صرف اعمالِ صالحہ (نیک کام) کرتا ہے اور کافر دنیوی لذتوں میں مشغول رہتا ہے۔

(۲) روزِ جزا کا بدلہ۔ مومنوں کو بدلے میں جنت ملے گی، کافروں کو دوزخ، تقریباً یہی بات مندرجہ ذیل آیت کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے:

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِیْ رَوْضَةٍ یُّحْبَرُوْنَ۔ (الروم:۱۵)

تو جو لوگ ایمان لائے اور عملِ نیک کرتے رہے، وہ (بہشت کے) باغ میں خوش حال ہوں گے۔

اگلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ اسی تقابل کی بنیاد پر ان دونوں کے لڑائی کے طریقوں میں اختلاف ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ ۚ اِنَّ كَیْدَ الشَّیْطٰنِ كَانَ ضَعِیْفًا۔ (النسا:۷۶)

جو مومن ہیں وہ تو خدا کے لیے لڑتے ہیں، اور جو کافر ہیں وہ بتوں کے لیے لڑتے ہیں۔ سو تم شیطان کے مددگاروں سے لڑو۔ بے شک شیطان کا داؤ بودا ہوتا ہے۔

مندرجہ ذیل دو آیات میں کفر اور ایمان کو زمانی ترتیب کے حساب سے بیان کیا گیا ہے۔ مزید وضاحت کے لیے یوں کہا جا سکتا ہے کہ کفر اور ایمان دو متضاد ذاتی صفات ہیں جو انسان ادل بدل کر اختیار کرتا رہتا ہے۔ اگرچہ ان کی نوعیت ایسی ہے کہ ایک ہی شخص میں دونوں بیک وقت نہیں پائی جا سکتیں یا یوں کہیے کہ ارتداد کا خطرہ ہر دم موجود رہتا ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ كٰفِرِیْنَ۔ وَكَیْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰی عَلَیْكُمْ اٰیٰتُ اللّٰهِ وَفِیْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ (آلِ عمران:

(۱۰۰-۱۰۱)

اے ایمان والو! اگر تم اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مان لو گے تو تم ایمان کے بعد پھر سے کافر ہو جاؤ گے۔ تم کیسے کفر کی بات کرتے ہو جبکہ اللہ کی آیات تمہارے سامنے پڑھی جاتی ہیں اور اللہ کا رسول تم میں موجود ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ (النحل:۱۰۶)

جو شخص ایمان لانے کے بعد خدا کے ساتھ کفر کرے، وہ نہیں جو (کفر پر زبردستی) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، بلکہ وہ جو (دل سے اور) دل کھول کر کفر کرے تو ایسوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کو بڑا سخت عذاب ہوگا۔

قرآن کریم کی زبان میں اسلام سے ارتداد اور بت پرستی اختیار کرنے کا عمل ایمان کی قیمت پر کفر خریدنے کی مخصوص عبارت سے بیان ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (آلِ عمران:۱۷۷)

جن لوگوں نے ایمان کے بدلے کفر خریدا وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور ان کو دُکھ دینے والا عذاب ہوگا۔

اگر ایمان کفر کی قطعی ضد ہے تو اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ کفر کی ہم معنی تمام برائیوں کے بالمقابل بھی ایمان کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے۔

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۚ لَا يَسْتَوٗنَ۔ (السجدہ:۱۸)

بھلا جو مومن ہو، وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو

نافرمان ہو؟ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔

اس آیت میں کافر کی جگہ فاسق کو مومن کا متضاد بیان کیا گیا ہے۔ اگلی آیت میں تین برائیوں یعنی کفر، فسق اور عصیان (بغاوت، نافرمانی) کو مساوی طور پر ایمان کی ضد بتایا گیا ہے:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ط (الحجرات:۷)

لیکن خدا نے تم کو ایمان عزیز بنا دیا اور اس کو تمہارے دلوں میں سجا دیا اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے تم کو بیزار کر دیا۔

اسلام اور مسلمان:

جیسا کہ پچھلے باب میں ذکر ہوا، اسلام (فعل اسلم) کا مطلب اطاعت یا اپنے کو دوسرے کی رضا پر مکمل طور پر سپرد کر دینا ہے۔ مسلم کا جو قواعد کی رُو سے اسلم کا اسمِ فاعل ہے، مطلب یہ ہوا کہ وہ شخص جو اپنے کو مکمل طور پر سپرد کر دے۔(۱) مذہب اسلام میں ان اصطلاحات کی انتہائی اہمیت اس حقیقت سے معلوم ہوتی ہے کہ اس مذہب کا نام اسلام اور حضرت محمد ﷺ نے جو امت تشکیل دی، اس کے رکن کا نام مسلم رکھا گیا۔

ان خصوصی ناموں کی اصل خود قرآن کریم کی آیات میں ملتی ہے۔ یہ آیات ہمارے خصوصی موضوع کے لحاظ سے اہم ہیں کیونکہ ان کے عموی سیاق سے لفظ اسلام کے معانی کے بارے میں بے حد مفید معلومات ملتی ہیں۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ (آلِ عمران: ۸۴-۸۵)

آپ ان سے کہہ دیجیے: ہم اللہ پر اور جو ہم پر نازل کیا گیا اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ اور اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد پر اُترا اور اس پر بھی جو موسیٰ، عیسیٰ اور ان کے رب کی طرف سے بھیجے گئے رسولوں پر نازل ہوا۔ ہم ان میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ ہم اس کی اطاعت کرتے ہیں جو کوئی اس اطاعت (اسلام) کے علاوہ کوئی دین چاہتا ہے۔ وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور آخرت میں وہ گھاٹا پانے والوں میں سے ہوگا۔

قرآنِ کریم میں ایک بہت ہی خاص مثال ہے جس میں صحرا کے عرب باشندوں کے مزاج کے حوالے سے اسلام کو ایمان سے الگ بیان کیا گیا ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ اسلام مذہب کی طرف پہلا قدم ہے۔ یہ ایک ایسا اوپرا یقین ہے جو دل کی گہرائیوں تک نہیں پہنچا۔ چنانچہ تمام مؤمن قدرتی طور پر مسلمان تو ہیں، لیکن اس کے بالعکس ہمیشہ صحیح نہیں۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ..... اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ (الحجرات: ۱۴-۱۵)

بدوی (اعراب) کہتے ہیں، ہم ایمان لے آئے۔ ان سے کہیے تم ایمان نہیں لائے بلکہ تم یہ کہو کہ ہم اسلام لے آئے۔ (ہم نے خود کو اللہ کے سپرد کیا) کیونکہ ایمان ابھی تمہارے دل میں داخل نہیں ہوا..... سچے مسلمان تو وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر اس کے بعد انہیں کبھی شک نہیں ہوا، انہوں نے جان اور مال کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیے۔ یہی

سچے لوگ ہیں۔

یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہاں لفظ اسلام سے مراد وہ کلمہ یا عبارت ہے، جیسے اَسْلَمْتُ (میں اسلام لایا) جو مذہب قبول کرنے کے رسمی اعلان کے لیے بولا جاتا ہے۔

یہاں جو مفہوم مراد ہے وہ سیدھا سادا یہ ہے کہ امتِ مسلمہ میں شامل ہو جانے سے یہ ضمانت نہیں ہوتی کہ وہ شخص حقیقی معنوں میں ایمان رکھتا ہے۔ آج کے فلسفۂ لسانیات کی زبان میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلمتُ (میں اسلام لایا) کی عبارت 'ادائیۂ' عبارت ہے جو زبان کے ایسے استعمال کو کہتے ہیں، جس میں ایک شخص اپنے بارے میں کچھ کہتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اسلمت کا اعلان کر کے انسان آئندہ خود کو ایک خاص طریقِ زندگی کا پابند قرار دیتا ہے یا وہ ایک خاص ارادے یا رویّے کا اقرار کرتا ہے۔ لیکن دوسرے ادائیہ افعال کی طرح اسلمت کی عبارت اخلاص کی ضامن نہیں۔ (۲)

بہر حال اس سے کسی طرح بھی ''اسلام'' کی اعلیٰ ترین مذہبی قدر میں کوئی کمی نہیں آتی، کیونکہ اسلام رضائے الٰہی کے سامنے اپنے آپ کو مکمل طور پر سپرد کرنے کا باطنی عمل ہے۔

اس آیت کو وحیٔ الٰہی کے بنیادی اصول قرار دے کر بخاری اسلام کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں اور ان میں فرق یوں بیان کرتے ہیں۔

(۱) رسمی اور ظاہری اسلام جس کا سبب خالص مذہبی جذبہ نہیں، بلکہ مثلاً مسلمانوں کے ہاتھوں مارے جانے کا خوف ہو سکتا ہے۔

(۲) حقیقی اسلام: ہمارے خیال میں بیضاوی کا تجزیہ بہت حد تک درست ہے۔ ان کے نزدیک سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۹ میں اسلام سے حقیقی اسلام مراد ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ اللہ کی نظر میں دین صرف اسلام ہے۔ (۳)

ان معنوں میں بطورِ دینی عنصر اسلام ایمان سے کسی طرح اہمیت میں کم نہیں۔

صرف یہ بات ہے کہ لفظ ''اسلام'' کی معنویاتی ساخت ''ایمان'' کی معنوی ساخت سے بالکل مختلف ہے، کیونکہ اسلام جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ایسے تصورات پر مبنی ہے، جیسے عاجزی، صبر، بھروسہ، خود انحصاری کی نفی وغیرہ۔ ہم باب پنجم میں ان عناصر کا ذکر کر چکے ہیں۔

اب ہم اس لفظ کے استعمال کی ایک ایسی مثال پیش کرتے ہیں، جس سے بہت روشن طریقے سے واضح ہو جائے گا کہ مذہب کے قرآنی تصور میں ''عاجزانہ سپرداری'' کی کیا اہمیت ہے۔

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۔۔۔ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ وَوَصّٰی بِهَاۤ اِبْرٰھٖمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔

(البقرة:۱۲۷-۱۳۲)

جب ابراہیم اسماعیل کے ساتھ مل کر (اللہ کے) گھر کی بنیادیں اُٹھا رہے تھے۔ اے اللہ ہم سے یہ قبول فرما، بے شک تُو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے اللہ! تُو ہمیں اپنے سامنے تسلیم کرنے والے (مسلمین) بنا لے۔ ہماری اولاد میں سے ایک ایسی امت پیدا کر جو تیرے سامنے سرتسلیم خم کرنے والی ہو۔ ہمیں اپنی مقدس عبادت کے طریقے دکھا اور ہماری طرف توجہ کر یقیناً تو معاف کرنے والا اور رحمت کرنے والا ہے... پھر جب اس کے رب نے اس سے کہا خود کو ہمارے سپرد کر دے (اسلم)۔ تو اس نے کہا، میں نے خود کو تمام جہانوں کے رب کے سپرد کر دیا۔ ابراہیم نے اپنے بیٹے سے بھی یہی کرنے کو کہا۔ یہی یعقوب نے

کیا۔ اُنہوں نے کہا، ''اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے دین چن لیا ہے۔ چنانچہ تمہیں موت آئے تو صرف اس حالت میں کہ تم خود کو اس کے سپرد کر چکے ہو۔ ان آیات میں ''خود کو سپرد کرنے'' کے گہرے مذہبی معانی بہت ہی صراحت سے پتہ چلتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ خود سپردگی کے فعل کو فوری طور پر سچا مذہب بھی بتایا گیا ہے۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ سورۃ الحجرات کی مذکورہ بالا آیات میں ''سپردگی'' (اسلام) کا مطلب ڈھیلا ڈھالا اور اوپرا قسم کا ایمان یا ایمان و یقین کی طرف پہلا لڑکھڑاتا قدم تھا، اس مفہوم سے بالکل ہٹ کر یہاں سپردگی اس بنیاد کا نام ہے، جس پر مذہب اسلام کی عمارت قائم ہے۔

مندرجہ ذیل آیت میں مسلم کا مقابلہ قاسط سے کیا گیا ہے۔ قاسط سے مراد ایسا شخص ہے جو صحیح راستے سے ہٹ جائے (اور بالآخر ناانصافی کے کام کرے)، جس سے مراد یہ ہے کہ اسلام ہی صحیح راستہ ہے۔

وَاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقَاسِطُوْنَ ۭ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰۗىِٕكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا۔ وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا۔

(الجن: ۱۴–۱۵)

یقیناً ہم میں سے کچھ مسلمان (سپرد کرنے والے) ہیں اور کچھ بے انصاف ہیں۔ تو جس نے سپرد کر دیا تو اُنہوں نے ٹھیک راستہ چنا۔ اور جو بے انصاف ہیں، وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

یہاں سپرد کرنے سے مراد اپنے پورے وجود کو اللہ اور صرف اللہ کے سپرد کرنا ہے۔ ایک مسلمان اپنے وجود کی ہی نفی کرے گا، اگر وہ بت پرستی کے بارے میں کسی قسم کی مصالحت کے رویے کو اپنائے۔ ان معنوں میں مسلم مشرک کا بالکل متضاد ہے۔

قُلْ اِنِّىْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَاتَكُوْنَنَّ

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (الانعام: ۱۴)

کہہ دیجیے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں وہ پہلا شخص بنوں جس نے اپنے کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ اور آپ مشرکین میں نہ ہو جائیے۔

لفظ حنیف جو مفسرین کے لیے معمہ بنا رہا، قرآنِ کریم کے مکی دَور میں بہت اخیر میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ غالباً اس لفظ کا تعلق اس خالص نظریۂ توحید سے بہت زیادہ ہے جو بطور مذہب صرف اور صرف ایک خدا کے سامنے جھکنے کو کہتا ہے۔ جیسا کہ ہم قرآن میں اس کے استعمال سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ لفظ حنیف[۴] کسی زبان سے بھی آیا ہو، ایک مذہبی اصطلاح ہے، جس کی معنوی ساخت میں اور مفاہیم کے علاوہ مندرجہ ذیل تصورات شامل ہیں:

(۱) ایک سچے مذہب کا تصور جس کی گہری جڑیں ہر انسان کی فطری سرشت میں صرف ایک خدا پر ایمان کا تقاضا کرتی ہیں۔

(۲) اُس خدائے واحد کی مکمل اطاعت کا تصور۔

(۳) بت پرستی کا قطعی متضاد تصور۔

اس تصور میں یہ بات بہت اہم ہے کہ ابراہیم، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، جو پہلے شخص تھے، جنہوں نے اپنے کو خدا کے سپرد کیا، وہ اس مثالی حنیف کا نمونہ ہیں۔ قرآن میں بار بار اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ابراہیم نہ یہودی تھے نہ عیسائی، بُت پرست ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ تو حنیف تھے، جنہوں نے بہت غور و فکر اور منطقی استدلال سے دریافت کر لیا تھا کہ شرک بے حقیقت اور باطل ہے۔[۵] ہم یہاں چند آیات کا ذکر کریں گے جو ہمارے موضوع سے تعلق رکھتی ہیں:

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً[۶] قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ۭ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ۭ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔۔۔ ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (النحل: ۱۲۱-۱۲۳)

بے شک ابراہیم اپنی ذات میں پارسائی کے مثال تھے،
وہ حنیف تھے اور بت پرست نہیں تھے۔ وہ اللہ کی نعمتوں کے
شکرگزار تھے۔ اللہ نے انہیں چن لیا اور سیدھا راستہ دکھایا... پھر
اے محمد (ﷺ) ہم نے آپ کو وحی کے ذریعے حکم دیا۔ مذہبِ
ابراہیم کی پیروی کرو جو حنیف تھے اور بت پرست نہیں تھے۔

مندرجہ ذیل آیت میں حنیف اور مشرک کے تصورات میں جو تضاد ہے، اس کو پُرزور طریقے سے بیان کیا گیا ہے:

وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَاتَكُوْنَنَّ مِنَ
الْمُشْرِكِيْنَ۔ وَلَاتَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ
فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (یونس: ۱۰۴-۱۰۶)

اور یہ کہ آپ مذہب کی طرف پوری طرح متوجہ ہو
جائیں، ایک حنیف کی طرح۔ بُت پرستوں میں شامل نہ ہوں۔
اللہ کے سوا کسی کو نہ پکاریں جو تمہیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ
نقصان۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ ظالموں میں سے ہوں
گے۔

ذیل کی دو آیات اس بات پر زور دیتی ہیں کہ حنیف کا مذہب دراصل سچا مذہب ہے۔ پہلی آیت مزید برآں یہ بھی بتاتی ہے کہ خالص توحید کا عقیدہ، حضرت ابراہیمؑ جس کی مثال ہیں، پوری بنی نوع انسان کا فطری مذہب ہے۔ اگر تمام لوگ اس جبلی جذبے کی رہنمائی میں چلیں جسے اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کی روح میں ودیعت کیا ہے تو اس مذہب کو ہی اختیار کریں گے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ
النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَاتَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ
اَكْثَرَ النَّاسِ لَايَعْلَمُوْنَ۔ (الروم: ۳۰)

پوری طرح دین کی طرف ایک حنیف کی طرح متوجہ ہو

جایئے، یہ وہ فطری مزاج ہے جس پر اللہ نے تمام انسانوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں۔ یہی سچا دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ۔ (البینہ:۵)

انہیں صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ حنفا کی حیثیت سے صرف اللہ کی عبادت کریں، دین کو خالص اس کے لیے رکھیں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ یہ ہے سچا مذہب۔

لفظ قَيِّمَةِ اس آیت میں اُمت کے لقب یا صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

آیت میں مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔(۷) لفظ مخلص اخلص کا اسم فاعل ہے، جس سے مراد کسی چیز کو خالص بنانا، کسی ملاوٹ سے پاک رکھنا۔ بعض اوقات اس کا ترجمہ وفادار اور نیازمند بھی کیا جاتا ہے۔ خ ل ص کا مادہ انہی مختلف شکلوں میں قرآنِ کریم میں اکثر ایک قسم کے خالص توحید کے عقیدے کو ظاہر کرتا ہے، جو لفظ حنیف کا مفہوم ہے۔ یہ مفہوم شرک کی تمام شکلوں سے ممیز ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے سے گویا انسان اپنے مذہب میں بیرونی عناصر کو شامل کر کے اسے ناخالص بنا دیتا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ۔ ؕ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ (الزمر:۲)

ہم نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب اُتاری۔ تو اللہ کی عبادت کیجیے کہ مذہب خالص اسی کے لیے ہے، کیا خالص دین صرف اللہ کے لیے نہیں ہے۔

اگلی آیت میں دین کو ملاوٹ سے پاک رکھنے کا یہی فعل اسلام یعنی سپردگی کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ جس سے ان دونوں الفاظ کے مابین گہرے رشتے کا پتہ چلتا

ہے:

قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ۔ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ۔۔۔ قُلِ اللّٰہَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّہٗ دِیْنِیْ۔ فَاعْبُدُوْا مَاشِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ (الزمر:۱۱-۱۵)

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ذیل کی آیت میں حضرت ابراہیم کا ذکر ان لوگوں میں کیا گیا ہے جنہیں خود اللہ نے مخلص بنایا:

وَاذْکُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ۔ اِنَّآ اَخْلَصْنٰھُمْ بِخَالِصَۃٍ ذِکْرَی الدَّارِ۔ (ص: ۴۵-۴۶)

ہمارے بندوں ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کو یاد کیجیے جنہیں ہم نے طاقت اور بصیرت دی تھی، ہم نے خالصہ یعنی ذکرِ آخرت کے ساتھ پاک بنا دیا۔

ہدایتِ خداوندی:

جیسا کہ ہم پہلے ''ضلالت'' کے تصور کے تجزیے کے حوالے سے کہہ چکے ہیں کہ قرآنی فکر کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں مذہب کا تصور ہدایتِ خداوندی کے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس تصور میں اسلام ایمان کے مفہوم میں مذہب محض ہدایت (اھتدی) ہے، یعنی صحیح راستہ کی طرف رہنمائی اور اس رہنمائی پر عمل۔ وحی بھی اصل میں ان لوگوں کے لیے رحیمانہ ہدایت ہے جو ایمان کی اہلیت رکھتے ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ قرآن کریم کے سرسری مطالعہ سے بھی قاری اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس پوری کتاب میں یہ بنیادی فکر جاری و ساری ہے کہ ''اللہ جسے چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے۔'' یا--- جو بظاہر منطقی طور پر اس کے متضاد لگتا ہے--- یہ کہ اس رحیمانہ ہدایت میں اللہ تمام لوگوں کے ساتھ مکمل طور پر غیر جانبدارانہ برابری سے کام لیتا ہے۔ اور کچھ لوگ

اسے اپنی مرضی سے قبول کرتے ہیں اور کچھ اپنی مرضی سے انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن دونوں صورتوں میں نازل کردہ آیات ہدایتِ الٰہی پر مشتمل ہیں:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۔ (طٰہٰ:۱۲۳-۱۲۴)

اگر میری طرف سے تمہارے لیے ہدایت نازل ہوئی تو جس نے بھی میری ہدایت کا اتباع کیا، وہ نہ کبھی گمراہ ہوگا، نہ کبھی مصیبت میں پڑے گا اور جس نے میری ہدایت سے انکار کیا، اس کی زندگی وبال ہوگی اور حشر کے دن اسے اندھا اُٹھایا جائے گا۔

غور کیجیے کہ اس آیت کے دوسرے حصے میں ھدی کی جگہ لفظ ذکر استعمال ہوا ہے، جو قرآن کریم میں بہت کثرت سے وحی کے لیے آیا ہے جو انسان کو اللہ کی یاد دلاتی ہے۔ ذیل کی آیت میں پوری نازل شدہ کتاب کو ہدایت کے نام سے ذکر کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔ (الاعراف:۵۲)

یقیناً ہم نے ان کی طرف کتاب بھیجی، جس میں ہم نے علم کی بنیاد پر بہت تفصیل فراہم کی۔ یہ ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں، ہدایت اور رحمت ہے۔

چنانچہ انسانی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ایمان اس ہدایت کے اتباع کا نام ہے اور صحیح راستے کے انتخاب کا نام ہے۔ اس کے برعکس کفر اس ہدایت سے منہ موڑنے کا نام ہے۔ گویا صحیح راستے سے ہٹ جانے کو کفر کہتے ہیں۔ ذیل کی آیت میں ایمان کے انسانی فعل کا بہت صراحت کے ساتھ ہدایتِ خداوندی کے تصور سے ربط بیان کیا گیا ہے۔

إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى۔ (الکہف: ۱۰)

یہ وہ نوجوان تھے جو اللہ پر ایمان رکھتے تھے اور ہم نے
ان کو مزید ہدایت دی۔

یہ بات بہت واضح ہے کہ اس آیت کے مفہوم میں ہدایت کی جگہ ایمان کا لفظ بھی استعمال ہو سکتا ہے اور اس سے آیت کے عمومی معانی میں کوئی بنیادی فرق نہیں پڑے گا۔ اگلی آیت میں بھی لفظ ''ایمان'' کو اس کی تمام خصوصیات کے ساتھ ان لوگوں کی حالت کے مساوی بیان کیا گیا ہے، ''جنھوں نے ہدایت پائی۔''

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ أَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ
عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۚ أُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ ۚ وَفِي النَّارِ هُمْ
خٰلِدُوْنَ۔ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
وَأَقَامَ الصَّلٰوةَ وَآتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللّٰهَ ۚ فَعَسٰٓى أُولٰٓئِكَ
أَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ۔ (التوبہ: ۱۷-۱۸)

یہ مشرکین کا کام نہیں کہ وہ اللہ کی مساجد میں حاضری دیں، جبکہ وہ اپنی ذات سے کفر کے گواہ ہیں۔ ان کے اعمال اکارت گئے اور ہمیشہ آگ میں رہیں گے۔ اللہ کی مسجدوں میں حاضری تو ان کا کام ہے، جو ایمان لاتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ ایسے لوگ شاید ہدایت یافتہ ہو جائیں۔

ہدایت یافتہ کا مطلب ظاہر ہے، صحیح راستہ ہے۔ اس درجہ ہدایت کو ایک اور لفظ رشد کے ذریعے بھی بیان کیا گیا ہے۔ یہ مادہ قرآنِ کریم میں کئی صیغوں میں استعمال ہوا ہے۔ بطور فعل رَشَدَ، بطور مصدر رَشَدٌ، رُشْدٌ، رشاد، بطور صفت رَشِیْدٌ۔ ذیل کی آیت میں ''ہدایت'' اور ''صحیح سمت'' میں جو قریبی معنویاتی رشتہ ہے، بہت صراحت سے نظر آتا ہے۔

إِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا۔ يَّهْدِيْٓ إِلَى الرُّشْدِ۔ (الجن: ۱-۲)

ہم نے ایک عجیب قرآن کو سُنا جو صحیح راستہ دکھاتا ہے۔

اس آیت کو سورۃ غافر کی آیت ۲۹ کے ساتھ ملا کر پڑھیں کہ جب فرعون کی قوم میں سے ایک شخص جو ایمان لے آیا تھا، اپنے لوگوں کو اس بات پر فہمائش کرتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰؑ کی قوم کے ساتھ برا سلوک کر رہے ہیں اور دوسری باتوں کے علاوہ یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حد سے باہر نکل جانے اور جھوٹ بولنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا تو فرعون غصے میں آ جاتا ہے اور کہتا ہے:

مَآ أُرِيكُمْ إِلَّا مَآ أَرَىٰ وَمَآ أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ۔

(غافر: ۳۰)

میں تمہیں صرف وہی دکھاتا ہوں، جو میں دیکھتا ہوں اور میں تو تمہیں صرف صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہوں۔

ذیل کی دو آیات میں سیاق عبارت میں رشد کو ایمان اور اسلام سے بالترتیب یکساں بتایا گیا ہے۔

لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۖ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ ۚ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ (البقرة:۲۵۷)

مذہب میں کوئی مجبوری نہیں، صحیح راستہ غلط راستے سے الگ واضح ہے۔ جو بھی بتوں سے انکار کرتا ہے، اور اللہ پر ایمان لاتا ہے، اس نے مضبوط دستہ پکڑ لیا اور اب یہ رشتہ نہیں ٹوٹے گا۔

وَّأَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُونَ وَمِنَّا الْقَاسِطُونَ ۖ فَمَنْ أَسْلَمَ فَأُولَٰئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا۔ (الجن:۱٤)

ہم میں سے کچھ اسلام لے آئے اور کچھ نے بے انصافی کی۔ جو اسلام لے آئے اُنہوں نے ٹھیک راستہ اختیار کیا۔

خوفِ خدا:

اب لفظ ایمان کی معنوی ساخت کی طرف آتے ہیں۔ سب سے پہلے تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں یہ لفظ دو بنیادی تصورات سے وابستہ ہے۔ تقویٰ، خوفِ خدا اور شکر۔ اس فصل میں ہم پہلے تصور پر بات کریں گے۔

وحیٔ قرآنی، خصوصاً حضرت محمد ﷺ کی نبوی زندگی کے پہلے دور میں آخرت کے اثر انگیز مناظر سے پُر ہے۔ اور اس عمومی تصویر میں تقویٰ یعنی خوفِ خدا کا ربط بہت گہرا نظر آتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس مخصوص حوالے سے تقویٰ درحقیقت ہولناک قیامت سے متعلق خوفِ آخرت کا نام ہے۔

> يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ۔ (الحج:۱)
>
> اے بنی نوع انسان! اپنے رب سے ڈرو۔ قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہے۔

روزِ جزا اور روزِ سزا کا مالک، اس نئے مذہب کے دو بنیادی نشان ہیں جو اس کے ہر پہلو میں نظر آتے ہیں۔ اور اس کے بنیادی مزاج کا تعین کرتے ہیں۔ خدا پر ایمان کا مطلب ہے، روزِ جزا کے مالک کی حیثیت سے خدا کا ڈر۔ ایسے حاکم کا خوف جو کافروں کو ہٹ دھرم انکار کی وجہ سے دوزخ کی آگ میں ہمیشہ کے لیے ڈال دے گا۔ اس ابتدائی دور کی سورتوں میں مومن کی تعریف کی ممکنہ عبارت یوں ہو سکتی ہے۔ ''ایسا شخص جو اللہ کے سامنے اس کے خوف سے کانپ رہا ہو۔''

اب یہ سمجھنا آسان ہے کہ قرآنِ کریم میں ''ایمان'' اور ''ڈر'' کو ایک دوسرے سے مترادف کیوں استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی ایک مثال کافی ہے:

> زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ (البقرۃ:۲۱۲)

اور جو کافر ہیں، اُن کے لیے دُنیا کی زندگی خوش نما کر
دی گئی ہے، اور وہ مومنوں سے تمسخر کرتے ہیں، لیکن جو پرہیزگار
ہیں، وہ قیامت کے دن ان پر غالب ہوں گے اور خدا جس کو
چاہتا ہے، بے شمار رزق دیتا ہے۔

''ایمان'' اور ''ڈر'' میں جو قریبی رشتہ ہے، اسے ایک شرطیہ منطقی مساوات سے بھی ظاہر کیا جا سکتا ہے، جسے اگر الف تو ب (یعنی ایمان اور ڈر لازم وملزوم ہیں)۔ قابلِ غور ہے کہ حقیقی معنوں میں ب، یعنی ڈر اکثر امر کے صیغے کے ساتھ آیا ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (المائدہ:۵۷)

اللہ سے ڈرو، اگر تم مومن ہو۔

اگر ایمان کے تصور میں ''ڈر'' کو بنیادی عنصر کی حیثیت حاصل ہے تو فطری طور پر یہ کفر کا متضاد ٹھہرتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ''متقی'' (تقویٰ رکھنے والا) بار بار ''کافر'' کے بالمقابل استعمال ہوا ہے۔ مندرجہ ذیل آیت اس کی ایک مثال ہے:

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى
الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ۔ (الرعد:۳۵)

جس باغ کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے، اس کے
اوصاف یہ ہیں کہ اس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، اس کے پھل
ہمیشہ (قائم رہنے والے) ہیں اور اس کے سائے بھی۔ یہ ان
لوگوں کا انجام ہے جو متقی ہیں اور کافروں کا انجام دوزخ ہے۔

بعض اوقات ''ظالم'' بھی ''متقی'' کے متضاد کے طور پر استعمال ہوا ہے:

وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ
الْمُتَّقِيْنَ۔ (الجاثیہ:۱۹)

ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں، اور
خدا پرہیزگاروں کا دوست ہے۔

جیسا کہ ظاہر ہے تقویٰ سے مراد کسی طرح بھی عام قسم کا ڈر نہیں۔[۸] تاہم کم از کم اپنے اصل معنوں میں یہ ڈر کا جذبہ ہی ہے۔ یہ بات اس طرح ثابت ہوتی ہے کہ قرآن میں اکثر مقامات پر تقویٰ کے ہم معنی جو الفاظ استعمال ہوئے، ان سے اکثر عام ڈر ہی مراد ہے۔ ان میں سے سب سے اہم خشیت، جس سے فعل کا صیغہ خَشِیَ ہے اور خوف ہے۔

ہم پہلے لفظ خشیت کے معانی پر بحث کریں گے۔ خشیت اور تقویٰ کا ہم معنی ہونا، کم از کم قرآنی زبان کے حوالے سے، مندرجہ ذیل آیت سے بخوبی واضح ہوتا ہے، جہاں لفظ خَشِیَ ایک جزئی مرکب کے طور پر لفظ متقی کو صحیح طور پر بیان کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

> لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ۙ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ۔ (الانبیاء:۴۸-۴۹)
>
> متقی لوگ وہ ہیں جو غیب کے معاملات میں اللہ سے ڈرتے ہیں اور قیامت کے بارے میں خوف کرتے ہیں۔

اس معنوی قربت کی کسی حد تک تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ خشیت اور تقویٰ کے الفاظ اکثر ایک ہی جملے میں ساتھ ساتھ تقریباً ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

> وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ۔ (النور:۵۲)
>
> اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا اور اس سے ڈرے گا، تو ایسے ہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں۔

ہم نے دیکھا کہ جنت کی بشارت اُن لوگوں کو دی گئی جو تقویٰ کی صفت سے متصف ہیں۔ بالکل یہی بات اُن کے لیے بھی کہی گئی جو خشیتِ الٰہی سے متصف ہیں۔ اس مثال میں ایک اور شہادت بھی ملتی ہے کہ ایسی عبارات میں الفاظ میں کوئی فرق نہیں ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ
الْبَرِيَّةِ ۔ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ
لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۔ (البینہ:۷-۸)

اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، وہ
تمام خلقت سے بہتر ہیں۔ ان کا صلہ ان کے پروردگار کے ہاں
ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔
ہمیشہ اُن میں رہیں گے۔ خدا ان سے خوش اور وہ اس سے خوش،
یہ (صلہ) اس کے لیے ہے جو اپنے پروردگار سے ڈرتا ہے۔

اس آیت میں ''وہ جو اللہ سے ڈرتا (خشیت) ہے'' کی عبارت بھی قابلِ غور ہے، کیونکہ یہ واضح طور پر ''مومن'' کے بدل کے طور پر مذکور ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ لفظ خشیت الفاظ کی اس صنف سے تعلق رکھتا ہے، جن میں معنوی صراحت بہت نمایاں طور پر موجود ہے۔ قرآنِ کریم میں اس لفظ کے ذکر کا جائزہ لیں تو کہا جا سکتا ہے کہ لفظ خشیت شدید خوف کے ایسے اضطراری جذبے کو بیان کرتا ہے کہ جو انسانی حواس پر غالب آ جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل آیت میں یہ معنوی پہلو بہت واضح طور پر سامنے آتا ہے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ
مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ اِلٰى
ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِي بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ
فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۔ (الزمر:۲۳)

خدا نے نہایت اچھی باتیں نازل فرمائی ہیں (یعنی)
کتاب (جس کی آیتیں باہم) ملتی جلتی ہیں، اور دہرائی (جاتی
ہیں) جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں، ان کے بدن کے
(اس سے) رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کے بدن اور

دل نرم (ہوکر) خدا کی یاد کی طرف (متوجہ) ہو جاتے ہیں۔ یہی خدا کی ہدایت ہے۔ وہ اس سے جس کو چاہتا ہے، ہدایات دیتا ہے، اور جس کو خدا گمراہ کرے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔

اس لفظ کی قوتِ بیانیہ کا اظہار مندرجہ ذیل آیت میں بھی بہت نمایاں ہے۔ یہ بات محتاج بیان نہیں کہ یہاں خشیت الٰہی کا ذکر ایسے الفاظ میں ہے گویا یہ کسی قوتِ منفجرہ (پھٹ اٹھنے والی طاقت) سے بھر گئی ہے۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ (الحشر:۲۱)

اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو دیکھتے کہ خدا کے خوف سے دبا اور پھٹا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم میں مستعمل عربی زبان کے نقطۂ نظر سے خشیَ کے فعل کا مفعول ہمیشہ اللہ ہی آتا ہے۔ تاہم بعض اوقات ڈر کی سمت غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں خشی کا مفعول خود انسان ہوتا ہے، خدا نہیں۔ (۹)

آخر میں ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں، جس سے لفظ خشی ایک ایسے سیاق میں استعمال ہوا ہے، جس کا مذہب سے تعلق نہیں۔ یہاں ''ڈر'' کا مفعول فرعون اور اس کے درباری ہیں یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہاں فرعون اور اس کے درباریوں پر غلبہ پانے کے خوف کا ذکر ہے۔

وَلَقَدْ اَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ یَبَسًا لَّا تَخٰفُ دَرَکًا وَّلَا تَخْشٰی۔ (طٰہٰ:۷۷)

اور ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی بھیجی کہ ہمارے بندوں کو راتوں رات نکال لے جاؤ۔ پھر ان کے لیے دریا میں (لاٹھی مار کر) خشک رستہ بنا دو۔ پھر تم کو نہ تو (فرعون کے) آ پکڑنے کا

خوف ہوگا اور نہ (غرق ہونے کا) ڈر۔

علاوہ ازیں، اس آیت کی عبارت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہاں اگر خشی کی بجائے خوف کا لفظ بھی استعمال کیا جائے تو معنوں میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اب ہم لفظ خوف کے تجزیے کی طرف آتے ہیں۔

اصل میں لفظ خوف سے مراد عموماً ڈر کا طبعی جذبہ ہے۔ فطری طور پر اس سے ایسا ڈر بھی مراد ہو سکتا ہے، جس کا تعلق کسی غیر معمولی اور پُراسرار مظہرِ فطرت سے ہو۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں یہ لفظ بار بار حضرت موسیٰ کے حوالے سے آیا ہے، کہ جب اُنہوں نے چھڑیوں اور رسیوں کو حیرت انگیز طریقے سے بل کھاتے سانپ بنتے دیکھا تو ڈر گئے۔ مندرجہ ذیل دو آیات بطورِ مثال درج ہیں:

> وَاَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۚ يٰمُوْسٰى لَاتَخَفْ ۣ اِنِّىْ لَايَخَافُ لَدَىَّ الْمُرْسَلُوْنَ۔ (النمل: ۱۰)
>
> اور اپنی لاٹھی ڈال دو۔ جب اسے دیکھا تو (اس طرح) ہل رہی تھی، گویا سانپ ہے تو پیٹھ پھیر کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھا (حکم ہوا کہ) موسیٰ ڈرو مت۔ ہمارے پاس پیغمبر ڈرا نہیں کرتے۔
>
> قَالُوْا يٰمُوْسٰى اِمَّآ اَنْ تُلْقِىَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى۔ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى۔ فَاَوْجَسَ فِىْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى۔ قُلْنَا لَاتَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى۔ (طٰہٰ: ۶۵-۶۸)
>
> بولے کہ موسیٰ یا تو تم (اپنی چیز) ڈالو یا ہم اپنی چیزیں پہلے ڈالتے ہیں۔ موسیٰ نے کہا، نہیں تم ہی ڈالو۔ جب اُنہوں نے چیزیں ڈالیں، تو ناگہاں ان کی رسیاں اور لاٹھیاں موسیٰ کے خیال میں ایسے آنے لگیں کہ وہ (میدان میں اِدھر اُدھر) دوڑ رہی

ہیں۔ (اس وقت) موسیٰ نے اپنے دل میں خوف معلوم کیا۔ ہم
نے کہا خوف نہ کرو۔ بلاشبہ تم ہی غالب ہو۔

یہ بالکل فطری امر ہے کہ اللہ کی نشانیوں (آیات) خصوصاً عذابِ دوزخ سے متعلق آیات کے سننے سے ڈر کا احساس ابھر آئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیات غافل انسانوں کے دلوں میں خوف ڈالنے کے لیے ہی اُتاری ہیں:

وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا۔ وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْیَا الَّتِیْۤ اَرَیْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ ؕ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا طُغْیَانًا كَبِیْرًا۔ (الاسراء: ۵۹-۶۰)

اور ہم جو نشانیاں بھیجا کرتے ہیں تو ڈرانے کو، جب ہم نے تم سے کہا کہ تمہارا پروردگار لوگوں کو احاطہ کیے ہوئے ہے اور جو رؤیا ہم نے تمھیں دکھائی اس کو لوگوں کے لیے آزمائش کیا اور اس طرح (تھوہر کے) درخت کو جس پر قرآن میں لعنت کی گئی اور ہم اُنھیں ڈراتے ہیں تو ان کو اس سے بڑی (سخت) سرکشی پیدا ہوتی ہے۔

اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ (الشعراء: ۱۳۵)

مجھ کو تمہارے بارے میں بڑے (سخت) دن کے عذاب کا خوف ہے۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَخَافَ وَعِیْدِ۔ (ابراھیم: ۱۴)

یہ اس شخص کے لیے ہے جو (قیامت کے روز) میرے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرے اور میرے عذاب سے خوف کرے۔

ایک قدم اور آگے بڑھیں تو خوف کا مفعول خود اللہ تعالیٰ بن جاتا ہے۔ یا بے ایمان لوگوں کے حوالے سے شیطان کا خوف بعض اعمال کا سبب ٹھہرتا ہے۔

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۖ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (آلِ عمران:۱۷۵)

(یہ خوف دلانے والا) تو شیطان ہے، جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے تو اگر تم مومن ہو تو ان سے مت ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہنا۔

اس آیت میں یہ عبارت ''اگر تم مومن ہو تو صرف مجھ سے ڈرو'' بعینہٖ تقویٰ کے مترادف ہے۔ اگر ہم ایک اور آیت سے موازنہ کریں تو یہ بات مزید واضح ہو جائے گی۔ اس آیت میں لفظ خوف سے تقریباً یہی معنی مراد ہیں۔

ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ۚ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ۔

(الزمر:۱۶)

یہ وہ (عذاب) ہے، جس سے خدا اپنے بندوں کو ڈراتا ہے تو اے میرے بندو مجھ سے ڈرتے رہو۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ۔ (النحل:۲)

وہی فرشتوں کو پیغام دے کر اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس کے پاس چاہتا ہے، بھیجتا ہے کہ (لوگوں کو) ڈراؤ کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، تو مجھ ہی سے ڈرو۔

اس کی تائید آگے چل کر بعد کے جملے سے ہوتی ہے جو ہابیل کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔ وہ اپنے بھائی کو قتل کرنے سے ہاتھ روک لیتا، حالانکہ اس کا بھائی قابیل اسے قتل کرنے کے درپے ہے۔

مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (المائدہ:۲۸)

میں تمہیں قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا، میں جہانوں کے رب سے ڈرتا ہوں۔

اسی طرح اگلی آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ خوف اللہ کے عذاب سے ڈرنے کے معنوں میں آیا ہے جو لہ قرآنی زبان میں تقویٰ کا اصل مفہوم ہے۔

وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۭ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (الاعراف:۵٦)

اسے ڈر اور لالچ سے پکارو۔ بے شک اللہ نیکوکاروں کے قریب ہے۔

یاد رہے کہ المائدہ ۲۳ میں مؤمنوں کی تعریف یہ کہہ کر کی گئی ہے کہ وہ ڈرنے والے ہیں۔

خشی اور خوف کے ساتھ لفظ رھب کا بھی ذکر لازمی ہے، جو عام طور پر خوف کے ہم معنی کے طور پر آتا ہے اور قرآن میں یہ تقویٰ کا مترادف ہے۔ اس ترادف کی مثال مندرجہ ذیل آیت ہے جس میں یہی مفہوم دو مرتبہ تسلسل کے ساتھ رھب اور اتقی کے الفاظ کے ذریعے بیان ہوا ہے۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰـهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ۔ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ۔ (النحل: ۵١-۵۲)

اللہ نے کہا، دو خدا نہ بناؤ۔ خدا تو یقیناً صرف ایک ہے۔ تو تم صرف مجھ ہی سے ڈرو۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، وہ سب اسی کا ہے۔ دین ہمیشہ اسی کا ہے، تو کیا تم اللہ کے سوا کسی اور سے ڈرو گے؟''

اگلی آیت میں منافقین کو شدت سے مطعون کیا گیا ہے کہ وہ خدا کی بجائے طاقتور انسانوں سے ڈرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ رھبہ (رھب کا مصدر) کا صحیح حقدار صرف خدا ہے۔

لَاَانْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ۔ (الحشر:۱۲)

ان کے دلوں میں تمہارا ڈر خدا سے زیادہ ہے، اس لیے کہ یہ لوگ کوئی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔

یہاں ہم یہ اضافہ کرتے چلیں کہ اس فعل کا اسم فاعل راھب (ڈرنے والا) قدیم عربی زبان کا لفظ ہے، جو عیسائی عبادت گزاروں کے لیے بولا جاتا تھا، جو حجروں میں مذہبی ریاضت میں مصروف رہتے تھے۔

شکرگزاری:

شکرگزاری اور تقویٰ آیاتِ الٰہی کے جواب میں انسانی رویّے کی دو خصوصی مثالیں ہیں۔ اسلامی اخلاقیات کے نظام میں شکرگزاری کی اہمیت پر ہم اب تک اتنا زور دے چکے ہیں کہ اب اس پہلو پر مزید گفتگو کی ضرورت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انتہائی اہم معنوں میں اسلام میں شکرگزاری ایمان کا دوسرا نام ہے۔ یہ بات سمجھنے کے لیے ہم یاد دلائیں گے کہ باب نہم میں ہم نے کفر کا مطلب اسی شکرگزاری کی نفی بتلایا تھا۔

پہلے تو ہم چند مثالیں دیں گے، کہ قرآنی نقطۂ نظر سے کس طرح ''شکر''، ''کفر'' کی عین ضد ہے۔

قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لِیَبْلُوَنِیْٓ ءَاَشْکُرُ اَمْ اَکْفُرُ ؕ وَمَنْ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ کَرِیْمٌ۔ (النمل: ٤٠)

(حضرت سلیمان نے جب یہ معجزہ دیکھا تو) کہا یہ میرے اللہ کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکرادا کرتا ہوں یا کفرانِ نعمت کرتا ہوں۔ جو بھی شکر ادا کرتا ہے، وہ اپنی ذات کے لیے شکرگزاری کرتا ہے۔ اور جس نے ناشکری کی (تو وہ اپنی ذات کو ہی نقصان پہنچاتا ہے)۔ اللہ تو بے نیاز اور کرم فرما ہے۔

اِنۡ تَكۡفُرُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنۡكُمۡ‌ وَلَا يَرۡضٰى لِعِبَادِهِ
الۡكُفۡرَ‌ وَاِنۡ تَشۡكُرُوۡا يَرۡضَهُ لَكُمۡ‌ (الزمر:۷)

اگر تم ناشکری کرتے ہو تو اللہ تم سے بے نیاز ہے۔
اسے اپنے بندوں میں ناشکری (کفر) بالکل پسند نہیں۔ اگر تم شکر
کرو تو وہ تمہارے لیے اسے پسند کرتا ہے۔

وَاِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّكُمۡ لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ‌ وَلَئِنۡ كَفَرۡتُمۡ
اِنَّ عَذَابِىۡ لَشَدِيۡدٌ۔ (ابراھیم:۷)

اور جب تمہارے رب نے اعلان کیا کہ اگر تم شکر کرو
گے تو میں اور زیادہ دوں گا اور اگر تم ناشکر گزاری کرو گے تو یقیناً
میرا عذاب بہت شدید ہے۔

ذیل کی آیت میں کفر کی جگہ شرک کا لفظ آیا ہے، اور شکر کے بالمقابل استعمال ہوا ہے۔ یاد رہے کفر ناشکری کی بدترین شکل ہے۔

تَدۡعُوۡنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفۡيَةً‌ لَئِنۡ اَنۡجٰنَا مِنۡ هٰذِهٖ لَنَكُوۡنَنَّ
مِنَ الشّٰكِرِيۡنَ۔ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيۡكُمۡ مِّنۡهَا وَمِنۡ كُلِّ كَرۡبٍ ثُمَّ اَنۡتُمۡ
تُشۡرِكُوۡنَ۔ (الانعام:۶۳–۶۴)

تم اسے عاجزی کے ساتھ اور چپکے چپکے یاد کرتے ہو۔
اگر تو ہمیں اس (مصیبت) سے نجات دلا دے تو ہم تیرے
شکرگزار ہوں گے۔ اُن سے کہہ دیجیے کہ یقیناً اللہ تمہیں اس سے
اور ہر مصیبت سے نجات دلائے گا، لیکن تم پھر بھی شرک میں مبتلا
ہو۔

اس سے پہلے ذکر ہو چکا کہ اللہ تعالیٰ اپنی آیات خصوصاً دوزخ اور آگ کے عذاب کے بارے میں نازل کرتا ہے تاکہ ڈر (تخویف) اور وعید سنائے۔ آیاتِ الٰہی کا مقصد انسان کے دل میں گہرے شکر کا احساس بیدار کرنا بھی ہے، یہ بات خصوصاً ان آیات پر صادق آتی ہے جن میں اللہ تعالیٰ کے رحم اور بے حد و حساب کرم کا ذکر

ہے۔ قرآن میں بار بار اللہ کی نعمتوں کا ذکر ہے جو وہ بندوں پر کرتا ہے۔ وہ تمام انعامات کے بدلے میں انسان سے توقع کرتا ہے کہ وہ اس کا تہ دل سے شکر گزار ہو۔

بعض اوقات یہ آیت (نشانی) محض اس ذکر پر مشتمل ہوتی ہے کہ انسان کی تخلیق کتنی شاندار طریقے سے ہوئی۔

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ۔ ثُمَّ سَوّٰهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۔ (السجدہ: ۷-۹)

اس نے انسان کی تخلیق مٹی سے شروع کی اور پھر اس نے انسان کی نسل بے وقعت پانی کے قطرے سے پیدا کی۔ اس نے اسے شکل دی اور اپنی روح اس میں پھونکی اور اس نے تمہارے لیے سننے اور دیکھنے کی صلاحیت پیدا کی، اور دل دیا۔ تم کتنا کم شکر ادا کرتے ہو۔

بعض اوقات یہ آیات دن اور رات کی تبدیلی کا بیان کرتی ہیں۔ (القصص: ۷۳) یا بارش کے بادلوں کا ذکر، جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ مردہ زمین میں جان ڈالتا ہے۔ (الجاثیہ: ۴،۶، ۶۹-۷۰) یا کبھی جانوروں کی نعمت کا حوالہ جن سے انسان کو مالا مال کیا۔ (یٰس: ۱۳) یا پھر اونچے پہاڑوں جیسے جہاز جو سمندروں میں چلتے ہیں۔ اگر اللہ چاہے تو ہواؤں کو روک دے تو پھر یہ جہاز اپنے پیندوں پر بے حرکت کھڑے رہ جائیں۔ (شوریٰ: ۳۳)۔ مختصر یہ کہ ہر اس چیز کا ذکر جو اس دُنیا میں انسانی وجود کی بقا میں حصہ لیتی ہے۔ قرآن بار بار خدائی انعامات کی ان آیات کو بیان کرتا ہے اور بہت کثرت سے یہ بیانات اس شکایت پر ختم ہوتے ہیں کہ انسان بہت ناشکرا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ۔ (یونس: ٦٠)

بے شک، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے، لیکن ان میں سے اکثر شکرادا نہیں کرتے۔

قابلِ غور یہ دلچسپ بات ہے کہ قرآنی تصور میں شکرگزاری اپنی مکمل صورت میں یک طرفہ نہیں، بلکہ دوطرفہ ہے۔ اگر اللہ کے انعامات کی شکرگزاری انسان کا فرض بنتا ہے تو دوسری طرف اللہ سے بھی توقع ہے کہ اس شکرگزاری کے بدلے میں وہ بھی شکر کا اظہار کرے گا۔ اس طرح دونوں جانب سے شکر انسان اور خدا کے درمیان تعلق کی مثالی شکل بنتی ہے۔ مزید برآں، حقیقت یہ ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور صورت ہو بھی نہیں سکتی کیونکہ

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ۔ (الانعام:۵۳)

کیا اللہ تعالیٰ ان کو بہت اچھی طرح نہیں جانتا جو اس کے انعامات پر شکر ادا کرتے ہیں۔

وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ۔ (البقرۃ:۱۵۸)

جو شخص اپنی خوشی سے نیک کام کرتا ہے، یقیناً اللہ اس کا شکرگزار ہے۔ وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا۔ (الاسراء:۱۹)

جو شخص آخرت کی خواہش رکھتا ہے، اور ایمان کی حالت میں اس کے لیے مستقل محنت کرتا ہے، ان کی محنت شکر کے ساتھ قبول کی جائے گی۔

سورہ ٧٦ میں جنت کی ابدی نعمتوں کی تفصیل بیان کرنے کے بعد، یہ اعلان ہوتا ہے کہ یہ اس شاندار انعام کی مستحق مومنوں کی محنت اور کوشش ہے، جسے اللہ تعالیٰ شکر کے ساتھ وصول کرتا ہے۔

اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا۔

(الانسان: ۲۲)

بے شک یہ انعام تمہارے لیے ہے، تمہاری محنت شکریے کے ساتھ قبول کی جاتی ہے۔

حواشی:

(۱) اسلام کے تصور پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو: ''قرآن میں انسان اور خدا'' (باب ہشتم) از: توشی ہیکو ازتسو۔

(۲) اس قسم کی زبان کے بارے میں دلچسپ مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو، ڈونالڈ ایوانس، ''دی لاجک آف سیلف انوالومنٹ''، (لندن، ۱۹۶۳ء)، صفحات ۱۱-۷۸۔

(۳) صحیح بخاری، شرح کرمانی (قاہرہ ۱۹۳۹ء)، ج ا، ص ۱۲۸۔

(۴) ہم نے قبل از اسلام حنفا کی تحریک کے بارے میں جو سوالات اُٹھتے ہیں، ان کا جائزہ اپنی کتاب گاڈ اینڈ مین میں لیا ہے۔

(۵) دیکھیے سورۃ الانبیاء، آیت ۵۰-۵۱ اور سورۃ الانعام، آیت ۷۴۔

(۶) مفسرین میں لفظ امہ کی صحیح تفسیر کے بارے میں جیسا کہ یہاں اس آیت میں استعمال ہوا ہے، بہت اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا مفہوم ''قوم'' یا معاشرہ ہے، لیکن یہ معنی یہاں بہت عجیب لگتے ہیں، اس لیے ہم نے زیادہ قابلِ فہم تعبیر اختیار کی ہے۔

(۷) مخلصین له الدین کی عبارت قرآنِ کریم میں بعض اہم مقامات پر بے حد مختلف معانی میں استعمال ہوئی ہے۔ ہم اسے ''زمانی توحید کا عقیدہ'' سمجھتے ہیں۔ اس تصور کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے، گاڈ اینڈ مین، باب چہارم، فصل دوم۔

(۸) تقویٰ کا لفظ جاہلی شاعری اور قرآن میں جس طرح استعمال ہوا ہے، اس کا تفصیلی لسانیاتی تجزیہ ہم نے اپنی کتاب خدا اور انسان، باب نہم میں کیا ہے۔

(۹) یہاں مصنف نے نبی کریم ﷺ کی حضرت زینبؓ سے شادی کے حوالے سے آیات کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس سے غلط فہمی کا خدشہ تھا، اس لیے ہم نے اسے حذف کر دیا۔ (مترجم)

باب یازدہم

اچھا اور بُرا

قرآنِ کریم میں اچھائی یا برائی کے مجرد تصورات کا خاکہ کسی مکمل نظام کی شکل میں نہیں دیا گیا۔ اس قسم کی ثانوی درجے کی اخلاقی لغات دراصل نزول قرآن کے بعد فقہا کی مرتب کردہ ہے۔ قرآنی ذخیرۂ الفاظ میں بڑی تعداد میں ایسے الفاظ ہیں جن کا ترجمہ ''اچھا'' یا ''برا'' کیا جا سکتا ہے، لیکن ان میں اکثر دراصل بیانیہ یا علامتی الفاظ ہیں۔ اگر ان اصطلاحات کو ''اقدار'' گرداننے کا کوئی جواز ہے تو یہ کہ جب یہ واقعتہً استعمال ہوتی ہیں تو ہمیشہ قدری معنوں میں سامنے آتی ہیں۔ وہ بیانیہ بھی ہیں اور ساتھ ہی اپنے مفہوم میں اقدار کا کام بھی کرتی ہیں۔ بایں ہمہ قرآنِ کریم میں اچھے اور برے کے لیے بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو پہلے اقدار کا مفہوم ادا کرتے ہیں، اور بعد میں صفت کا۔ اس کے علاوہ کچھ ایسے غیرواضح الفاظ بھی ہیں جن کے بارے میں قطعیت کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ بیانیہ ہیں یا قدری۔

جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے باب ششم میں تفصیل سے بتایا تھا کہ اسلام میں اخلاقیات کی اصل مذہب ہے اور یہ اخلاقیات بھی صرف اخروی حوالے سے پروان چڑھی ہیں۔ اخروی حوالہ سے انسان کے انجام کا دارومدار دنیوی زندگی میں اس کے اعمال پر ہے، خاص طور پر اس بات پر کہ آیا اس کے اعمال سے اسلام کا نصب العین فروغ پاتا ہے یا اس میں رکاوٹ پیش آتی ہے۔ قرآنی نقطۂ نظر میں اچھے اور برے کی خاص نوعیت اسی حوالے سے تشکیل پاتی ہے۔

اسلام میں اخلاقی اچھائی کے تصور کی مذہبی نوعیت کی لفظ صالح سے بہتر مثال نہیں ہوسکتی۔ مذہبی اخلاقیات کے کمال کے بارے میں قرآنِ کریم میں جو الفاظ کثرت

سے استعمال ہوئے ہیں، یہ لفظ ان میں ایک ہے۔

صالح:

لفظ ''صالح'' کا ترجمہ عام طور پر ''نیک'' کیا جاتا ہے، جب کہ اس کا ترجمہ ''اچھا'' بھی ہوسکتا ہے۔ تاہم یہ بحث ثانوی ہے کہ ترجمہ ''نیک'' صحیح ہے یا غلط۔ اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ قرآنی سیاق میں اس لفظ کے حقیقی بیانیہ عنصر کو الگ کر کے دیکھنا ضروری ہے۔

سب سے پہلے تو یہ وضاحت ضروری ہے کہ ''ایمان'' اور ''صالح'' کے الفاظ کے درمیان بہت مضبوط اور اٹوٹ معنویاتی رشتہ ہے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے سایہ وجود سے جدا نہیں ہوسکتا۔ جہاں ایمان ہے، وہیں ''صالحات'' یعنی نیک اعمال، حتیٰ کہ یہ کہنا بلا جواز نہیں کہ ایمان کی صحیح تعریف ''صالحات'' کے بغیر اور ''صالحات'' کی تعریف ''ایمان'' کے بغیر نہیں کی جا سکتی۔ مختصراً یوں کہیے کہ ''صالحات'' ظاہری اعمال کی شکل میں ایمان کا مکمل اظہار ہیں۔ چنانچہ یہیں سے یہ عبارت تشکیل پاتی ہے: ''اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ'' (جو لوگ ایمان لائے اور صالحات یعنی نیک اعمال کیے)۔ قرآنِ کریم میں یہ جملہ سب سے زیادہ استعمال ہونے والی عبارت ہے۔ جو لوگ ایمان لائے وہ اس وقت تک مومن نہیں کہلاتے، جب تک ان کے اندرونی یقین اور ایمان کا اظہار ایسے اعمال کی صورت میں سامنے نہیں آتا، جن کو صالح کہا جا سکے۔

> وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ۔ (البقرۃ:۸۲)
>
> اور جو ایمان لائیں اور نیک کام کریں، وہ جنت کے مالک ہوں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ قرآنی تعلیمات میں ''ایمان'' اور ''عملِ صالح'' کے درمیان یہ مضبوط رشتہ بعد میں علم الکلام کا بنیادی مسئلہ بن گیا۔ کیونکہ ''جو

لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے'' کی دو بالکل متضاد تعبیرات ممکن ہیں۔ ایک طرف تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں عناصر یعنی ایمان اور عملِ صالح ایک دوسرے سے اس طرح پیوستہ ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور نہیں کیا جا سکتا، گویا ''ایمان'' اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ نیک عمل موجود نہ ہو۔ بعینہٖ یہی خوارج کا عقیدہ تھا۔

دوسری جانب یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآنِ کریم نے چونکہ ''ایمان'' اور ''صالحات'' کو دو مختلف مستقل تصورات کے طور پر ذکر کیا ہے، اس لئے یہ اس بات کی ناقابلِ تردید دلیل ہے کہ دونوں الگ چیزیں ہیں، اس نقطۂ نظر کے مطابق جو مرجئہ کا عقیدہ تھا، ایمان ایک مستقل بالذات عنصر ہے جو اپنے مکمل ہونے کے لیے کسی اور چیز کا محتاج نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر دونوں تصورات ایک دوسرے سے اس طرح پیوستہ ہیں کہ گویا ناقابلِ تقسیم اکائی ہیں، تو پھر سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو الگ عناصر کے طور پر کیوں بیان فرمایا۔ بہرکیف یہ مسئلہ نہ تو قرآن کا موضوع ہے اور نہ ہمارا۔ ہم قرآن حکیم کی طرف واپس آتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ''نیک اعمال'' سے کون سے عمل مراد ہیں۔ مذکورہ آیت کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اچھے اعمال سے مراد نیکی یا پارسائی کے ایسے کام ہیں، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا ہے۔ درحقیقت آیت نمبر ۸۳ میں، جو اوپر والی آیت کے فوراً بعد آئی ہے اور بنی اسرائیل کے ساتھ اللہ کے میثاق کا ذکر کرتی ہے، صالح اعمال کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں صالحات کی جو فہرست دی گئی ہے اس میں مندرجہ ذیل پانچ چیزوں کا ذکر ہے: (۱) صرف خدا کی عبادت، (۲) والدین، رشتہ داروں، یتیموں اور ضرورت مندوں سے اچھائی (نرم دلی، صلہ رحمی اور احسان) کا سلوک، (۳) ہر شخص سے نرمی سے بولنا، (۴) نماز، (۵) زکوٰۃ۔

مندرجہ ذیل دو آیات میں سے ایک میں خالص توحید کو ''نیک اعمال'' کا حصہ بتایا گیا ہے، جبکہ دوسری آیت میں مذکورہ بالا عناصر میں سے آخری دو یعنی نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۔ (الکھف:۱۱۰)

کہہ دو کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں (البتہ) میری طرف وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود (وہی) ایک معبود ہے تو جو شخص اپنے پروردگار سے ملنے کی اُمید رکھے، اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (البقرۃ:۲۷۷)

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہے، اُن کو ان کے کاموں کا صلہ خدا کے ہاں ملے گا اور قیامت کے دن اُن کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

اگلی آیت میں اُس تکبر اور سرکشی کے رویئے کا ذکر ہے جو حضرت نوحؑ کے بیٹے نے احکامِ خداوندی کے خلاف اختیار کیا۔ آیت میں اسے غیر صالح عمل قرار دیا گیا ہے۔

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۠ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ (ھود:۴۶)

خدا نے فرمایا: اے نوحؑ وہ تیرے گھر والوں میں نہیں ہے، وہ تو ناشائستہ افعال کرتا ہے۔ تو جس چیز کی تم کو حقیقت معلوم نہیں، اس کے بارے میں مجھ سے سوال ہی نہ کرو۔

لفظ صالح انسانی کردار کی صفت بیان نہیں کرتا، بلکہ اکثر اوقات انسان کی ایک خاص نوع کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ اس موضوع پر چند مثالوں کا تجزیہ کیا جائے

تو اس اصطلاح کے معنوی عناصر کی مزید صراحت ہوتی ہے۔ ہم اس کا آغاز قرآنِ کریم کی ان آیات سے کرتے ہیں، جہاں صالح آدمی کی لفظی تعریف ملتی ہے۔

مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ۔ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ (آلِ عمران:۱۱۳-۱۱۴)

ان اہلِ کتاب میں کچھ لوگ (حکمِ خدا پر) قائم ہیں۔ جو رات کے وقت خدا کی آیتیں پڑھتے اور اس کے آگے سجدے کرتے ہیں۔ (اور) روزِ آخرت پر ایمان رکھتے اور اچھے کام کرنے کو کہتے اور بُری باتوں سے منع کرتے اور نیکیوں پر لپکتے ہیں۔ یہی لوگ نیکوکار (صالح) ہیں۔[1]

ذیل کی آیت میں بھی اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ خیرات بھی ایک ایسا عمل ہے جو صالح آدمی کے خصائص میں سے کم از کم ایک صفت کو بیان کرتا ہے۔

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَا اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ (المنٰفقون:۱۰)

اور جو (مال) ہم نے تم کو دیا ہے، اس میں سے اُس (وقت) سے پیشتر خرچ کر لو کہ تم میں سے کسی کو موت آ جائے تو (اس وقت) کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار! تُو نے مجھے تھوڑی سی اور مہلت کیوں نہ دی تا کہ میں خیرات کر لیتا اور نیک لوگوں میں داخل ہو جاتا۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو صالحین میں شمار کیا گیا ہے۔ ''وہ اپنے پالنے میں لوگوں سے گفتگو کرے گا اور وہ صالحین میں سے ہوگا۔'' (آلِ عمران:۴۶)

اسی سورت میں چند آیات پہلے حضرت یحییٰؑ کو بھی صالحین میں سے ایک نبی بتایا گیا ہے۔ (آیت نمبر ۳۹)

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات مومنین کو بہت مخصوص انداز میں اللہ کے صالح بندے بتایا جاتا ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ۔ (الانبیاء:۱۰۵)

اور ہم نے زبور میں لکھ دیا تھا کہ میرے نیکوکار بندے ملک کے وارث ہوں گے۔

وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ۔ (النمل:۱۹)

اور (حضرت سلیمانؑ) کہنے لگے کہ اے پروردگار! مجھے توفیق عنایت کر کہ جو احسان تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیے ہیں، ان کا شکر کروں اور ایسے نیک کام کروں کہ تو ان سے خوش ہو جائے اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔

قرآنِ کریم میں صالحات کے مقابل اور متضاد کے طور پر ''سیئات'' کا لفظ ہے، جس کا مادہ س و ء ہے۔ اس مادے کے بارے میں آئندہ گفتگو ہوگی۔ یہاں چند آیات کا ذکر کافی ہوگا، جن میں لفظ صالح کے مقابل میں سُوء یا اس کے مشتق الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ پہلی آیت میں بار بار استعمال ہونے والا جملہ یعنی جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، اس کے مقابلے میں اسی طرح کا ایک جملہ آتا ہے، وہ جنھوں نے برائیاں کیں۔ واضح طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اگر صالحات کا مطلب نیک اعمال ہیں تو سیئات کا مطلب بُرے اعمال ہیں۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ

كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَاءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ، سَاءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۔ (الجاثیہ: ۲۱)

جو لوگ بُرے کام کرتے ہیں، کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ان کی زندگی اور موت یکساں ہوگی۔ یہ جو دعوے کرتے ہیں، برے ہیں۔

اگلی آیات میں صالح سیئہ کی ضد کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ (المؤمن: ۴۰)

جو برے کام کرے گا، اس کو بدلہ بھی ویسا ملے گا اور جو نیک کام کرے گا، مرد ہو یا عورت اور وہ صاحب ایمان بھی ہوگا، تو ایسے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے۔ وہاں ان کو بے شمار رزق ملے گا۔

"سیئہ"، "سیئ" (اسمِ صفت) کا اسم ہے۔ ذیل میں ایک مثال دی جاتی ہے، جس میں یہ اسمِ صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے اور اس کا موصوف عمل ہے، جو محذوف ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ اصطلاح عملِ صالح کے مقابلے میں استعمال ہوئی ہے۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ، سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا، عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (التوبہ: ۱۰۱-۱۰۲)

اور تمہارے گردونواح کے بعض دیہاتی منافق ہیں اور

بعض شہر والے بھی نفاق پر اڑے ہوئے ہیں۔ تم انہیں نہیں جانتے، ہم جانتے ہیں۔ ہم ان کو دُہرا عذاب دیں گے۔ پھر وہ بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے اور کچھ اور لوگ ہیں کہ اپنے گناہوں کا (صاف) اقرار کرتے ہیں۔ اُنہوں نے اچھے اور برے عملوں کو ملا جلا لیا تھا۔ قریب ہے کہ خدا اُن پر مہربانی سے توجہ فرمائے، بے شک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

سُوء اسی مادے کا ایک اور اسم ہے۔ یہ لفظ بھی صالح کے متضاد کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اور اس طرح اس کے وہی معنی ہیں جو سیئہ کے ہیں۔ ذیل کی آیت کا مندرجہ بالا آیت سے موازنہ کرتے ہوئے آپ دیکھیں گے کہ دونوں آیتوں کا عمومی سیاق ایک ہی ہے۔

مَنْ يَّعْمَلْ سُوْءًا يُّجْزَ بِهٖ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا۔ (النساء: ۱۲۳-۱۲۴)

جو شخص برے عمل کرے گا، اسے اسی (طرح) کا بدلہ دیا جائے گا اور وہ خدا کے سوا کسی کو حمایتی پائے گا نہ مددگار۔ اور جو نیک کام کرے گا، مرد ہو یا عورت اور وہ صاحبِ ایمان بھی ہوگا تو ایسے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے اور ان سے تل برابر بھی حق تلفی نہ کی جائے گی۔

تاہم سوء، سیئہ کا صحیح متضاد ''صالح'' نہیں ہے، بلکہ ایک اور لفظ ''حسن'' ہے۔ سوء کی معنویاتی ساخت کا ذکر ایک مرتبہ پھر آئے گا، جب حسن کی بحث ہوگی۔

بِرّ

اگرچہ شکل میں اور صیغے میں مختلف ہے، لیکن لفظ بِرّ معنی کے اعتبار سے صالح

کے قریب ہے۔ برّ ایسا لفظ ہے جو قرآنِ کریم میں استعمال ہونے والی اخلاقی اصطلاحات میں سب سے مشکل لفظ ہے۔

بہرکیف، اس لفظ کے بنیادی معنویاتی ڈھانچے کے بارے میں کچھ سراغ یوں لگ سکتا ہے کہ اس کا لفظ صالح سے جس کا اوپر ذکر ہو چکا، موازنہ کیا جائے۔ ص ل ح کے مادے کے معنویاتی ڈھانچے میں اُن عناصر کو بہت ہی بنیادی اہمیت حاصل ہے جن کا رابطہ انسانی تعلقات میں انصاف اور محبت کے جذبے کے ساتھ ہے۔ حتیٰ کہ اللہ کی عبادت کے فعل اور ناداروں کو کھانا کھلانے کو ایک ہی درجہ دیا گیا ہے۔

اگر ہم غور کریں تو اس میں کسی تعجب کی ضرورت نہیں کیونکہ مجموعی طور پر قرآنِ کریم میں انسانی معاشرتی زندگی میں عدل اور محبت کو بہت نمایاں طور پر اہمیت دی گئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں تقویٰ یا نیکی اس وقت تک نیکی نہیں کہلا سکتی جب تک اس سے ایسے افعال کا ظہور نہ ہو جن میں دوسروں کے ساتھ عدل اور محبت کے برتاؤ کا جذبہ کارفرما نہ ہو۔

برّ اسی نکتے کی مزید تائید فراہم کرتا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی انتہائی اہم آیت جس کا ہم پہلے بھی کئی مرتبہ ذکر کر چکے ہیں، کم از کم قرآنی تعلیمات کے عمومی تناظر میں اس لفظ کی سیاقی تعریف بیان کرتی ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَ فِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔ (البقرۃ:۱۷۷)

نیکی یہ نہیں کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر لو۔
بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ خدا پر اور فرشتوں پر اور (خدا کی) کتاب

پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ
داروں، یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں
اور گردنوں (کے چھڑانے) میں (خرچ کریں) اور نماز پڑھیں
اور زکوٰۃ دیں اور جب عہد کر لیں تو اس کو پورا کریں اور سختی اور
تکلیف میں اور (معرکہ) کار زار کے وقت ثابت قدم رہیں۔
یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی خدا سے ڈرنے والے ہیں۔

صحیح نیکی (برّ) کے عمل کے عناصرِ ترکیبی پر جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ان پر ایک نظر سے ہی یہ سمجھ میں آ جاتا ہے کہ ان میں صالحات یا صحیح ایمان کے معانی میں واقعتہً کوئی فرق نہیں۔

ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس لفظ کا ترجمہ مختلف زبانوں میں مختلف کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ تقویٰ بھی کیا جا سکتا ہے، نیکی اور مہربانی بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس میں سے کوئی ترجمہ اپنے طور پر لفظ کے اصلی معنی کا حق ادا نہیں کر سکتا، کیونکہ اس میں ان کے علاوہ اور دوسرے معنی بھی شامل ہیں۔ قرآنِ کریم سے جو مزید مثالیں پیش کی جا رہی ہیں، اُن سے بِرّ کے پیچیدہ معانی کے صرف چند پہلو سامنے آتے ہیں۔

بِرّ اور تقویٰ

اوپر جس آیت کا ذکر ہوا، اس میں بِرّ کا خوفِ خدا (تقویٰ) کے ساتھ تعلق بہت واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ کیونکہ اس میں تاکیداً کہا گیا ہے کہ صرف وہ لوگ جو اپنے تمام سماجی اور دینی فرائض جو برّ کے تحت آتے ہیں، بجا لاتے ہیں، مخلص یا سچے (الذین صدقوا) مومن یا سچے متقی کہلانے کے حقدار ہیں۔

اسی طرح یہ آیت یہ بھی بتاتی ہے کہ سچی نیکی بے معنی رسومات پر اصرار کا نام نہیں ہے، بلکہ اللہ سے ڈرنے کا نام ہے۔

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ
مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا۔ (البقرۃ:۱۸۹)

نیکی اس بات میں نہیں کہ (احرام کی حالت میں)
گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے آؤ۔(۲) بلکہ نیکوکار وہ ہے جو
پرہیزگار ہو۔ گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ۔

بِرّ اور خیرات:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا
مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ۔ (آلِ عمران:۹۲)

جب تک تم ان چیزوں میں سے جو تمہیں عزیز ہیں
(راہِ خدا میں) صرف نہ کرو گے، کبھی نیکی حاصل نہ کر سکو گے اور
جو چیز تم صرف کرو گے، خدا اس کو جانتا ہے۔

شاید مندرجہ ذیل آیت میں برّ خیرات کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ
تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (البقرة:٤٤)

(یہ) کیا (عقل کی بات ہے کہ) تم لوگوں کو نیکی
کرنے کو کہتے ہو، اور اپنے تئیں فراموش کیے دیتے ہو، حالانکہ تم
کتاب (خدا) بھی پڑھتے ہو۔ کیا تم سمجھتے نہیں؟

بِرّ اور والدین سے حسنِ سلوک:

وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا وَبَرًّا
بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا۔ (مریم:۳۱-۳۲)

اور جب تک زندہ ہوں مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا ارشاد
فرمایا ہے اور مجھے اپنی ماں کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا (بتایا
ہے) اور سرکش اور بدبخت نہیں بنایا۔

بِرّ اور انصاف:

لَا یَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ

يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔ (الممتحنة:۸)

جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور تم کو گھروں سے نہیں نکالا، ان کے ساتھ بھلائی اور انصاف کا سلوک کرنے سے خدا تم کو منع نہیں کرتا۔ خدا تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ قسط (انصاف) برّ کے قریب قریب، ہم معنی استعمال ہوا ہے۔ لیکن جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ برّ ایسے تمام افعال کے لیے ایک جامع لفظ ہے، جو محبت اور نیکی کے جذبے سے اور خوف کے مذہبی داعیے کے زیر اثر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں قسط کا مفہوم بہت محدود ہے۔ یہ عام طور پر باہمی معاملات میں انصاف یا غیر جانبداری کے قانونی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر یہ لفظ کسی مقدمے کے فیصلہ کے لیے بولا جاتا ہے۔

فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْئًا وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔ (المائدہ:۴۲)

اگر یہ (یہود جو اسلام دشمن تھے) تمہارے (حضرت محمد ﷺ کے) پاس (کوئی مقدمہ فیصل کرانے کو) آئیں تو تم ان میں فیصلہ کر دینا یا اعراض کرنا اور اگر ان سے اعراض کرو گے تو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ اور اگر فیصلہ کرنا چاہو تو انصاف کا فیصلہ کرنا کہ خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ، فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ (یونس:۴۷)

ہر ایک امت کی طرف پیغمبرؑ بھیجا گیا۔ جب ان کا پیغمبرؑ آتا ہے تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے

اور ان پر کچھ ظلم نہیں کیا جاتا۔

یہ بات غور طلب ہے کہ ''قسط اور انصاف کے ساتھ فیصلہ'' کے مقابلے میں ''ظلم برداشت نہ کرنا'' مساوی مفہوم میں بیان ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس سیاق وسباق میں قسط واضح طور پر ظلم کے متضاد ہے۔ یہ ایسا نکتہ ہے جو ہمیں قسط اور ظلم دونوں کے معنی سمجھنے میں بہتر مدد دے سکتا ہے۔

توقع کے عین مطابق قرآنِ کریم کے نقطۂ نظر سے انصاف کا حتمی پیمانہ مشیتِ ایزدی کا فراہم کردہ ہے۔ مختصر لفظوں میں قسط کی حتمی بنیاد وحی ہے۔ یہ نکتہ ذیل کی آیات سے بہت واضح طور پر سامنے آتا ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ، وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (المائدہ: ۴۴–۴۵)

اور جو خدا کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی کافر ہیں اور ہم نے ان کے لیے (تورات میں) یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور سب زخموں کا اسی طرح بدلہ ہے۔ لیکن جو شخص بدلہ معاف کر دے، وہ اس کے لیے کفارہ ہوگا اور جو خدا کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ بے انصاف ہیں۔

یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ بہت سے مقامات پر قسط مساوات اور عدل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کی ایک نمائندہ مثال گواہی کی ہے۔ گواہ پر لازم ہے کہ وہ مکمل طور پر غیر جانبدار ہو اور اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کی وجہ سے کسی طرف نہ جھکے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ (المائدہ:۸)

اے ایمان والو! خدا کے لیے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جایا کرو اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف کو چھوڑ دو، انصاف کیا کرو کہ یہی چیز پرہیزگاری کی بات ہے۔ اور خدا سے ڈرتے رہو، کچھ شک نہیں کہ خدا تمہارے سب اعمال سے خبردار ہے۔

''انصاف کے ساتھ'' کے صحیح معنی مندرجہ ذیل آیات سے مزید واضح ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر پہلی آیت اس ضمن میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا۔ (النساء:۱۳۵)

اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو اور خدا کے لیے سچی گواہی دو، خواہ (اس میں) تمہارا یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو۔ اگر کوئی امیر ہے یا فقیر تو خدا ان کا خیرخواہ ہے۔

ذیل کی آیت میں قرض کے معاملے کا قانونی طریقہ بیان کیا گیا ہے:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ، وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ--- وَلَا تَسْاَمُوْا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰى اَجَلِهٖ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ۔ (البقرة:۲۸۲)

مومنو! جب تم آپس میں کسی میعادِ مُعیّن کے لیے قرض کا معاملہ کرنے لگو تو اس کو لکھ لیا کرو اور لکھنے والا تم میں (کسی کا

نقصان نہ کرے بلکہ) انصاف سے لکھے--- اور قرض تھوڑا ہو یا بہت، اس کے لکھنے لکھانے میں کاہلی نہ کرنا۔ یہ بات خدا کے نزدیک قرینِ قیاس ہے۔

یہ لفظ تجارت میں معاہدے اور معیارات کے حوالے سے بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں پورا تولنے اور پورا ناپنے کا بار بار حکم دیا گیا ہے۔ ذیل کی مثال اس کے لیے کافی ہے۔

وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ، وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۔

(ھود:۸۵)

اور اے قوم! ناپ اور تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو اور زمین میں خرابی کرتے نہ پھرو۔

عربی زبان میں ایک اور لفظ بھی ہے جو ناپ تول میں بے انصافی کے مخصوص مفہوم میں قسط کے متضاد کے طور پر تقریباً اصطلاحی معنی رکھتا ہے۔ یہ لفظ ہے "طفف" جس کے لفظی معنی ہیں، کم تولنا یا کم ناپنا۔ یہ لفظ قرآنِ کریم میں بہت ہی اہم مقام پر استعمال ہوا ہے، جہاں سیاق و سباق سے اس لفظ کی لفظی تعریف بھی مل سکتی ہے۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ۔

(المطففین:۱-۳)

ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے لیے خرابی ہے، جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا کر لیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم کر دیں۔ (۳)

اوپر سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۸۲ کے حوالے سے ہم "قسط" کے ہم معنی لفظ "عدل" کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں ہم ان دونوں لفظوں کے درمیان قریبی تعلق کے

ثبوت کے لیے دو اور مثالیں دے رہے ہیں۔ پہلی آیت میں قسط کا لفظ پہلے حصے میں جن معنوں میں آیا ہے دوسرے حصے میں اس کے لئے عدل کا لفظ استعمال ہوا ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَلَّا تَعُوْلُوْا۔ (النساء:۳)

اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو (ان کے سوا) جو عورتیں تم کو پسند ہوں، دو دو یا تین تین یا چار چار، اُن سے نکاح کر لو۔ اور اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ (سب عورتوں سے) یکساں سلوک نہ کر سکو گے تو ایک عورت (کافی ہے) یا لونڈی، جس کے تم مالک ہو۔ اس سے تم بے انصافی سے بچ جاؤ گے۔

وَاِنْ طَائِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔ (الحجرات:۹)

اور اگر مومنوں میں سے کوئی دو فریق آپس میں لڑ پڑیں اور اگر ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرے، پس جب وہ رجوع کرے، تو دونوں فریق میں مساوات کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف سے کام لو کہ خدا انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

ذیل کی آیت خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں عدل کے مفہوم کا مرکزی نقطہ واضح کرنے کے لیے اس کا مقابل "میل" یعنی جانبداری یا پسند سے کیا گیا ہے کہ

عدل اپنے معنوں میں میل یعنی جانبداری کے بالمقابل استعمال ہوا ہے۔

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ
فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ۔ (النساء:۱۲۹)

اور تم خواہ کتنا ہی چاہو عورتوں میں ہرگز برابری نہ کر
سکو گے تو ایسا بھی نہ کرنا کہ ایک ہی طرف ڈھل جاؤ اور دوسری کو
(ایسی حالت) میں چھوڑ دو کہ گویا اُدھر میں لٹک رہی ہو۔

فساد:

لفظ ''فساد'' (یا اس کا صیغہ فعل افسد) بہت جامع لفظ ہے۔ اس لفظ کے استعمال کے غیر مذہبی سیاق کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ہر قسم کی برائی کے لیے بولا جاتا ہے۔ خود قرآن کے اندر بھی اس لفظ کے غیر مذہبی استعمال کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً سورۂ یوسف میں چوری کو اسی لفظ سے بیان کیا گیا ہے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ
وَمَا كُنَّا سَارِقِيْنَ۔ (یوسف:۷۳)

وہ کہنے لگے کہ خدا کی قسم! تم کو معلوم ہے کہ ہم (اس)
ملک میں اس لیے نہیں آئے کہ خرابی کریں اور نہ ہم چوری کیا
کرتے ہیں۔

یہ بات حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کہی ہے جن پر عزیزِ مصر کا پیالہ چرانے کا الزام لگا ہے۔ مندرجہ ذیل آیت میں بھی یہ لفظ غارت گری کے ان افعال کے لیے استعمال ہوا ہے، جو یاجوج ماجوج نے روئے زمین پر برپا کیے تھے۔

قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ
فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا
وَبَيْنَهُمْ سَدًّا۔ (الکھف:۹۴)

ان لوگوں نے کہا کہ ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج

زمین میں فساد کرتے رہتے ہیں۔ بھلا ہم آپ کے لیے خرچ (کا انتظام) کر دیں کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار کھینچ دیں۔

ایک اور آیت میں جسے قرآنِ کریم کے نقطۂ نظر سے ''مذہبی'' سیاق سمجھنا چاہیے، یہی لفظ قومِ لوط کی قبیح عادت کے لیے استعمال ہوا ہے، جس کے لیے سدوم بدنام تھا:

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ۔ (العنکبوت:۲۸-۳۰)

اور لوطؑ (کو یاد کرو) جب اُنھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم (عجب) بے حیائی[۴] کے مرتکب ہوتے ہو۔ تم سے پہلے اہلِ عالم میں سے کسی نے ایسا کام نہیں کیا۔ کیا تم (لذت کے ارادے سے) لونڈوں کی طرف مائل ہوتے اور (مسافروں کی) رہزنی کرتے ہو۔ اپنی مجلسوں میں ناپسندیدہ کام کرتے ہو۔[۵] تو ان کی قوم کے لوگ جواب میں بولے تو یہ بولے کہ اگر تم سچے ہو تو ہم پر عذاب لے آؤ۔ (لوطؑ نے) کہا، اے میرے پروردگار! ان مفسدوں کے مقابلے میں مجھے نصرت عنایت فرما۔

یہی لفظ فرعون کے کردار کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جو بلا جواز بنی اسرائیل پر ظلم ڈھا رہا تھا۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ اِنَّهٗ

كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ۔ (القصص:٤)

فرعون نے ملک میں سر اُٹھا رکھا تھا۔ وہاں کے باشندوں کو گروہ گروہ بنا رکھا تھا۔ ان میں سے ایک گروہ کو (یہاں تک) کمزور کر دیا تھا کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتا۔ بے شک وہ مفسدوں میں سے تھا۔

ایک اور آیت میں یہ لفظ مصر کے ان جادوگروں کے لیے استعمال ہوا ہے، جو فرعون کے دربار سے وابستہ تھے۔ یہاں سیاق کلام میں وہ مشہور واقعہ ہے، جس میں فرعون کے دربار میں جادو کا مقابلہ ہوا۔

قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَايُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ۔ (یونس:٨١)

حضرت موسیٰؑ نے کہا جو چیزیں تم بنا کر لائے ہو، جادو ہے۔ خدا اس کو ابھی نیست و نابود کر دے گا۔ خدا شریروں کے کام سنوارا نہیں کرتا۔

خاص مذہبی سیاق میں اکثر یہ لفظ کفر کے محدود معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں ہم چند مخصوص مثالیں پیش کرتے ہیں، جن میں سے پہلی مثال میں مفسد سے مراد کافر ہیں، خصوصاً تکذیب دین کے حوالے سے۔ یہ بات آیت کے عمومی سیاق و سباق سے واضح ہو جاتی ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ۔ (یونس:٤٠)

اور ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں کہ اس پر ایمان لے آئے ہیں، اور کچھ ایسے ہیں کہ ایمان نہیں لائے۔ اور تمہارا پروردگار شریروں سے خوب واقف ہے۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ۔ (النحل:٨٨)

جن لوگوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) خدا کے رستے
سے روکا، ہم ان کو عذاب پر عذاب دیں گے، اس لیے کہ وہ
شرارت کیا کرتے تھے۔

وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ، وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ فَاِنْ
تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ بِالْمُفْسِدِیْنَ۔ (آلِ عمران:۶۳)

اور خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک خدا غالب
اور صاحبِ حکمت ہے تو اگر یہ لوگ پھر جائیں تو خدا مفسدوں کو
خوب جانتا ہے۔

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ یہی لفظ ایک آیت میں کافروں کے نقطۂ نظر سے توحید پرستوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ اس سیاق میں توحید کی تحریک پھیلنے سے روایتی بت پرستانہ رواج کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا، اسے ''زمین میں فساد'' کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے:

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰی وَقَوْمَهٗ
لِیُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَیَذَرَكَ وَ آلِهَتَكَ۔ (الاعراف: ۱۲۷)

اور قوم فرعون کے جو سردار تھے، کہنے لگے کیا آپ
موسیٰؑ اور اس کی قوم کو چھوڑ دیں گے کہ ملک میں خرابی کریں اور
آپ سے اور آپ کے معبودوں سے دست کش ہو جائیں۔

معروف اور منکر

معروف:

عربی زبان میں بہت سے الفاظ ہیں جو ''اچھا'' کے ہم معنی یا اس کے قریب قریب ہیں۔ ان میں معروف کا ایک خاص مقام ہے کیونکہ یہ ایک ایسی فکر کا نمائندہ معلوم ہوتا ہے جو ماضی بعید سے تعلق رکھتی ہے۔ متاخر مفسرین عموماً معروف کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ جسے شریعت نے جائز قرار دیا ہو۔(۶) لیکن ظاہر ہے کہ یہ تفسیر اس

صورتِ حال کی غمازی کرتی ہے جو اسلام کے کلاسیکی عہد (دوسری اور تیسری صدی ہجری) سے مخصوص ہے۔ یہ لفظ کی اصل خصوصیات کو ظاہر کرنے کے بجائے مخفی رکھتی ہے۔''معروف'' کا تصور ''شرع'' کے مفہوم سے بہت پہلے کا ہے۔

معروف کا تصور قبائلی اخلاقیات جن کا جاہلیہ سے خصوصی تعلق تھا، مربوط ہے۔ روبن لیوی نے بہت صحیح کہا ہے کہ یہ لفظ اور اس کا متضاد لفظ ''منکر'' قرآنِ کریم میں نیکی (اور برائی) کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآنِ حکیم نے قبائلی اخلاقیات کی اصطلاحوں کو اپنا کر اُنہیں نئے اخلاقی نظام کا لازمی حصہ بنا دیا تھا۔ (۷)

معروف کا لغوی معنی ہے: ''جانا ہوا''، یعنی جانی پہچانی ہوئی چیز جو سماجی طور پر بھی قابلِ قبول ہو۔ اس کا متضاد لفظ ''منکر'' بعینہٖ اس لیے ناقابلِ قبول اور مذموم ہے کہ وہ ''جانی پہچانی'' نہیں ہے، خارجی اور بیرونی ہے۔ قبائلی معاشرے جن کی تہذیبی صورتِ حال زمانۂ جاہلیت کے عرب قبائل سے ملتی جلتی ہو، وہ عربوں ہی کی طرح معلوم اور مانوس چیزوں کو اچھی اور اجنبی چیزوں کو بری سمجھتے ہیں۔

ہم یہاں جاہلی زمانہ کے ایک شاعر مسافع العبسی کا ایک شعر پیش کرتے ہیں جو قبیلہ بنو عمرو کا مرثیہ کہتے ہوئے انہیں قابلِ تقلید لوگ بتاتا ہے:

اولاك بنو خير و شر كليهما
جميعا و معروف بها ومنكر (۸)

''یہ وہ لوگ تھے، جو ایک ہی وقت میں اچھے (دوستوں کے لیے)، اور برے (دشمنوں کے لیے) دونوں تھے۔ وہ (دوستوں کے لیے) معروف کا سبب اور (دشمنوں کے لیے) منکر کا سبب تھے۔''

لیکن لفظ ''معروف'' کا مصدر کچھ بھی ہو، قرآنِ کریم میں درحقیقت اور بھی محدود معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ بہتر ہوگا کہ پہلے ہم ایک آیت کا جائزہ لیں تاکہ ہمیں یہ پتہ چل سکے کہ قرآن نے اس لفظ کو کن معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس آیت کے ذریعے حضرت محمد ﷺ کی ازواجِ مطہراتؓ کو تنبیہ کے طور پر کہا گیا ہے:

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔ (الاحزاب:۳۲)

اے نبیؐ کی بیویو! تم عام لوگوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم اللہ سے ڈرو تو تم (اپنے خاوند کے علاوہ دوسرے مردوں سے) بولنے میں نزاکت مت کرو۔ مبادا ایسے شخص کو جس کے دل میں خرابی ہے، خواہش پیدا ہو۔ ان سے معروف الفاظ میں بات کرو۔

سیاق سے واضح ہے کہ ''معروف الفاظ'' کا مطلب ایسا طرزِ کلام ہے جو حقیقتاً ایک نبی کی بیوی کے شایانِ شان ہو۔ یعنی ایسا طرزِ کلام جو اتنا عزت مندانہ اور پُروقار ہو کہ کسی طرح بھی ایسے لوگوں کے جن کے دلوں میں مرض ہے (یعنی جو شہوانی خواہشات کے اسیر ہیں)، سفلی جذبات اُبھرنے کا موقع نہ دیں۔

ذیل کی آیت سے معروف کے معنویاتی عناصر پر مزید روشنی پڑتی ہے، کیونکہ یہاں ان کا موازنہ ایسے طرزِ عمل سے کیا گیا ہے جسے معروف نہیں کہا جا سکتا۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ۔ (البقرۃ:۲۳۱)

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو تو جب وہ مقررہ مدت گزار لیں تو یا تو معروف طریقے سے اُنہیں روک لو یا معروف طریقے سے چھوڑ دو۔ ان کو تکلیف پہنچانے کی نیت سے نہ روکو۔ جس نے ایسا کیا، وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔

''مطلقہ عورتوں کو معروف طریقے سے روکنا'' کے بالمقابل ''اُنہیں مجبور کر کے رکھنا'' بیان کیا گیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ معروف سے مراد گویا ''صحیح طریقہ'' ہے اور یہاں صحیح کا مطلب جاہلی طرزِ معاشرت کے ضمن میں صرف یہ ہے کہ جو روایتی طور

پر معلوم اور پسندیدہ ہو۔ تاہم قرآنی مفہوم میں ''صحیح'' کا مصدر روایت (قبائلی) نہیں بلکہ مشیتِ الٰہی ہے۔ یہ مفہوم اس بات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اس آیت میں ''معروف طریقے سے پیش نہ آنے کو'' ''ظلم، عدوان'' اور ''اپنے ہی ساتھ زیادتی'' بتایا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، یہ وہ عبارات ہیں جو عام طور پر کافروں کے طرزِ عمل بیان کرتے وقت استعمال ہوتی ہیں۔

یاد رہے کہ ہم نے ابھی جس آیت کا حوالہ دیا وہ مطلقہ بیوی کے بارے میں قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔ لفظ معروف کی یہ ایک اور خاصیت ہے کہ قرآنی آیات احکام میں بہت ہی مناسب مواقع پر استعمال ہوا ہے۔ خصوصاً جہاں خاندانی تعلقات میں، خاوند اور بیوی اور والدین اور اولاد یا قریبی رشتے داروں کے درمیان اخلاقی فرائض کا مسئلہ ہو۔ سورۃ البقرۃ کی مندرجہ ذیل آیت اسی بات کی ایک اور مثال ہے:

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ
اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ۔

(البقرۃ:۲۳۲)

جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دو اور وہ اپنی مقررہ مدت پوری کر لیں تو ان کو (نئے) شوہروں سے نکاح سے نہ روکو، جب معروف طریقے سے آپس میں راضی ہوں۔

''بالمعروف'' کی ترکیب اس آیت میں تقریباً وہی مفہوم ادا کرتی ہے جو مثلاً ''مقررہ قواعد و ضوابط کے مطابق'' کی عبارت ادا کرتی ہے۔ بیضاوی اس کی تفسیر یوں بیان کرتے ہیں: ''قانونی قواعد و ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے اور مروجہ قانونِ انسانیت کے مطابق۔''

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ
اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ
بِالْمَعْرُوْفِ۔ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا وَلَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ
بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ فَاِنْ اَرَادَا

فِصَالًا عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا وَاِنۡ اَرَدۡتُّمۡ اَنۡ تَسۡتَرۡضِعُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ اِذَا سَلَّمۡتُمۡ مَّاۤ اٰتَيۡتُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ۔ (البقرة:۲۳۳)

اور مائیں پورے دو سال تک اپنے بچوں کو دودھ پلائیں جو شیرخوارگی کی مدت مکمل کرنا چاہے۔ اور جس کا بچہ ہے، ماؤں کا کھانا اور کپڑا قاعدہ (معروف) کے موافق اس کے ذمے ہے۔ کسی شخص پر اس کی برداشت سے باہر ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی۔ کسی ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف نہ دی جائے اور نہ کسی باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے۔ یہی ذمہ داری وارث کی ہے۔ اگر دونوں اپنی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو دونوں پر کسی قسم کا گناہ نہیں۔ اور اگر تم اپنے بچوں کو کسی انا کا دودھ پلوانا چاہو تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں۔ جب تم قاعدہ کے مطابق جو طے کیا گیا ہے، ان کے حوالے کر دو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرۡهًا۔ وَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ لِتَذۡهَبُوۡا بِبَعۡضِ مَاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ۔ وَعَاشِرُوۡهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ۔ (النساء:۱۹)

اے ایمان والو! تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ جبراً عورتوں پر قابض ہو جاؤ اور اُن کو اس لیے نہ روکو کہ جو کچھ تم نے انہیں دیا ہے، اس میں کا حصہ وصول کرو۔ مگر یہ کہ وہ عورتیں کوئی صریح ناشائستہ حرکت کریں، ان عورتوں کے ساتھ معروف طریقے سے گزران کرو۔

اَنِ اشۡكُرۡ لِىۡ وَلِـوَالِدَيۡكَ اِلَىَّ الۡمَصِيۡرُ وَاِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَـيۡسَ لَـكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا

وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا۔ (لقمٰن:۱۴-۱۵)

تُو میری اور اپنے والدین کی شکرگزاری کر۔ میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اور اگر تجھ پر وہ دونوں اس بات کا زور ڈالیں کہ تُو میرے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھہرا، جس کا تجھے علم نہ ہو۔ ان کا کہنا نہ ماننا اور دُنیا میں ان کے ساتھ معروف طریقے سے بسر کرنا۔

منکر:

معروف صورت کے اعتبار سے منکر کا متضاد ہے، جس کا مطلب لغوی طور پر نامعلوم یا اجنبی ہے اور بعینہٖ اسی وجہ سے اس کا مطلب ''ناپسندیدہ'' یا ''برا'' بنتا ہے۔ قرآنِ کریم میں نبیؐ اور مومنوں کو بار بار بہت زور دے کر اس بات کی دعوت دی جاتی ہے کہ وہ معروف کا حکم دیں اور منکر سے منع کریں۔ اس ترکیبی شکل میں دونوں اصطلاحات بالترتیب دینی اچھائی اور دینی برائی کے عمومی اور جامع تصورات کو بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ معروف کا مطلب ہر وہ فعل ہے جو سچے عقیدے کے عین مطابق ہو اور منکر ہر وہ فعل ہے جو خدا کے حکم کی مخالفت کرتا ہو۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔ (التوبہ:۷۱)

اور مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، وہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بیضاوی کے نزدیک اس آیت میں معروف سے مراد ایمان اور اطاعت ہے اور منکر کا مطلب کفر اور معاصی ہیں۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (آلِ عمران:١٠٤)

تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے، جو خیر کی طرف بلائے، معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔ یہی لوگ کامیاب ہیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔ (آلِ عمران:١١٠)

تم لوگ بہترین جماعت ہو جو لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔

یاد رہے کہ انہی آیات میں اس بات کی بھی توثیق کی گئی ہے کہ صالح لوگ وہ ہیں، جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان لاتے ہیں، نیک عمل کرتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے منع کرتے ہیں۔" (آلِ عمران:۱۱۴)

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (التوبہ:٦٧)

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک ہیں، منکر کا حکم دیتے ہیں اور معروف سے روکتے ہیں۔ اپنے ہاتھ بند رکھتے ہیں۔ وہ اللہ کو بھول گئے ہیں، اللہ نے ان کو بھلا دیا۔ بلاشبہ یہ منافق فاسق لوگ ہیں۔

اب ہم چند ایسی مثالیں دیں گے جہاں یہ لفظ منافق کے بغیر استعمال ہوا ہے۔ پہلی آیت خاص طور پر اہم ہے کیونکہ اس کا سیاق اگر حتمی طور پر غیر مذہبی نہیں تو اس لحاظ سے غیر مذہبی ضرور ہے کہ اس کا براہِ راست ایمان اور کفر سے کوئی واسطہ نہیں

ہے۔ یہ بھی قابلِ غور ہے کہ یہاں لفظ منکر نکر کے صیغے کی شکل میں استعمال ہوا ہے۔ اگرچہ اس کا معنی بعینہ وہی ہے جو منکر کا ہے۔(۹)

فَانْطَلَقَا حَتّٰی اِذَا لَقِیَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِیَّةً بِغَیْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَیْئًا نُّكْرًا۔ (الکہف: ۷۴)

پھر دونوں روانہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ ایک لڑکے سے ملے۔ اس نے اس (لڑکے) کو مار ڈالا۔ موسیٰؑ کہنے لگے، آپ نے ایک بے گناہ شخص کو بغیر کسی نفس کے مار ڈالا۔ آپ نے تو بہت بے جا کام کیا۔

ذیل کی آیت بنی اسرائیل میں ان لوگوں کے رویّے کو بیان کرتی ہے جو ایمان نہیں رکھتے تھے:

لُعِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ۔ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ۔ كَانُوْا لَا یَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ۔

(المائدہ: ۷۸-۷۹)

داؤدؑ اور عیسیٰؑ بن مریم کی زبان سے بنی اسرائیل میں سے ان لوگوں پر لعنت کی گئی، جنہوں نے کفر اختیار کیا، اس لیے کہ انہوں نے حکم کی مخالفت کی اور حد سے نکل گئے۔ وہ کبھی ایک دوسرے کو منکر سے نہیں روکتے تھے۔ واقعی ان کا فعل بہت برا تھا۔

اگلی آیت میں لفظ منکر طلاق کے اس صیغے کے لیے استعمال ہوا ہے، جو ظہار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں لوگ بیویوں کو اس صیغے سے طلاق دیا کرتے تھے۔

اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ، اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَهُمْ۔ وَاِنَّهُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ

وَزُوْرًا۔ (المجادلہ:۲)

جو لوگ اپنی بیویوں سے ظِہار کرتے ہیں (یعنی ان کو ماں سے تشبیہ دے کر علیحدگی اختیار کرتے ہیں) وہ ان کی مائیں نہیں ہیں۔ ان کی مائیں صرف وہ ہیں جنھوں نے اُن کو جنا۔ وہ منکر اور جھوٹ بات کہتے ہیں۔

یہ بات کہ اس آیت میں اور دیگر کئی مقامات پر معنویاتی طور پر منکر، بے حیائی اور مذموم کے مفہوم سے بہت مماثلت رکھتا ہے، اس طرح بھی واضح ہوتی ہے کہ بعض آیات میں لفظ منکر اور فحشاء ایک ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ بے حیائی کے تصور کے لیے فحشاء کا لفظ ہی آتا ہے۔

خیر اور شر:

خیر نیکی کے لفظ کا قریب ترین عربی مترادف ہے۔ یہ بہت ہی جامع لفظ ہے اور اس سے مراد ہر وہ چیز لی جاتی ہے جو کسی بھی لحاظ سے وقیع، فائدہ مند اور پسندیدہ ہو۔ خود قرآنی آیات کے اندر بھی اس لفظ کا معنویاتی دائرہ دنیوی اُمور کے ساتھ ساتھ دینی عقائد کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ آیئے پہلے دنیوی اُمور کی مثالوں کا مختصر جائزہ لیں۔

ذیل میں پہلی آیت کا تعلق حضرت سلیمانؑ کی کہانی سے ہے۔ روایت کے مطابق ایک دن وہ اپنے خوبصورت گھوڑوں کے نظارے میں اس قدر ڈوب گئے کہ شام کی نماز ادا کرنا بھول گئے۔ جب اُنہیں یاد آیا تو ایک شدید قلق نے ان کو آ گھیرا اور یہ الفاظ ان کی زبان پر جاری تھے:

اِنِّیْ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ عَنْ ذِکْرِ رَبِّیْ حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ۔ (ص ۳۲)

واقعی میں مال کی محبت میں اپنے رب کی محبت سے غافل ہو گیا، یہاں تک کہ (سورج) پردے میں چھپ گیا۔

تاہم دنیوی اُمور کے بارے میں خیر کے استعمال کی سب سے نمائندہ مثال

وہ آیات ہیں، جن سے یہ لفظ مال اور دولت کا حقیقی مترادف لگتا ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ، حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ۔ (البقرة:١٨٠)

تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم کو موت قریب معلوم دینے لگے تو اگر اس نے کچھ مال (خیر) ترکے میں چھوڑا ہو تو وہ والدین اور اقارب کے لیے معروف کے طور پر وصیت کرے۔ خدا کا خوف رکھنے والوں کی یہ ذمہ داری ہے۔

ذیل کی آیت خاص طور پر اہم ہے کہ اس کے آخر میں خیر کے بدل کے طور پر لفظ مال استعمال ہوا ہے، جس سے بڑی صراحت سے یہ بات پتہ چلتی ہے کہ اس قسم کے سیاق میں دونوں الفاظ باہم متبادل استعمال ہو سکتے ہیں:

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ۔ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ (البقرة:٢٧٣-٢٧٤)

اور تم جو مال (خیر) خرچ کرو گے تو بے شک اللہ اس کو جانتا ہے۔ جو لوگ رات اور دن اپنے اموال چھپا کر اور ظاہر خرچ کرتے ہیں، ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔

ذیل کی آیت بھی کم اہم نہیں کہ یہاں ایک ہی لفظ ''خیر'' واضح طور پر دُہرا کام کرتا ہے۔ پہلے جملہ میں اس سے مراد مال و دولت ہے اور دوسرے میں نیک اعمال۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان معنوں میں لفظ ''خیر'' صالح کے تقریباً مترادف ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ۔ (البقرة:٢١٥)

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، آپ فرما دیجیے کہ تم جو مال (خیر) خرچ کرو تو والدین، رشتہ داروں، یتیموں، مساکین اور مسافروں کے لیے ہے۔ تم جو نیک کام (خیر) کروگے، اللہ کو اس کی خبر ہے۔

مال و دولت دُنیا کی اچھی چیز کی علامت ہے۔ چونکہ دُنیا کی نعمتوں یا دنیوی اقدار کی اقسام کی کوئی حد نہیں، اس لیے خیر ایسا لفظ ہے جس کے اطلاق کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بہرکیف یہ پہلو فی الحال ہمارے مدنظر نہیں ہے۔ ہم خیر کے ایسے معنویاتی عناصر کا تجزیہ کریں گے جن کا سیاق براہِ راست دین اور عقیدے سے متعلق ہے۔

اس میدان میں بھی خیر کے معانی کا دائرہ بہت وسیع ہے، کیونکہ توقع کے عین مطابق انسان کے لیے جو چیز بھی مذہبی طور پر وقیع اور مفید ہے، وہ اس لفظ کے معنی میں شامل ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بجا طور پر لفظ ''خیر'' کو اخلاقی اصطلاحات کے دوسرے درجے میں شمار کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالٰی کی نعمتیں:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ۔ (آلِ عمران:۲۶)

کہیے، اے اللہ! جو بادشاہت کا مالک ہے، تُو جسے چاہے بادشاہت دیتا ہے اور جس سے چاہے چھین لیتا ہے، تو جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلت۔ تیرے ہاتھ میں ساری خیر ہے۔

اس آیت کا سیاق یہ بتاتا ہے کہ یہاں خیر سے مراد اللہ تعالٰی کی بے پایاں نعمتیں ہیں۔ اس کی مزید تائید اس سورہ کی مندرجہ ذیل آیات سے ہوتی ہے:

اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ

يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔ (آل عمران: ٧٣-٧٤)

بے شک فضل تو خدا کے قبضے میں ہے، وہ اسے جسے چاہے عطا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑا وسعت والا اور بہت علم والا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے، اس کے لیے اپنی رحمت خاص کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت فضل والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام:

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔ (البقرة: ١٠٥)

اہلِ کتاب میں سے کافر لوگ اور مشرکین ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی بھی خیر نازل ہو اور اللہ جسے چاہتا ہے، اس کے ساتھ اپنی رحمت خاص کر دیتا ہے اور اللہ بہت فضل والا ہے۔

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَا اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْا خَيْرًا۔ (النحل: ٣٠)

جو لوگ (اللہ سے) ڈرتے ہیں، ان سے (قیامت کے روز) کہا جائے گا کہ تمہارے رب نے تمہارے لیے کیا نازل کیا، وہ کہیں گے خیر۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ (البقرة: ٢٦٩)

اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے، عقل و حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا کی جائے۔ اسے بہت بڑی خیر مل گئی۔

ایمان اور عقیدہ:

يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِي اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰى۔ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّا اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (الانفال: ۷۰)

اے پیغمبر! آپ کے قبضے میں جو قیدی ہیں، ان سے کہہ دیجیے اگر اللہ تعالیٰ کو تمہارے دل میں ایمان (خیر) کا علم ہے تو تم سے (دُنیا میں) جو لیا گیا ہے (آخرت میں) اس سے بہتر (خیر) عطا کرے گا اور وہ تمہیں بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

ایمان کے مثبت اثرات:

يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ آيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْ اِيْمَانِهَا خَيْرًا۔ (الانعام: ۱۵۸)

اس روز جب تمہارے رب کی بعض نشانیاں ظاہر ہو جائیں گی، تو اس روز کسی شخص کو اس کا ایمان لانا کوئی نفع نہ دے گا، جب وہ پہلے سے ایمان نہ لایا ہو یا اس نے اپنے ایمان کے ساتھ نیک عمل (خیر) نہ کیا ہو۔

صالحات:

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ، وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔ (البقرۃ: ۱۱۰)

نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ جو نیک کام (خیر) بھی تم اپنے لیے آگے بھیجتے ہو، وہ تم اللہ کے پاس پاؤ گے۔ بے شک

جو عمل تم کرتے ہو، اللہ اسے دیکھتا ہے۔

وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَا آتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ۔

(المائدہ:٤٨)

تاکہ تمہیں جو کچھ دیا گیا ہے، اس سے تمہیں آزمائے۔
اس لیے تم نیک کاموں (خیرات) میں سبقت کرو۔

مومن:

اِنَّا اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ۔ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ۔ (ص ٤٦-٤٧)

ہم نے ان کو خالص ذکرِ آخرت کے لیے مخصوص کر دیا، وہ ہمارے نزدیک منتخب اور اچھے (اخیار) لوگوں میں سے ہیں۔

جو مثالیں اوپر دی گئی ہیں، ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لفظ ''خیر'' کے مطالب جن کا تعلق دینی اُمور سے ہے، ان کی دو موٹی قسمیں ہیں، ایک وہ اچھائی سے جس کا منبع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور دوسرے وہ اچھائی جو انسان کی پیدا کردہ ہے۔ ہر صورت میں بنیادی مطالب وہی رہتے ہیں یعنی ایسی چیز جو نازل شدہ مذہب کے نقطۂ نظر سے وقیع سمجھی جاتی ہے۔

اب ہم ان مثالوں کی طرف آتے ہیں جن میں لفظ خیر کسی اور مفہوم کی ضد کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ خیر کا سب سے عمومی متضاد شر ہے جو ان تمام مفاہیم میں خواہ وہ دینی ہوں یا غیر دینی جن کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں، براہِ راست متضاد ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کی آیت میں خیر سے مراد دنیوی زندگی کی خوشی اور خوشحالی اور شر سے مراد بدحالی اور بدقسمتی۔

لَا يَسْئَمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوْسٌ قَنُوْطٌ۔ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْ بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ

لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ وَمَا اَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً۔ (حم السجدہ: ۴۹ - ۵۰)

خیر کے لیے دُعا سے انسان کا جی نہیں بھرتا۔ اگر اسے تکلیف (شر) پہنچتی ہے تو نا اُمید اور ہراساں ہو جاتا ہے اور اگر ہم اس کو تکلیف (ضراء) کے بعد مہربانی (رحمہ) کا مزہ چکھاتے ہیں تو کہتا ہے یہ تو میرے لیے ہونا ہی چاہیے تھا اور مجھے خیال نہیں کہ قیامت قریب ہے۔

خیر اور شر کے متعین معانی (اوپر کی) آیت نمبر ۴۹ میں الفاظ کے ایک اور جوڑے سے واضح ہوتے ہیں جو فوراً بعد کی آیت نمبر ۵۰ میں مذکور ہیں۔ یعنی رحمت اور ضراء (تکلیف، بدحالی)۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قرآنِ کریم میں خوشحالی اور بدحالی کا ذکر عام طور پر اس دُنیا کے حوالے سے ایک آزمائش اور ابتلاء کے طور پر کیا گیا ہے، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ مومنوں اور کافروں میں تمیز قائم کرتا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَإِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ۔ (الانبیاء: ۳۵)

ہر جاندار موت کا مزہ چکھے گا۔ ہم تم کو شر اور خیر سے آزماتے ہیں اور پھر تم سب کو ہماری طرف آنا ہے۔

اگلی دو آیات ہمارے موضوع کے لیے ایک مختلف پہلو سے خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ ظاہری طور پر ان آیات میں صرف یہ ذکر ہے کہ دراصل نیکی اور بدی کا انسان کی پسند اور ناپسند سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور یہ کہ انسان کو ہمیشہ اس چیز کا فیصلہ ان کے انجام سے کرنا چاہیے۔ لیکن بالعکس دیکھیں تو اس آیت کا یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز کا اچھا (خیر) یا برا (شر) ہونا دراصل انسان کے جبلی اور فطری ردِّعمل پر مبنی رکھا گیا ہے۔ یعنی آیا وہ اسے پسند کرتا ہے یا اس سے متنفر ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خیر اور شر کا معنی ''پسند'' اور ''ناپسند'' بھی ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (البقرۃ:۲۱۶)

تم پر جنگ فرض کی گئی ہے جو تمہیں پسند نہیں۔ ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو تو وہ تمہارے لیے اچھی (خیر) ہو۔ اور ممکن ہے تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے حق میں خرابی (شر) ہو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ، فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ (النساء:۱۹)

اور ان کے ساتھ معروف طریقے سے گزر کرو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس میں تمہارے لیے بہت بڑا فائدہ (خیرِ کثیر) رکھ دے۔

یہاں یہ بات کہنا غیر ضروری نظر آتا ہے کہ خیر اور شر میں بنیادی تضاد مذہبی سیاق میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ خیر اور شر سے بالترتیب نیک اعمال اور کفر مراد لیے جاتے ہیں۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔ (الزلزال:۷-۸)

اس روز (قیامت) لوگ مختلف گروہ بن کر نکلیں گے، تاکہ اپنے اعمال دیکھیں۔ جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی، وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی، اسے دیکھ لے گا۔

بعض اوقات انہی معنی میں شر کی بجائے ایک اور لفظ سُوء استعمال ہوتا ہے جس کا تجزیہ ہم اگلی فصل میں کر رہے ہیں۔

حسن اور سوء:

قرآنِ کریم میں ان دونوں مادوں کے بہت سے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ ذیل میں ہم صرف چند اہم کا جائزہ لیں گے۔

۱۔ حسن:

''خیر'' کی طرح ''حسن'' کا دائرہ اطلاق بھی بہت وسیع ہے۔ یہ ایک ایسی صفت ہے، جسے تقریباً ہر اُس شے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، جو اچھی لگے، خوبصورت ہو، تسلی بخش اور قابلِ تعریف ہو۔ خیر کی طرح اس کا دائرہ بھی انسانی زندگی کے دینی اور دنیوی دونوں اُمور کو احاطہ کرتا ہے۔ چند مثالیں اس کی تائید کے لیے پیش ہیں:

وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا۔ اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔

(النحل:۶۷)

اور کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے تم نشہ اور عمدہ کھانے کی چیزیں بناتے ہو۔ بے شک اس میں اُن لوگوں کے لیے بڑی دلیل ہے جو عقل رکھتے ہیں۔

یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لفظ ''حسن''، ''لذیذ'' اور ''ذائقے میں پسندیدہ'' کے تقریباً ہم معنی استعمال ہوا ہے۔ اگلی آیت میں اس لفظ کا مطلب بالکل مختلف دکھائی دیتا ہے۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا۔

(آلِ عمران:۳۷)

پس اُن کے رب نے انہیں (حضرت مریمؑ کو) اچھی مقبولیت کے ساتھ قبول کیا اور اُنہیں اچھی نشوونما کے ساتھ بڑھنے دیا۔

غور کریں کہ اس آیت میں حسن دو مرتبہ یکے بعد دیگرے آیا ہے۔ پہلی مرتبہ اس سے مراد وہ انعام کا معاملہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کے ساتھ فرمایا۔ دوسری جگہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت مریمؑ بڑی ہو کر شاندار صحت والی اور خوش اطوار خاتون بنیں۔

اگلی آیت میں یہ لفظ سماجی زندگی میں انسانوں کے درمیان مثالی تعلقات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مزید صراحت یہ کہ آیت میں انسانوں کے لیے یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ امن و سلامتی کے ساتھ گفتگو کریں تاکہ وہ اپنے درمیان امن کے تعلقات کو فروغ دیں۔

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ، اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ۔ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا۔ (بنی اسرائیل:۵۳)

اور آپ میرے بندوں سے کہہ دیجیے کہ ایسی بات کریں جو احسن ہو۔ شیطان ان میں فساد ڈلوا دیتا ہے۔ واقعی شیطان انسان کا صریح دشمن ہے۔

حسن کا لفظ ''نفع بخش'' اور ''مفید'' کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ خصوصاً تجارت اور معیشت کے حوالے سے قرآنِ کریم میں انہی معنی کو نیک اعمال کے لیے بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ نیک عمل کر کے انسان اللہ تعالیٰ کو ایک نفع بخش قرض دیتا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً وَّاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْصُطُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ (البقرة:۲۴۵)

کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو اچھے طور پر قرض دے۔ پھر اللہ تعالیٰ اُس کو بڑھا کر کئی گنا کر دے گا۔ اللہ کمی کرتے ہیں اور فراخی کرتے ہیں اور تم اسی کی طرف لے جائے جاؤ گے۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ۔ (الحدید:١٨)

بے شک صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جنہوں نے اللہ کو قرضِ حسنہ دیا ہے، اللہ تعالیٰ اُن کے لیے اسے دُگنا کر دے گا اور اُن کے لیے پسندیدہ اجر ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کو ''اچھا وعدہ'' فرماتے ہیں کیونکہ اس میں انسان کے ساتھ بہت سی بھلائیوں کا وعدہ ہے، بشرطیکہ انسان ان کی شرائط کو پابندی کے ساتھ پورا کرے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا۔ (طٰه:٨٦)

فرمایا اے قوم! کیا تم سے تمہارے رب نے ''اچھا وعدہ'' نہیں کیا تھا؟

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ۔ (القصص:٦١)

بھلا وہ شخص جس نے ''پسندیدہ وعدہ'' کر رکھا ہے، پھر وہ اسے پانے والا ہے، کیا اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جس کو ہم نے دنیوی زندگی کا چند روزہ فائدہ دے رکھا ہے۔ پھر وہ قیامت کے روز ان لوگوں میں سے ہوگا جو گرفتار کر کے لائے جائیں گے۔

قرآنِ کریم میں اور بھی بہت سی چیزوں کو حسن کہا گیا ہے، لیکن ہمارے مقصد کے لیے اتنی مثالیں کافی ہیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ معنویاتی نقطۂ نظر سے ''اچھے عمل'' کو نیکی کے مفہوم میں بیان کرنے کے لیے ''حسن'' کا مونث صیغہ استعمال ہوا ہے۔

۲۔ حسنہ:

حسنہ صفت حسن کا مونث صیغہ ہے۔ مونث کا صیغہ مستقل اسم کے طور پر استعمال ہوا ہے، اور اس سے کوئی بھی ایسی چیز مراد ہے جو اس صفت کی خاصیت رکھتی ہو۔ ہم یہاں شروع میں یہ ذکر کرنا چاہیں گے کہ یہ لفظ ان معنی میں بعض مقامات پر خیر کے عین مترادف نظر آتا ہے، خواہ اس کا دائرہ اطلاق دینی ہو یا دنیوی۔ ذیل کی آیت میں سے یہ بات بہت خوبصورتی سے واضح ہوتی ہے:

وَمِنْهُم مَّن يَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (البقرۃ:۲۰۱)

ان میں سے بعض لوگ کہتے ہیں: ''اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھی اچھائی عنایت کیجیے اور آخرت میں بھی اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچائیے۔

اس آیت میں حسنہ صریحاً خوشی، خوشحالی، خوش قسمتی اور اس سے ملتے جلتے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ان معانی میں قرآنِ کریم میں یہ الفاظ ہمیشہ اپنے مقابل سیئہ کے ساتھ مرکب کے طور پر آتا ہے۔ چند مثالیں پیش ہیں:

اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ۔ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ (النساء:۷۸)

اگر ان کو اچھائی ملے تو کہتے ہیں، یہ اللہ کی طرف سے ہے اور برائی آئے تو کہتے ہیں، یہ تمہاری طرف سے ہے۔ انہیں کہیں یہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا۔ (آل عمران:۱۲۰)

اگر تمہیں اچھائی ملے تو انہیں برا لگتا ہے، اور اگر تمہیں

برائی ملے تو وہ اس پر خوش ہوتے ہیں۔

حسنہ اور سیئہ بعض اوقات دونوں جمع کی شکل میں بھی آتے ہیں:

وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔

(الاعراف:۱۶۸)

اور ہم نے ان کو خوش حالیوں اور بدحالیوں سے آزمایا، شاید باز آ جائیں۔

یاد رہے کہ ہم اس سے قبل خیر اور شر کا اللہ کی طرف سے آزمائش کے طور پر ذکر کر چکے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ''خیر'' اپنے طور پر بہت ہی جامع لفظ ہے، لیکن اسے بہت ہی محدود مذہبی مفہوم میں ''نیک عمل'' کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح حسنہ بھی بالکل انہی معنوں میں استعمال ہو سکتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَّاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ (النساء:۴۰)

بے شک اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ اگر ایک نیکی ہو گی تو اسے کئی گنا کر دیں گے اور اپنے پاس سے اجرِ عظیم دیں گے۔

یہ بات خاص طور پر اُس وقت صادر آتی ہے جب یہ لفظ صریحاً سیئۃ کے مقابل استعمال ہو رہا ہو۔ اس صورت میں سیئۃ کا مفہوم عام برائی کے بجائے ''بے دینی'' ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں بے شمار مثالیں ہیں۔

''جو شخص نیکی (نیک کام) لے کر آئے گا (تو قیامت کے دن) اسے اس سے بہتر (انعام) ملے گا اور اس روز وہ دہشت اور گھبراہٹ سے محفوظ ہو گا۔ اور جو بدی (برا کام) لے کر آئے گا تو وہ لوگ اوندھے منہ دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے۔''

''نیک کام پیش کرنے'' کی ترکیب کی جگہ اسی مادے سے متعدی فعل احسن (نیک کام کرنا) استعمال ہوا ہے۔ اس فعل کا ہم آگے چل کر تجزیہ کریں گے۔ یہاں

صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے الذی احسن کا مطلب ہے ''وہ جو حسنہ کرے'' اور صریحا یہاں حسنہ بہت واضح طور پر سیئۃ کا متضاد ہے۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ۔ (یونس: ۲۶-۲۷)

جن لوگوں نے نیکی کی ہے، ان کے لیے جزا ہے اور مزید بھی۔ ان کے چہروں پر نہ کدورت چھائے گی نہ ذلت ہوگی۔ یہ لوگ جنت والے ہیں، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ جن لوگوں نے برے کام کیے، ان کو ہر برائی کا بدلہ اس کے برابر ملے گا اور ان پر ذلت غالب ہوگی۔

۳۔ احسن:

فعل احسن (مصدر احسان) قرآنِ کریم کی اخلاقی اصطلاحات میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ عام طور پر اس کا مطلب نیکی کرنا ہے، لیکن فی الحقیقت قرآنِ کریم میں اس کا استعمال دو خاص قسم کے نیک اعمال کے لیے ہوتا ہے:

(۱) اللہ کے ساتھ مکمل تقویٰ کا تعلق اور وہ تمام انسانی اعمال جو اس بناء پر شروع ہوتے ہیں۔

(۲) تمام وہ اعمال جن کے پیچھے حلم کی روح کارفرما ہوتی ہے۔

آیئے پہلے ہم اُن آیات کا مطالعہ کرتے ہیں، جہاں احسان قریب قریب تقویٰ اور عبادت کے معنوں میں یا زیادہ واضح لفظوں میں ''خوفِ خدا'' کے معنوں میں آیا ہے:

اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (یوسف: ۹۰)

واقعی جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے اور صبر کرتا ہے، تو
اللہ ایسے نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہاں لفظ احسان کے معنویاتی عناصر ''خوفِ خدا'' اور ''صبر'' ہیں اور یہ دونوں جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ''مومن'' کی خصوصیات کے طور پر بیان ہوئے ہیں۔ اگلی آیت میں لفظ محسن (احسان کا اسمِ فاعل) لفظ متقی کے مساوی استعمال ہوا ہے، جبکہ اپنے اصلی معنوں میں یہ بہت واضح طور پر نیکی اور عبودیت کے افعال کو بیان کرتا ہے:

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ اٰخِذِیْنَ مَا اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِیْنَ، كَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ وَفِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ (الذریت:۱۵-۱۹)

بے شک متقی لوگ جنتوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔ ان کے رب نے جو اُن کو عطا کیا ہوگا، اسے لے رہے ہوں گے۔ وہ لوگ اس سے قبل نیکوکار تھے، وہ لوگ رات کو بہت کم سوتے تھے اور آخرشب استغفار کرتے تھے۔ ان کے اموال میں سوالی اور محتاج کا حق تھا۔

یہ بات کہ ان مقامات پر احسن عملی طور پر ''نیک اعمال کرنے'' کے مترادف ہے، ذیل کی دو آیات سے بھی واضح ہوتی ہے:

لِلْمُحْسِنِیْنَ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (لقمٰن:۳-۵)

نیکوکاروں کے لیے جو نماز کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ آخرت کا پورا یقین رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ

مَنْ اَحْسَنَ عَمَلاً۔ (الکہف: ۳۰)

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور اُنہوں نے اچھے کام

کیے تو ہم ایسوں کا اجر ضائع نہ کریں گے، جو اچھی طرح کام

کرے۔

ہم یہاں یہ اضافہ کرتے چلیں کہ حضرت ابراہیمؑ جنہوں نے احکامِ خداوندی کی مکمل اطاعت کرتے ہوئے اپنے چہیتے بیٹے (مصنف نے یہاں حضرت اسحٰقؑ کا نام لکھا ہے) کو قربان کرنے کی کوشش کی۔ ان کا یہ فعل بھی محسن کی ذیل میں بیان ہوا ہے:

وَنَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰاِبْرٰهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا۔ اِنَّا

کَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ۔ (الصٰفٰت: ۱۰۴-۱۰۵)

ہم نے ان کو آواز دی کہ اے ابراہیمؑ! تم نے اپنا

خواب سچا کر دکھایا، ہم نیک کام کرنے والوں کو اسی طرح بدلہ

دیتے ہیں۔

چنانچہ یہ بات قطعاً قابلِ تعجب نہیں کہ بعض اوقات ''محسن'' کافر یا اس سے ملتے جلتے معنویاتی مماثل الفاظ کے متضاد کے طور پر استعمال ہوتا ہے:

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَذٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِیْنَ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا

وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ۔ (المائدہ: ۸۵-۸۶)

سو اللہ تعالیٰ ان کے قول کے بدلے میں باغات

عنایت کریں گے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ان میں

ہمیشہ رہیں گے۔ نیکوکاروں کا یہی بدلہ ہے۔ جن لوگوں نے کفر کیا

اور ہماری آیات کو جھٹلایا، وہ دوزخ کے لوگ ہیں۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِیًّا لِّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ

ظَلَمُوْا وَبُشْرٰی لِلْمُحْسِنِیْنَ۔ (الاحقاف: ۱۲)

یہ کتاب جو عربی زبان میں ہے تصدیق کرتی ہے تاکہ
جنہوں نے ظلم کیے، اُنہیں ڈرائے اور نیکوکاروں کو خوشخبری دے۔

جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ احسان کا ایک اور اہم مفہوم دوسروں کے ساتھ محبت کا رویّہ بھی ہے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس سے مراد ایسے عمل ہیں جن کے پیچھے حلم کا بنیادی رویّہ کارفرما ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل آیت سے یہ حقیقت بہت صراحت سے سامنے آتی ہے کہ احسان حلم کے جذبے کا سب سے بدیہی اظہار ہے:

وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ
الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ
عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (آل عمران:۱۳۳-۱۳۴)

اور ایسی جنت جس کی وسعت زمین و آسمان جیسی ہے،
یہ ایسے متقین کے لیے تیار کی گئی ہے جو فراغت میں اور تنگی میں
خرچ کرتے ہیں، غصے کو ضبط کرتے ہیں، لوگوں سے درگذر کرتے
ہیں اور اللہ تعالیٰ نیکوکاروں سے محبت کرتا ہے۔

جو شخص ہمیشہ غریبوں کی مدد کے لیے تیار ہو، جسے غصہ کم آئے، انتقام کی بجائے صبر اور عفو پر آمادہ ہو، وہ حلم کا عملی مظاہرہ کرتا ہے۔ اگلی آیت میں بھی احسان اور حلم کے درمیان قریبی ربط کو ظاہر کیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ جاہلیت کے رویّے کے عین برعکس ہے:

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ
فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (المائدہ:۱۳)

آپ کو آئے دن اُن کی خیانت کا پتہ چلتا رہے گا،
سوائے چند لوگوں کے۔ پس آپ ان کو معاف کر دیجیے اور ان
سے درگزر کیجیے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے۔

قرآن کریم والدین کے ساتھ نرمی کی تاکید کرتے نہیں تھکتا، چاہے اس کا صرف یہ سبب بتلائے کہ ''اس کی ماں نے اسے بہت تکلیف کے ساتھ اسے پیٹ میں

رکھا اور بہت تکلیف سے جنم دیا۔'' (الاحقاف:۱۵)۔ والدین کے ساتھ نیکی کے رویّے کو احسان کا نام دیا گیا ہے:

> وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاهُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا۔ اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِیْمًا۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا۔ (بنی اسرائیل:۲۳-۲٤)
>
> اور تیرے رب نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تیرے پاس اُن میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو کبھی اُف تک نہ کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا۔ ان کے سامنے شفقت سے جھکے رہنا اور یوں دُعا کرتے رہنا کہ میرے پروردگار! ان دونوں پر رحمت فرما، جس طرح اُنہوں نے میری چھوٹے ہوتے ہوئے پرورش کی۔

مندرجہ بالا آیت کا آخری حصہ بہت واضح طور پر زیرِ بحث نیک سلوک کی اصل نوعیت کو بیان کرتا ہے۔

قرآنِ کریم کی روحانی فضا کے تقاضے کے مطابق، جس میں نمایاں طور پر نیکی اور حسنِ سلوک پر زور دیا گیا ہے، احسان کے مفہوم میں یہ شدید رجحان پایا جاتا ہے کہ محبت اور شفقت کے وسیع مفہوم میں خیرات کی فیاضی کو بھی شامل کیا جائے۔ اس کی چند مثالیں ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ ذیل کی مثال احسان کے معنویاتی عناصر میں فیاضی کے عنصر کو غالباً زیادہ صراحت سے سامنے لاتی ہے کیونکہ اس کے بالمقابل بخل کا لفظ استعمال ہوا ہے:

> وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ

بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔ (النساء: ۳۶-۳۷)

اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور نزدیک اور دُور کے پڑوسیوں، اور ہم مجلس اور راہ گیر کے ساتھ بھی اور ان کے ساتھ بھی جو تمہارے قبضے میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت نہیں رکھتا جو کنجوسی کرتے ہوں اور کنجوسی کا حکم دیتے ہوں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے جو کچھ دیا ہے، اسے چھپاتے ہیں۔

۴۔ سیئہ

حسنہ کی طرح سیئہ بھی اسم صفت کا تانیث کا صیغہ ہے۔ جو قرآنِ کریم میں زیادہ تر اسم کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اسم صفت کا صیغہ سیئ ہے جو سورہ فاطر میں آیا ہے۔ اس سے مادہ سوء کا قرآنی مفہوم بہت کھل کر واضح ہوتا ہے:

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا اسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ۔ (فاطر: ۴۲-۴۳)

اور اُنہوں نے بہت زور دار قسم کھائی تھی کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آئے تو وہ ہر اُمت سے زیادہ ہدایت قبول کرنے والے ہوں گے، پھر جب ان کے پاس ایک پیغمبر آیا تو دُنیا میں اپنے کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے اور بری سازشوں کی وجہ سے ان کی نفرت بڑھ گئی۔ اور بری سازشوں کا وبال ان تدبیر والوں پر ہی پڑتا ہے۔

ظاہر ہے کہ المکر السیئی (یعنی بری سازشیں) سے وہ کوششیں مراد ہیں جو کافر دشمن، حضرت محمد ﷺ کے پیغامِ توحید کو ناکام کرنے کے لیے کر رہے تھے۔ آیئے اب ہم اس کے مونث کے صیغے یعنی سیئہ کا جائزہ لیں۔ یاد رہے کہ اوپر حسنہ کے ضمن میں ہم جزوی طور پر اس لفظ کا تجزیہ پیش کر چکے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ سیئہ دو بالکل مختلف مفاہیم کو بیان کرتا ہے۔ ایک طرف تو اس کا مطلب ہے، انسانی زندگی میں ناپسندیدہ تبدیلیاں اور وہ تمام مصائب اور بدنصیبیاں جو انسان کو پیش آ سکتی ہیں۔ دوسری طرف اس سے مراد وہ برا کام ہے جو مشیتِ الٰہی کے خلاف سرزد ہوا ہو۔ اس دوسرے مفہوم کو اکثر معصیت یا نافرمانی بھی کہا جاتا ہے۔ اسلامی فکر کے نقطۂ نظر سے یہ بہت اہم بات ہے کیونکہ سیئہ کے اس دُہرے معنی کی وجہ سے بعد میں قدریہ اور معتزلہ کے بنیادی عقائد میں بہت ہی اہم کلامی مسائل ابھرے۔

ماتریدی متکلم البیاضی نے اس موضوع پر بہت دلچسپ روایت بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ معتزلی متکلم الجبائی کا کہنا ہے کہ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ بعض اوقات لفظ سیئہ آفت (بلیہ) اور آزمائش کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور بعض اوقات یہ گناہ (ذنب) اور نافرمانی (معصیت) کے مفہوم میں آتا ہے۔

اس میں بھی شک نہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ برائی کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔

''کہہ دیجیے کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے آتی ہے۔''

اور ذیل کی آیت میں انسان کی طرف:

''اور ہر سیئة (مصیبت) جو تمہاری طرف آتی ہے، وہ تمہاری اپنی طرف سے ہے۔'' (النساء:۷۸)

ظاہر بات ہے کہ ان دونوں بیانات میں تطبیق پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ ان کا باہمی تناقض اور تضاد دُور ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ سیئة کی نسبت جب خدا کی جانب ہو تو اس کا مطلب بدحالی اور بدقسمتی ہے اور جب انسان سے منسوب ہو تو اس کا مطلب نافرمانی ہے۔''(۱۰)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ الجبائی نے سیئۃ کے دُہرے معانی کو بہت ہشیاری سے یہ ثابت کرنے کے لیے دلیل بنایا ہے کہ نافرمانی یعنی کفر کی نسبت اللہ کی طرف ناممکن ہے، کیونکہ وہ عادل خدا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ البیاضی جو حنفی المذہب ہے، اس تفریق کی پرزور تردید کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایمان ہو یا کفر ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے۔ اگر قرآنِ کریم میں حسنہ کا استعمال عمومی مفہوم میں ہے تو سیئۃ کو بھی عام مفہوم میں لینا ہوگا۔ (۱۱)

بہرصورت یہ بات یقینی ہے کہ قرآنِ کریم میں لفظ سیئۃ بعض اوقات ''بدقسمتی'' اور بعض اوقات ''برے کام'' کے مفہوم میں آیا ہے۔ آیئے اس دوسرے مفہوم کا مزید غور سے جائزہ لیں۔

زیادہ تر ایسا لگتا ہے کہ سیئۃ کفر کا نتیجہ ہے۔ مندرجہ ذیل آیت سے یہ بات بہت اچھی طرح واضح ہوتی ہے:

> وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۔ فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰي عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ۔
>
> (الزمر:۴۷-۵۱)

> اور اگر ظلم کرنے والوں کے پاس دنیا بھر کی چیزیں ہوتیں اور ان کے ساتھ اتنی ہی اور ہوتیں تو وہ قیامت کے روز عذاب کی سختی سے بچنے کے لیے دے ڈالتے۔ اللہ کی طرف سے ان کے ساتھ وہ معاملہ پیش آئے گا، جس کا انہیں گمان بھی

نہیں۔ انہوں نے جو برے اعمال کیے ہوں گے، سب ظاہر ہو جائیں گے، اور جس عذاب کا وہ مذاق اُڑاتے تھے، وہ ان کو آ گھیرے گا۔ پھر جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے۔ پھر ہم جب اس کو اپنی طرف سے نعمت عطا کرتے ہیں تو کہتا ہے، یہ تو مجھے میری تدبیر سے ملی ہے۔ بلکہ یہ آزمائش ہے، لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں۔ یہ بات ان سے پہلے لوگوں نے بھی کہی تھی، لیکن ان کے اعمال ان کے کام نہ آئے۔ ان کے برے اعمال نے ان کو آ پکڑا۔ ان میں سے جو ظالم ہیں، ان کی بداعمالیاں بھی ان کو گھیرنے والی ہیں اور وہ اس سے بچ نہیں سکتے۔

اگلی آیت میں سونے کے بچھڑے کا ذکر ہے، جو حضرت موسیٰ کی قوم نے بنایا تھا، اور اس کی پوجا کرنے لگے تھے۔ چنانچہ یہ واضح ہے کہ جیسا کہ البیضاوی نے لکھا ہے کہ یہاں برے اعمال سے کفر اور معصیت کے کاموں کے علاوہ اور کوئی مراد نہیں لی جا سکتی، جن میں وہ مبتلا ہو گئے تھے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ۔ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْا اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (الاعراف:۱۵۲-۱۵۳)

بے شک جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا شروع کی، اُن پر بہت جلد ان کے رب کی طرف سے اسی دُنیا کی زندگی میں غضب اور ذلت آ پہنچے گی۔ ہم افتراء پردازوں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں اور جن لوگوں نے برے کام کیے، پھر اس کے بعد توبہ کی اور ایمان لے آئے، تو تمہارا رب اس کے بعد معاف کرنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بعض اوقات سیئۃ صالحہ کے بالمقابل استعمال ہوا ہے۔ لفظ ''صالحہ'' کے بارے میں بحث اوپر گزر چکی ہے۔ سیئۃ اور صالحہ کے درمیان تعلق کا ذکر بھی ہو چکا ہے۔ یہاں ہم ایک اور اہم مثال کا ذکر کرتے ہیں:

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (العنکبوت:۷)

اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے، ہم ان کے گناہ (سیئات) ان سے دور کر دیں گے اور ان کو ان کے اعمال کا زیادہ اچھا بدلہ دیں گے۔

اس آیت میں کفر سیئات (گناہ دور کرنا، مٹا دینا) کا جو لفظ استعمال ہوا ہے، وہ ایک اور بہت ہی اہم آیت میں مومنوں کی دعا کے ایک حصے کے طور پر بیان ہوا ہے:

رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ۔ (آل عمران:۱۹۳)

اے اللہ! پھر ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہمارے گناہوں کو ہم سے زائل کر دے اور ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ موت دے۔

مفسرین یہاں عام طور پر ''ذنوب'' اور ''سیئات'' میں فرق کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ''ذنوب'' سے مراد کبیرہ گناہ ہیں اور ''سیئات'' سے مراد صغیرہ گناہ ہیں۔ اس تشریح کی تائید مندرجہ ذیل آیت سے بھی ہوتی ہے:

إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلًا كَرِيمًا۔ (النساء:۳۱)

اگر ان کبیرہ گناہوں سے بچتے رہو جس سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمہاری برائیوں کو زائل کر دیں گے اور تمہیں

ایک معزز جگہ میں داخل کر دیں گے۔

اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اس آیت میں صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کے درمیان بہت ہی اہم اختلاف کا ذکر ہے۔ یہ اختلاف ''درجے'' اور ''نوعیت'' دونوں لحاظ سے ہے۔ درحقیقت یہ فرق ایک بہت ہی نازک موقف پر قائم ہے کیونکہ بہرحال کبیرہ گناہ کی حتمی اور یقینی تعریف کرنا مشکل ہے۔ تاہم ایک بات کسی بھی شک و شبہ سے بالاتر نظر آتی ہے۔ اسی سورت میں چند آیات کے بعد ہمیں مندرجہ ذیل صریح عبارت ملتی ہے:

> إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰى إِثْمًا عَظِيْمًا۔
> (النساء:٤٨)
>
> بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو ہرگز نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے اور وہ اس کے علاوہ جس کے لیے چاہے ہر چیز معاف کر سکتا ہے اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے، وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

یہاں ایسا لگتا ہے کہ ہم شرک کو سب سے بڑا ناقابلِ معافی گناہ شمار کر سکتے ہیں۔ لیکن اگرچہ اس آیت میں بلاشک و شبہ یہی صحیح ہے، لیکن کسی بھی صورت میں اس سے یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ شرک کا مفہوم لفظ سيئة میں شامل نہیں ہے۔ درحقیقت ہم اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں کہ سونے کے بچھڑے کی پرستش کے ضمن میں لفظ سيئة استعمال ہوا ہے، جو یقیناً شرک کی بہت ہی نمایاں مثال ہے۔ ایک اور آیت میں ان اعمال کا ذکر کرنے کے بعد جن سے اللہ تعالیٰ نے صریحاً منع کیا ہے، قرآنِ کریم یہ فیصلہ سناتا ہے:

> كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا۔ (بنی اسرائیل:۳۸)
>
> یہ سارے بُرے کام تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔

اس آیت میں جو فہرست دی گئی ہے، وہ مختصراً یوں ہے کہ

(۱) افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کا قتل

(۲) زنا

(۳) بلاوجہ قتل

(۴) یتیموں کے جائز مال میں غبن

(۵) تجارت میں بددیانتی

(۶) غرور اور تکبر

ان میں سے بعض کو کبائر میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ہم یہ اضافہ کرتے چلیں کہ سورۃ ھود آیت ۷۸ میں لواطت کو سیئۃ (برائی) کہا گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، قرآن میں لواطت کو ایسا فعل بتایا گیا ہے جو اللہ کی نظر میں اس سے زیادہ گھناؤنا فعل آج تک اس دُنیا میں کسی بھی مخلوق سے سرزد نہیں ہوا۔

اساء:

یہ فعل کا صیغہ ہے، جس کا مادہ لفظ سؤ ہے۔ مختصراً یوں کہیے کہ یہ لفظ سیئہ کے مفہوم کو عمل اور حرکت کے طور پر بیان کرتا ہے۔ بلاشبہ قرآنِ کریم میں سیئہ سے کفر کا فعل مراد ہے جو کہ سیئہ کی مکمل مثال ہے۔ مندرجہ ذیل آیت میں اس تعلق کو بہت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ جہاں ''اساء'' کا مقابلہ عملِ صالح سے کیا گیا ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحاً فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَيْهَا۔ (الجاثیہ:۱۵)

جو شخص نیک کام کرتا ہے، سو اپنے لیے اور جو برا کام کرتا ہے، تو وہ اپنا ہی برا کرتا ہے۔

اگلی آیت میں ''مسیئ'' (بدکار) کا مقابلہ ان لوگوں سے ہے ''جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔'' یہ بات بجائے خود نہایت اہم ہے، تاہم یہاں مسیئ کی تشبیہ ایک اندھے آدمی سے دی گئی ہے، جبکہ صالح شخص کی مثال ایک بینا شخص سے دی گئی ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ دونوں استعارے بالترتیب کافر اور مومن کے لیے بھی

بکثرت استعمال کیے ہوئے ہیں:

وَمَا يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓئُ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ۔ (المومن:۵۸)

اور اندھا اور بینا برابر نہیں۔ نہ ہی وہ لوگ جو ایمان

لائے اور نیک عمل کیے اور برائی کرنے والے۔ تم لوگ بہت کم

یاد رکھتے ہو۔

اگلی آیت میں بہت واضح طریقے سے یہ بتایا گیا ہے کہ اساء کے فعل سے کونسے اعمال مراد ہیں۔ اس آیت میں ''تکذیب'' کے فعل کو برائی بتایا گیا ہے، جو اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ ''اساء'' کا مطلب کافروں کے طریقے سے کام کرنا ہے۔

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاءُوا السُّوْٓاٰى اَنْ كَذَّبُوْا

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ۔ (الروم:۱۰)

پھر ایسے لوگوں کا انجام جنہوں نے برے کام کیے تھے،

برا ہوا۔ اس لیے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا تھا اور ان کا

مذاق اُڑاتے تھے۔

سُوء اور سَوء

گذشتہ صفحات میں س و ء کے مادہ کے مختلف اور مشتقات کے بارے میں تفصیلی بیان کے بعد ہم اسی مادہ کی دو باقی اشکال یعنی سُوء اور سَوء کی طرف آتے ہیں۔ ان اشکال کی اہمیت کے باوجود ان پر تفصیلی بحث بوجھل تکرار لگے گی۔ تاہم موجودہ سیاق میں ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ ان الفاظ کی صورت اور معانی کے بارے میں چند قابلِ ذکر نکات کا ذکر ہو جائے۔

سَوء دراصل فعل ساء کا اسمِ مصدر ہے۔ جیسا کہ ہم تفصیل سے بحث کر چکے ہیں، اسے خصوصی طور پر ایسے لقب کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، جو مرکب اسم صفت ہو (مثلاً صاحبِ ہمت آدمی) جبکہ سُوء اسی مادہ سے اسمِ مجرد ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں

ایک دوسرے کے مثنی (جوڑا) ہیں جو نہ صرف صورت میں بلکہ معانی میں بھی متشابہ ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو ان دونوں میں امتیاز بے حد مشکل ہو جاتا ہے، جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے۔

آیئے پہلے سوء کو لیتے ہیں اور اس کی بعض مخصوص مثالوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہ لفظ ہمیشہ ترکیب توصیفی میں مندرجہ ذیل مثال کی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔ رجل السوء یا رجل سوء جس کے لغوی ہیں: ایک برے وجود کا شخص، ایک بری طبیعت اور برے اطوار کا شخص۔

قَالُوْا یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا یٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا کَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا کَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّا۔ (مریم:۲۷)

لوگوں نے کہا، اے مریم! تم نے تو بہت غضبناک برا کام کیا۔ اے ہارون کی بہن! تمہارے باپ کوئی برے آدمی نہیں تھے اور نہ ہی تمہاری ماں بدکار تھیں۔

یہاں سیاق سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ سوء سے مراد بدکاری یا جنسی آوارگی ہے۔ اسی طرح سورۂ انبیاء، آیت ۷۴ میں سدوم کے لوگوں کو ان کی قابلِ مذمت عادات کی وجہ سے قومِ سوء (برے کردار والے لوگ، برے لوگ) کہا گیا۔

ایک اور درجے میں جسے دینی کہنا زیادہ مناسب ہوگا، حضرتِ نوحؑ کی قوم کے بارے میں یہی الفاظ (قومِ سوء) استعمال ہوئے ہیں، ان کے برے وجود یا برائی کی وجہ اس مرتبہ تکذیب ہے۔

وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا اِنَّهُمْ کَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِیْنَ۔ (الانبیاء:۷۷)

اور ہم نے اس (حضرتِ نوحؑ) کی ایسے لوگوں کے خلاف مدد کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے، بے شک وہ برے لوگ تھے، ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔

اگلی آیات میں چند بدوی قبائل کی طرف اشارہ ہے جو حدیبیہ کی مہم کے موقع

پر کسی نہ کسی بہانے کوشش کرتے ہیں کہ جہاد کے فرض سے جان چھڑا لیں اور اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا۔ (الفتح:۱۲)

بلکہ تم نے تو یہ سمجھا کہ رسول اور مومنین اپنے گھر والوں میں کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے اور تمہارے دلوں کو یہ بات بھا گئی اور تم نے برے برے گمان کیے اور تم تو برباد ہونے والے لوگ ہو۔

اس آیت میں اور اسی طرح کی دوسری آیات میں صرف ''ظَنَّ السَّوْءِ'' ہی واحد ممکن قرات نہیں ہے۔ بعض ماہرین کے نزدیک متبادل قرأت ''ظن السُوء'' بھی جائز ہے۔ بعض دوسرے حضرات کی رائے میں اسے ''سَوء'' یا ''سُوء'' پڑھنے سے یقینی طور پر معنی بدل جاتے ہیں۔ اوّل الذکر (سوء) سے مراد فساد یا تباہی ہے جبکہ موخر الذکر (سوء) کا مطلب نقصان، شکست یا شر نکلتا ہے۔ (۱۴)

ہماری رائے میں یہ ساری بحث بے فائدہ ہے۔ ظن السَوء اور ظن السُوء میں فرق محض نحوی مسئلہ ہے۔

انہی آیات میں ''ظن السوء'' کے علاوہ سوء کی ایک اور ترکیب ''دائرة السوء'' بھی استعمال ہوئی ہے، جس کا مطلب ہے، برائی کی باری یا برائی کا چکر، یہاں بھی دو متبادل قرأتیں ممکن ہیں۔ سَوء اور سُوء۔ یہی بات سورہ الفرقان میں بھی کہی جا سکتی ہے، جہاں کہا گیا ہے کہ ''شہر برائی کی بارش سے تباہ ہوگیا۔'' (آیت:۴۰) عموماً مفسرین کے نزدیک یہاں شہر سدوم مراد ہے جو روایت کے مطابق پتھروں کے برسنے سے مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا۔ اس مثال میں بھی سوء کو دونوں طریقوں سے پڑھا جا سکتا ہے۔ بعض مفسرین نے یہاں بھی دونوں کے درمیان معنوی فرق کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر سُوء پڑھا جائے تو مطلب نقصان یا چوٹ نکلے گا

اور سوء پڑھا جائے تو تباہی مراد ہوگا۔

بہرکیف یہ واضح ہوگیا کہ معنویاتی لحاظ سے سوء ایسی صفت ہے جس کا اطلاق بہت وسیع ہے، کیونکہ یہ ہر اس شے کو شامل ہے جسے سیئ (برا) کہا جا سکتا ہے۔ بالکل یہی بات اسمِ مصدر سُوء پر بھی صادق آتی ہے۔

عام مفہوم میں سوء سے مراد ہر وہ شے ہے جو ناپسند یا مذموم خیال کی جاتی ہو یا ہر وہ چیز جس سے نفرت اور بیزاری کا ردِّعمل ابھرے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ۔ (النحل: ۵۸-۵۹)

اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خبر دی جائے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غصے سے گھٹتا ہے جس چیز کی اس کو خبر دی گئی ہے۔ اس کی برائی (عار) سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے۔

یہ آیت برائی سے وابستہ احساس اور واردات کے اندرونی پہلو کو بیان کرتی ہے۔ اس سے یہ بات بھی فطری طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن کریم میں دوزخ کو بار بار برا ٹھکانہ کیوں کہا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ۔ (الرعد: ۲۵)

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے معاہدوں کو وعدے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور جن رشتوں کو جوڑنے کا حکم دیا گیا ہے، کاٹ ڈالتے ہیں اور زمین پر فساد کرتے ہیں، ان پر لعنت ہے اور ان کے لیے برا گھر ہے۔

قرآن کریم میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں، جہاں اس بنیادی مفہوم میں

سوء سے مراد کسی قسم کا نقصان، چوٹ، مصیبت اور ابتلاء لیا جا سکتا ہے۔ یہاں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ آیئے اب ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی اخلاقی میدان میں سوء کا لفظ کیسے استعمال ہوتا ہے۔ پہلی مثال ہم سورۂ یوسف سے لیتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں:

وما اُبرّئُ نفسیُ انَّ النّفس لَاَمّارَۃٌ بِالسُّوْءِ اِلّا ما رحم رَبّی۔ (یوسف:۵۳)

میں اپنے کو بری نہیں کرتا، کیونکہ نفس تو برائی کی طرف لے جاتا ہے، سوائے اس کے کہ میرا رب جس پر رحم کرے۔

اس آیت میں ''برائی'' کا مطلب بہت واضح ہے، یعنی دنیوی لذات میں بے قابو ہو جانا۔ اگلی آیت سے بھی بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ مذہبی میدان میں سوء کا مطلب بعینہٖ وہی ہے جو اوپر ''سیئات'' کی بحث میں مذکور ہوا۔

اِنَّمَا التَّوْبَۃُ عَلَی اللّٰہِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْءَ بِجَہَالَۃٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓئِکَ یَتُوْبُ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا۔ وَلَیْسَتِ التَّوْبَۃُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّئٰتِ، حَتّٰی اِذَا حَضَرَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْئٰنَ۔ (النساء:۱۷-۱۸)

اللہ کے لیے توبہ قبول کرنا صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو لاعلمی میں برائی کر بیٹھتے ہیں، پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جن کی طرف اللہ توجہ فرماتا ہے اور اللہ خوب جانتا ہے اور حکیم ہے۔ ایسے لوگوں کی توبہ نہیں جو برائیاں کرتے رہتے ہیں اور جب موت سامنے آ کھڑی ہوتی ہے تو کہتے ہیں، اب میں توبہ کرتا ہوں۔

اگلی آیت میں سوء کے مفہوم کو (یعنی لاعلمی میں برائی کرنا) ''اصلح'' کے بالمقابل استعمال کیا گیا ہے۔

مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْءً بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ
وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (الانعام:٥٤)

تم میں سے جو شخص لاعلمی میں برا کام کر بیٹھے، پھر وہ
اس کے بعد توبہ کر لے اور اصلاح کر لے تو اللہ تعالیٰ بہت
مغفرت کرنے والا، بڑی رحمت کرنے والا ہے۔

سوء ''ظلم النفس'' یعنی اپنی ذات پر ظلم کے مترادف بھی استعمال ہوا ہے۔
جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کفر کے بارے میں یہ قرآن کریم کی مخصوص بیانیہ ترکیب ہے۔

اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ فَاَلْقَوُا
السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ۔ (النحل:٢٨)

جن کی جان فرشتوں نے قبض کی، جبکہ وہ اپنے نفس پر
ظلم کرتے تھے، (حالتِ کفر میں تھے) تو وہ صلح کا ڈول ڈالیں
گے کہ ہم نے تو کوئی برا کام نہیں کیا، کیوں نہیں! بے شک اللہ کو
تمہارے ہر عمل کی خبر ہے۔

اگلی آیت میں سوء کا مطلب بہت واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں
پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم میں کس قسم کے فعل کو ''برا کام'' کہا گیا ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ
الْاَسْبَابَ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَ اِنِّيْ
لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا۔ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ
السَّبِيْلِ۔ (المومن:٣٦-٣٧)

اور فرعون نے کہا، اے ہامان! میرے لیے ایک بلند
عمارت بناؤ۔ شاید میں آسمان تک جانے کی راہوں تک پہنچ
جاؤں، پھر موسیٰ کے خدا کو دیکھوں اور میں تو موسیٰ کو جھوٹا ہی سمجھتا
ہوں۔ اور اس طرح فرعون کو اس کے برے عمل بھی اچھے معلوم

ہوتے تھے اور وہ سیدھے رستے سے رُک گیا تھا۔

فحشاء / فاحشہ:

فحشاء اور فاحشہ سے مراد مقررہ حدود کی خلاف ورزی، بے حساب غلط اور قابلِ مذمت کام ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ اکثر سوء کے ساتھ مرکب استعمال ہوا ہے، جس کا ذکر ہو چکا ہے۔

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطٰنِ، اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (البقرۃ:۱٦٩)

اور تم شیطان کے پیچھے پیچھے مت چلو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تمہیں برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور یہ کہ تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہو، جن کا تمہیں علم نہیں۔

مفسرین نے اس آیت میں سوء اور فحشاء میں فرق پر بہت بحث کی ہے۔ بہت کچھ لکھا گیا ہے اور مختلف آراء بیان کی گئی ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک پر بھی پوری طرح اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اس ساری بحث سے صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دونوں الفاظ اپنے عمومی مفہوم میں مترادف ہیں۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ۔ (یوسف:۲٤)

وہ عورت (عزیزِ مصر کی بیوی) ان پر مرمٹی، وہ بھی اس پر مر مٹتے اگر اُنہوں نے اپنے رب کی دلیل دیکھی نہ ہوتی۔ اس طرح ہم نے انہیں برائی اور بے حیائی سے روک دیا، بے شک وہ ہمارے برگزیدہ بندے تھے۔

سیاق سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں سوء اور فحشاء سے مراد زنا

ہے۔ اگلی مثال سے یہ مطلب اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔

لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَاءَ سَبِيْلًا۔ (بنی اسرائیل:۳۲)

زنا کے قریب بھی مت جاؤ، بلاشبہ یہ بے حیائی ہے اور برا راستہ ہے۔

لواطت کو بھی اکثر فاحشہ بتایا گیا ہے۔ ہم صرف ایک مثال دیں گے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۔ (الاعراف:۸۰)

اور لوطؑ جب اُنھوں نے اپنی قوم سے کہا، تم یہ بے حیائی کا کام کرتے ہو، جو تم سے پہلے دُنیا میں کسی نے نہیں کیا۔

سورۂ ھود میں كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّئَاتِ (وہ برے کام کرتے تھے۔ آیت ۷۸) میں قومِ لوطؑ کی اسی عادت کو ''سیئات'' بتایا گیا ہے جو کہ اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ ف ح ش اور س و ء اس قسم کے معاملات میں تقریباً ہم معنی ہیں۔

ایک اور آیت میں اپنے ہی باپ کی موت یا طلاق کے بعد اس کی بیوی سے شادی کرنے کی جاہلی رسم کی مذمت کے لیے لفظ مقت استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب ہے انتہائی قابلِ نفرت عمل۔ اس آیت میں یہ لفظ اور ''فاحشہ'' ساتھ ساتھ آئے ہیں۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ، اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا وَّسَاءَ سَبِيْلًا۔ (النساء:۲۲)

تم ان عورتوں سے نکاح نہ کرو، جن سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہو، مگر جو بات پہلے ہو چکی، وہ الگ ہے، بے شک یہ بہت بے حیائی، بے حد قابلِ نفرت اور برا طریقہ ہے۔

ایک اور آیت میں فاحشہ کے ساتھ لفظ منکر بھی استعمال ہوا ہے۔ جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ وَمَن يَتَّبِعْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ۔
(النور:٢١)

اے ایمان والو! تم شیطان کے قدم بہ قدم مت چلو۔ جو شیطان کے پیچھے پیچھے چلتا ہے، تو وہ تو بے حیائی اور قابلِ مذمت کاموں کا حکم دیتا ہے۔

اس آیت میں فحشاء کو واضح طور پر شیطان کی انگیخت بتایا گیا ہے۔شروع میں سورہ بقرہ کی آیت ۱۲۴ کا ذکر ہوا، وہ بھی اس نکتے کی تائید کرتی ہے۔ درحقیقت فاحشہ اور فحشاء کی خصوصیت ہے کہ قرآنِ کریم میں یہ الفاظ اکثر شیطان کے نام کے ساتھ آتے ہیں۔

اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا۔ (البقرة:٢٦٨)

شیطان تم سے غریبی کا وعدہ کرتا ہے اور بے حیائی کے کام کا حکم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تم سے اپنی مغفرت کا وعدہ کرتا ہے اور خوشحالی کا وعدہ کرتا ہے۔

إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ۔
(الاعراف:٢٧-٢٨)

ہم نے شیاطین کو ان لوگوں کا ساتھی بنایا جو ایمان نہیں رکھتے۔ جب وہ کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی راستے پر پایا اور اللہ نے ہم کو یہی حکم دیا ہے۔ ان سے کہہ دیجیے کہ اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم خدا کے بارے میں ایسی بات کہہ رہے ہو، جس کا تمہیں علم نہیں۔

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے تمام فحشاء کی سختی سے ممانعت کی ہے، اور انصاف اور مہربانی کا حکم دیا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْإِحْسَانِ وَإِيتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ۔ (النحل: ۹۰)

بے شک اللہ تعالیٰ انصاف، نیکی اور رشتے داروں کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور قابلِ مذمت کاموں اور ظلم کرنے سے منع کرتا ہے۔

طیب اور خبیث:

طیب اسمِ صفت ہے۔ اس کی سب سے بنیادی معنویاتی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اس خوبی کو بیان کرتا ہے جو حواس کے ذریعے معلوم ہوتی ہے۔ خاص طور پر ذائقے اور سونگھنے کی حس کو۔ چنانچہ طیب ایسی چیز ہے، جو بھلی خوشگوار اور شیریں لگے۔

چنانچہ حسب توقع یہ لفظ اکثر خوراک، پانی، خوشبو اور اسی قسم کی چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ اس کا خصوصی معنویاتی دائرہ ہے۔ تاہم یہ لفظ اس دائرے کے باہر بہت سی اور چیزوں کے لیے بولا جا سکتا ہے۔ مثلاً قرآنِ کریم میں ہمیں اس طرح کی عبارات بھی ملتی ہیں، جیسے ریح طیبہ (سازگار ہوا) جو جہاز کو سمندر پر ہموار لے جاتی ہے۔ (یونس:۲۲)، بلد طیبہ (اچھی زرخیز زمین) (الاعراف:۵۸)، مساکن طیبہ (خوشگوار مکانات) یعنی جنت کے باغوں میں مومن مردوں اور عورتوں کے آخری ٹھکانے۔ (التوبہ:۷۲)

جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے کہ جو چیزیں مختلف قسم کی ممانعت اور حرمت کا ہدف بنتی ہیں، ان میں اشیائے خوراک سرفہرست ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قرآنِ کریم نے اس کے بارے میں ''حلت'' کا ایک خصوصی تصور دیا جس کی رُو سے طیب کو حلال (جائز) سے وابستہ کر کے ''اسے ہر قسم کی حرمت سے بری'' قرار دیا۔ چنانچہ اس مخصوص حوالے سے طیب اور حلال تقریباً ہم معنی بن جاتے ہیں۔ حلال پر

بحث اگلی فصل میں ہوگی۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ۔

(المائدہ:٤)

تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا چیز حلال ہے؟

کہہ دیجیے کہ تم کو ستھری چیزیں حلال ہیں۔

وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا۔ (المائدہ:٨٨)

اور اللہ کے دیئے ہوئے میں جو چیز حلال پاکیزہ ہو، کھاؤ۔

لفظ طیب، اگرچہ اتنی کثرت سے نہیں، خاص مذہبی اخلاقی مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال مندرجہ ذیل ہے:

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ كَذٰلِكَ يَجْزِى اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ، يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ (النحل:٣١-٣٢)

وہ جناتِ عدن (عدن کے باغات) میں داخل ہوں گے جن کے نیچے دریا بہتے ہیں۔ اس طرح اللہ ڈرنے والوں کو نوازتا ہے جن کی روح فرشتے اس وقت قبض کرتے ہیں جب وہ پاک ہوتے ہیں۔ فرشتے کہتے ہیں: سلام تم پر! اپنے عمل کے بدلے جنت میں داخل ہو جاؤ۔

اس سیاق سے بہت اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں "طیب"، "متقی" کا متبادل ہے۔ علاوہ ازیں اسی صورت کی آیت ۲۸ (الذین تتوفهم ظالمی انفسهم) "فرشتے جن کی جان قبض کرتے ہیں تو اُنہوں نے اپنی جان پر ظلم کیے ہوتے ہیں) میں طیبین (ستھرے) کے متوازی اور متضاد "جنہوں نے اپنی جان پر ظلم کیا" آیا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، اس عبارت سے مراد کفار ہیں۔

الکلم الطیب (اچھی گفتگو) کی ترکیب میں جو سورہ فاطر کی آیت ۱۱ میں آئی

ہے، طیب کا یہی مفہوم ہے۔ عام طور پر اس سے مراد کلمۂ توحید ہے یعنی ''اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں۔'' بہرکیف یہ بات طے ہے کہ اس عبارت میں طیب سے مراد ''مذہبی طور پر اچھا'' یا نیک ہے کیونکہ یہ عبارت اس آیت میں العمل الصالح یعنی نیک عمل کے ساتھ استعمال ہوئی ہے۔

الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ۔

(فاطر: ۱۱)

ستھری بات اور نیک عمل اسی کی طرف چڑھتے ہیں، وہ ان کو اُٹھا لیتا ہے۔

طیب کے عین متضاد لفظ ''خبیث'' ہے۔ یہاں اب ان مثالوں کے جائزے کی ضرورت نہیں، جن میں یہ لفظ عام واقعات اور اشیاء کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ہمیں صرف ان چند مخصوص آیات پر مختصر بحث کرنا ہے، جہاں یہ لفظ مذہبی اخلاقی مفہوم میں آیا ہے۔ آیئے پہلی مثال سے شروع کرتے ہیں، جس کا تعلق اشیائے خوراک کی حلت وحرمت کے مسئلے سے ہے۔

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ۔

(الاعراف:۱۵۷)

وہ ان کے لیے پاک چیزیں حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے۔

اس آیت میں بہت واضح طور پر طیب اور خبیث کے جوڑے کو بہت اہم انداز میں حلال اور حرام کے جوڑے کے متوازی بیان کیا گیا ہے۔ ہم ابھی دیکھیں گے کہ ان میں دوسرے جوڑے کے مفہوم کا تعلق عباداتی پاکیزگی سے ہے جو نظریۂ حرمت کے دائرۂ کار میں آتا ہے۔

اگلی آیت میں طیب اور خبیث کے الفاظ، مومن اور کافر کے تضاد کی مطابقت میں آئے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ

الخبیث من الطیب ویجعل الخبیث بعضہ علی بعض فیرکمہ جمیعا فیجعلہ فی جہنم۔ (الانفال: ۳۶-۳۷)

اور جو کافر ہیں وہ دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے، تاکہ اللہ ناپاک کو پاک سے جدا کر دے اور ناپاک کو ایک دوسرے پر رکھے اور پھر سب کو ڈھیر کر دے اور پھر جہنم میں ڈال دے۔

الخبیثت للخبیثین والخبیثون للخبیثت والطیبت للطیبین والطیبون للطیبات۔ (النور: ۲۶)

گندی عورتیں گندے مردوں کے لیے ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیے، ستھری عورتیں ستھرے مردوں کے لیے اور ستھرے مرد ستھری عورتوں کے لیے ہیں۔

اگلی مثال میں خبیث کا لفظ اہلِ سدوم کی قابل مذمت عادت کے بارے میں ہے، جنھیں سوء اور فاسق لوگ کہا گیا ہے۔ یہ تمام عناصر مجموعی طور پر بہت ہی صراحت سے خبیث کے لفظ کے معنوی اجزا کو واضح کرتے ہیں[۱۳]۔

ولوطا اتینہ حکما وعلما ونجینہ من القریۃ التی کانت تعمل الخبئث انھم کانوا قوم سوء فسقین۔ (الانبیاء: ۸۴)

اور ہم نے لوطؑ کو حکم اور علم دیا اور اسے اس بستی سے بچا کر نکال دیا جو گندے کام کرتی تھی۔ بے شک وہ لوگ بڑے نافرمان تھے۔

۹۔ حرام اور حلال:

الفاظ کا یہ جوڑا ہمیں نظریۂ حرمت کی کائنات میں لے جاتا ہے۔ حرام اور حلال زبان کی ایک بہت ہی قدیم پرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ درحقیقت اس کے

ڈانڈے عباداتی پاکیزگی کے قدیم سامی تصور سے جا ملتے ہیں۔ مزید تحدید کے ساتھ کہیں تو حرام ممانعت کا نام ہے اور حلال سادہ لفظوں میں اسے کہتے ہیں جو ممانعت کے تحت نہ آتا ہو، ہر وہ چیز جس پر سے ممانعت اُٹھا کر آزاد کر دیا ہو۔ حرام کا اطلاق اشیاء، مقامات، اشخاص اور افعال سب پر ہوتا ہے اور جس چیز کو حرام کہا جائے وہ عام اشیاء کی دنیا سے الگ ہو جاتی ہے۔ اس کا درجہ بلند ہو کر موجودات کی اس خصوصی سطح پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ تقدس اور ناپاکی کے ذومعنی مفہوم میں ''حرام'' ہو جاتی ہے۔ بہرکیف یہ وہ چیز ہے، جسے نہ حاصل کیا جا سکتا ہے، نہ چھوا جا سکتا ہے۔

اس کی ایک صریح مثال یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں اگر کوئی شخص قسم اُٹھاتا کہ وہ اپنے قریبی رشتہ دار کے قتل کا انتقام لے گا تو اس کے لیے شراب نوشی اور سر دھونا حرام ہو جاتے تھے اور جب تک اس کی قسم پوری نہ ہوتی، یہ ''حرمت'' جاری رہتی۔ یہ بات تابط شرا کے مندرجہ ذیل شعر سے بہت کھل کر سامنے آتی ہے۔ تابط شرا نے یہ شعر اپنے ماموں کے قاتل سے بدلہ لینے پر کہے:

حلت الخمر و كانت حراما

وبالذی ما المت تحل (۱۴)

''اب شراب میرے لیے حلال ہوگئی ہے جو بہت مدت سے حرام تھی۔ یہ کام بہت کٹھن تھا، جس نے آخرکار اسے حلال کر دیا۔''

یہ بات نہایت اہم ہے کہ متاخرین فقہا کی کتب میں ''حرام'' کی تعریف رسمی طریقے سے ان لفظوں میں کی گئی ہے کہ ''ایسا فعل جو قانون کے نزدیک سزا کے قابل ہو۔'' جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ''ہر وہ چیز جو مطلقاً منع ہے۔'' اس لفظ کا قرآنی استعمال معنوی ارتقاء کے اس درمیانی مرحلے کو ظاہر کرتا ہے جہاں یہ لفظ حرمت کے ابتدائی تصور سے گزر کر قانونی تصور میں داخل ہوتا ہے۔ اس جاہلی تصور کی اسلامی تصورات میں شمولیت اس لیے ممکن ہوئی کہ اسلام کی رو سے اللہ تعالیٰ اپنے حکم میں مطلقاً خود مختار ہے۔ اللہ تعالیٰ کو مطلق اختیار ہے کہ وہ کسی بھی شے پر سے پابندی اُٹھا لے۔ چنانچہ جس چیز سے خدا منع کر دے، وہ حرام ہے اور اس کے برعکس حلال۔ اس

طرح حلال اور حرام کے قدیم تصور کا تعلق مشیتِ الٰہی کے اظہار کی صورت میں اللہ تعالیٰ سے گہرا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کو منع کرنے اور اس چیز کا حرام ہونے میں سبب اور مسبب کا جو براہِ راست تعلق ہے، وہ مندرجہ ذیل آیت سے بہت اچھی طرح واضح ہوتا ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ، ثُمَّ اَنْتُمْ هٰؤُلَاۗءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ، تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ۔ (البقرۃ: ۸۴-۸۵)

جب ہم نے تم سے وعدہ لیا کہ تم آپس میں خون نہیں بہاؤ گے اور اپنے لوگوں کو وطن سے نہ نکالو گے۔ تم اقرار کرتے ہو اور تم اس پر گواہ ہو، پھر اب تمہی لوگ آپس میں قتل کرتے ہو، ایک فریق کو اپنے وطن سے نکالتے ہو، ان پر ظلم سے چڑھائی کرتے ہو اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی ہو کر آئیں تو ان کا بدلہ دے کر چھڑاتے ہو، حالانکہ تم پر ان کو نکال دینا حرام کر دیا گیا تھا۔

فطری طور پر نئے پیغمبر کی آمد سے جو مشیتِ الٰہی کا نیا ترجمان ہوتا تھا، حرام اور حلال کے موجودہ نظام میں بہت سی تبدیلیاں لازمی تھیں۔ قرآنِ کریم میں حضرت عیسیٰ کی زبان سے اعلان ہوا:

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰاةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ۔ (آلِ عمران: ۵۰)

اور اپنے سے پہلی کتاب توریت کی تصدیق کرتا ہوں، اور اس لیے کہ تم کو بعض وہ چیزیں حلال کر دوں، جو تم پر حرام

نہیں۔

اسی طرح اب جب اسلام کا ظہور ہو چکا، قرآن کریم میں اعلان ہوتا ہے کہ حرمت کے تمام اسرائیلی احکام مکمل طور پر منسوخ ہو گئے اور ان کی جگہ اب نئے اور یقینا بہتر احکام آ گئے ہیں۔ چنانچہ قرآن کی رو سے بدیہی مثال یہود کے کھانے پینے کی اشیاء کے بارے میں حرمت کے احکام ہیں جو اصل میں ان کی نافرمانی کی سزا کے طور پر نافذ کیے گئے تھے۔ (الانعام:۱۴۶)

جہاں تک زمانۂ جاہلیت کے بہت سے عرب محرمات کا تعلق ہے، ان کی حیثیت اللہ تعالی پر محض افتراء (جعل سازی) کی ہے۔ (الانعام:۱۴۴) لیکن ان محرمات کو یکسر منسوخ کرنے کی بجائے قرآنِ کریم ان محرمات کی ایک ترمیم شدہ فہرست جاری کرتا ہے، جن کا اللہ کے نام سے اعلان ہوتا ہے۔

> اِنَّما حرَّم علیکُمُ المیتة والدَّم ولَحمَ الخِنزِیر وما اُهلَّ به لغیرِ اللّٰه۔ (البقرة:١٧٣)
>
> اس نے تم پر صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں، مردار، لہو، سور کا گوشت اور جس جانور پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے۔
>
> اُحِلَّ لَکُم صَیدُ البَحرِ وطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّکُم ولِلسَّیَّارَةِ وَحُرِّمَ عَلَیکُم صَیدُ البَحرِ مَا دُمتُم حُرُماً۔ (المائدہ:٩٦)
>
> تمہارے لیے دریا کا شکار اور کھانا حلال کر دیا گیا، تمہارے اور سب مسافروں کے فائدے کے لیے۔ تم پر خشکی کا شکار حرام کر دیا گیا، جب تم احرام کی حالت میں ہو(۱۵)۔

یاد رہے کہ جو لوگ حج کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں، وہ اپنے عام زندگی کے لباس اتار کر جب مخصوص مقدس لباس (احرام) پہن لیتے ہیں تو وہ خود حالتِ احرام میں آ جاتے ہیں۔ اب اُنہیں بال کاٹنے، ناخن اُتارنے اور جنسی مباشرت کی سختی سے

ممانعت ہے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ حرمت کے لیے یہ الفاظ بعض اوقات اس عام درجے سے کہیں اعلیٰ مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ خصوصاً ایسے معاملات میں جن کا تعلق براہِ راست اسلام کے بنیادی عقائد سے ہے۔ اس طرح گویا اسلام حرمت کا ایک نیا اخلاقی اور روحانی تصور تشکیل دیتا ہے جو کفر کے بہت سے مظاہر کو حرام قرار دے کر زمانۂ جاہلیت کے حرمت کے تصور کو اخلاقی مواد فراہم کرتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔

(الاعراف:۳۳)

کہہ دیجیے میرے رب نے صرف بے حیائی کی باتوں کو حرام کر دیا ہے جو ان میں کھلی ہوئی ہیں اور چھپی ہوئی ہیں۔ اور گناہ، ناحق زیادتی اور اس بات کو (حرام کر دیا ہے) کہ تم اللہ کے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کے لیے اس نے سند نہیں اُتاری اور یہ کہ تم اللہ کے ذمے ایسی باتیں لگاؤ، جن کا تمہیں علم نہیں۔

عربی زبان میں ''حرام'' کے لیے ایک اور لفظ بھی ہے جس کی قرآنِ کریم میں بھی چند مثالیں موجود ہیں۔ یہ لفظ سُحت یا سُحُت ہے۔ یہودیوں کے بارے میں جو کہتے تو تھے کہ ''ہم ایمان لے آئے'' لیکن درحقیقت وہ کفر پر ہی قائم تھے۔ اللہ تعالیٰ حضرت محمد ﷺ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

وَتَرٰى كَثِیْرًا مِّنْهُمْ یُسَارِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ، لَبِئْسَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔ (المائدہ:۶۲)

اور آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے اکثر دوڑ کر گناہ کی طرف جاتے ہیں۔ ظلم اور حرام کھانے پر لپکتے ہیں، وہ جو کام

کر رہے ہیں وہ بہت بُرے ہیں۔

اسی سورت میں ۴۲ویں آیت میں انہی یہودیوں کو اکالون للسحت یعنی حرام چیزوں کو ہڑپ کرنے والے کہا گیا ہے۔ یہاں حرام کا صحیح معنی کیا ہے۔ یہ بات یقین سے تو نہیں کہی جا سکتی۔ اگرچہ عین ممکن ہے کہ اس کا اشارہ سود کی طرف ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ سود پر قرض دینے کی ممانعت شروع میں یہودیوں کے حوالے سے ہی نازل ہوئی تھی (۱۶)۔

قرآنِ کریم کی مندرجہ ذیل آیت میں اس موقف کی تائید کرتی ہے:

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَٰتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَن سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا وَأَخْذِهِمُ الرِّبَوٰا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ۔ (النساء: ۱۶۰-۱۶۱)

چنانچہ یہود کے ظلم کی وجہ سے ہم نے ستھری چیزیں جو ان کے لیے حلال تھیں، حرام کر دیں، اس وجہ سے کہ وہ اللہ کی راہ سے بہت روکتے تھے، اور اس وجہ سے کہ وہ سود لیتے تھے، جبکہ ان کو اس سے منع کیا گیا تھا، اور اس وجہ سے کہ وہ لوگوں کا مال ناحق کھاتے تھے۔

جہاں تک حلال کا تعلق ہے، معنویاتی طور پر اس کے بارے میں کچھ زیادہ کہنے کی گنجائش نہیں ہے۔ کوئی بھی چیز جو حرام نہیں ہے، وہ حلال ہے۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ جس چیز پر سے بھی ممانعت کا حکم اُٹھا لیا جائے، وہ حلال ہے۔ اس کی چند مثالیں کافی ہوں گی۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَٰنِ۔ (البقرۃ: ۱۶۸)

اے لوگو! زمین کی چیزوں میں سے جو حلال اور پاکیزہ ہیں، وہ کھاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو۔

اس کے بعد کی اگلی چند آیات میں اس بات کو مختلف طریقے سے بیان کیا گیا

ہے۔ اس مرتبہ "حلال-طیب" کے مرکب کی جگہ صرف طیبات استعمال ہوا ہے۔

یا ایھا الذین امنوا کلوا من طیبت ما رزقنکم
واشکروا اللہ ان کنتم ایاہ تعبدون۔ (البقرۃ:۱۷۲)

اے ایمان والو! ہم نے جو رزق دیا ہے، اس میں
سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اگر تم صرف اسی کی عبادت کرتے ہو تو
اس کا شکر کرو۔

کل الطعام کان حلا لبنی اسرائیل الا ما حرم
اسرائیل علی نفسہ من قبل ان تنزل التورۃ۔ (آل
عمران:۹۳)

بنی اسرائیل کو کھانے کی سب چیزیں حلال تھیں سوائے
جن کو اسرائیل نے تورات نازل ہونے سے پہلے خود اپنے پر حرام
کر لیا تھا۔

اگلی آیت کا تعلق خاوند اور اس کی مطلقہ بیوی کے رشتہ سے ہے۔ سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ حرمت کی خلاف ورزی گناہ ہے، جس کے لیے لفظ جُناح استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کے بارے میں ہم آگے چل کر بھی بحث کریں گے۔

فان طلقھا فلا تحل لہ من بعد حتی تنکح
زوجا غیرہ، فان طلقھا فلا جناح علیھما ان یتراجعا ان
ظنا ان یقیما حدود اللہ۔ (البقرۃ:۲۳۸)

پھر اگر اس نے اس عورت کو طلاق دے دی، تو اب وہ
اس کے لیے حلال نہیں، جب تک وہ عورت اس کے علاوہ کسی
خاوند سے نکاح کرے اور پھر وہ اس کو طلاق دے دے تو دونوں
کے لیے کوئی گناہ نہیں کہ وہ پھر باہم مل جائیں اگر وہ خیال کریں
کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم رکھیں گے۔

جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ جب کسی چیز پر حرمت کا اطلاق ہوتا ہے،

تو وہ چیز اپنے عام وجود سے اوپر کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ اب یہ چیز پاکی اور ناپاکی کے اصلی دوہرے معنی میں حرام ہو جاتی ہے۔ یہ اب اچھوت یا ناقابلِ لمس ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم میں حرمت کے اس دوسرے پہلو کو رجس (گندگی) کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ لفظ ناپاکی یا گندگی کے بنیادی معنوں کو بہت ہی شدت سے ظاہر کرتا ہے۔ اس میں طبعی گھن کا شدید احساس بھی پایا جاتا ہے۔ رجس ایسی چیز ہے جس کو انسان طبعی طور پر اس کی بدبو اور گندگی کی وجہ سے شدید نفرت کرتا ہے۔

''حرام'' اور ''رجس'' کے درمیان معنویاتی تعلق کو مندرجہ ذیل آیت میں بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس میں ایسی اشیاء کا ذکر ہے جن کا کھانا مسلمانوں پر حرام ہے۔ یہاں بہت صراحت کے ساتھ سور کے گوشت کی ممانعت کی وجہ اس کی ناپاکی بیان کی گئی ہے:

> قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ۔ (الانعام:۱۴۵)
>
> کہہ دیجیے کہ اس وحی میں جو مجھ کو پہنچتی ہے، کھانے والے پر کسی چیز کو وہ کھاتا ہے، حرام نہیں پایا، سوائے مردار، بہتے ہوئے خون اور سور کے گوشت کے کہ وہ ناپاک ہے یا ناجائز ذبیحہ جس پر اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نام لیا گیا ہو۔

ایک اور آیت میں شراب، جُوا، بت اور قسمت کا حال معلوم کرنے والے تیروں کی ممانعت کی وجہ ان کی ناپاکی بیان کی گئی ہے۔

> يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (المائدہ:۹۰)
>
> اے ایمان والو! شراب، جُوا، بت اور پانسے سب شیطان کے ناپاک کام ہیں۔ ان سے بچتے رہو، تاکہ تم نجات

پاؤ۔

ہمیں اس آیت کا سورہ البقرۃ کی آیت نمبر ۲۱۶ سے بھی موازنہ کرنا چاہیے، جہاں شراب اور جوئے کو بہت بڑا گناہ (اثم) بیان کر کے ان کی مذمت کی گئی ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ (البقرۃ:۲۱۹)

آپ سے پوچھتے ہیں، شراب اور جوئے کے بارے میں۔ کہہ دیجیے ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں۔ ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑا ہے۔

ایک اور آیت میں بتوں کو ''رجس'' کہا گیا ہے:

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ۔ (الحج:۳۰)

سو بتوں کی گندگی سے بچتے رہو۔

اسی مفہوم کو ایک بیماری بھی کہا گیا ہے، جو کافروں کے دلوں کو لگ جاتی ہے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ۔ (التوبہ:۱۲۵)

اور جن کے دل میں بیماری ہے، سو ان کی گندگی بڑھا دی گئی، وہ مرنے تک کافر رہے۔

اور آخر کار کافروں کو خود رجس بیان کیا گیا ہے۔

فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ اِنَّهُمْ رِجْسٌ وَّمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ۔ (التوبہ:۹۵)

سو تم ان کو درگزر کرو، وہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔

ہم اس فصل کو ختم کرتے ہوئے ایک اور لفظ نجس کا ذکر کریں گے جو کہ رجس کا ہم معنی ہے۔ چند عرب ماہرین لغت کے نزدیک ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ رجس زیادہ تر ان چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے، جو اپنے مزاج میں پلید ہیں۔ جبکہ نجس ایسی چیزیں ہیں، جنہیں عقل یا قانون ناپاک قرار دے''[۱۷]۔

قرآن کریم میں لفظ نجس مشرکین کے حوالے سے بیان ہوا ہے، جن کو مسجد حرام کے قریب آنے سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ وہ ناپاک ہیں۔

یا ایّھا الّذین آمنوا انّما المشرکون نجسٌ فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھذا۔ (التوبہ: ۲۸)

اے ایمان والو! مشرک نجس ہیں، اس برس کے بعد انہیں مسجد حرام کے قریب مت آنے دو۔

روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے جو بعد میں دوسرے خلیفہ ہوئے، ان اوراق کو ہاتھ لگانا چاہا، جن پر قرآنِ کریم کی ایک سورہ لکھی ہوئی تھی، تو ان کی بہن حضرت فاطمہؓ نے جو اپنے خاوند کے ساتھ قرآن پڑھ رہی تھیں، انہیں ہاتھ لگانے سے روک دیا۔ یہ واقعہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے وقت کا ہے۔ حضرت فاطمہؓ اس وقت بہت پرعزم مومنہ بن چکی تھیں۔ انہوں نے اپنے بھائی سے فرمایا، میرے بھائی! تم نجس ہو، کیونکہ تم مشرک ہو۔ ان اوراق کو صرف طاہر یعنی پاک لوگ ہی ہاتھ لگا سکتے ہیں۔ روایت کے مطابق حضرت عمرؓ اٹھے، انہوں نے غسل کیا اور اب ان کی بہن نے وہ اوراق پڑھنے کی اجازت دی (۱۸)۔

اس واقعہ سے بہت اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ حرمت کا تصور کیا تھا اور پاکی اور ناپاکی کے تصورات کس طرح اس سے تعلق رکھتے ہیں۔

گناہ:

اس آخری فصل میں ہم اُن کلیدی اصطلاحات پر بحث کریں گے، جو خطاب کے دوسرے درجے میں آتی ہیں، جن کا کام ہے کہ وہ مذہبی طور پر برے افعال کو ترتیب دیں۔ ان کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ افعال اخلاقی اور الہامی قانون کی خلاف ورزی پر مشتمل ہیں۔ لہٰذا اس دنیا میں اور آخرت میں سخت سے سخت سزا کے حقدار ہیں۔

ا۔ ذنب:

قرآنِ کریم میں یہ لفظ بکثرت ایسے قبیح گناہوں کے بارے میں آیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے خلاف سرزد ہوتے ہیں۔ مثالوں سے اس نکتے کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

تکذیب ذنب ہے:

اُولٰٓئِکَ ھُمْ وَقُوْدُ النَّارِ کَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا فَاَخَذَھُمُ اللّٰہُ بِذُنُوْبِھِمْ۔ (آلِ عمران: ۱۱)

اور وہی ہیں دوزخ کا ایندھن، جیسے آلِ فرعون کا دستور تھا، اور ان سے پہلوں کا بھی کہ وہ ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے پھر ان کے گناہوں پر ان کی پکڑ کی۔

جیسا کہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تکذیب یعنی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو جھٹلانا کفر کا ایک مخصوص اظہار ہے۔ درحقیقت یہ لفظ سورۂ انفال کی آیت نمبر ۵۲ میں کفر کے متبادل کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جب کہ باقی الفاظ بعینہٖ اسی طرح ہیں جس طرح اوپر کی آیت میں۔

کَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَاَخَذَھُمُ اللّٰہُ بِذُنُوْبِھِمْ۔ (الانفال: ۵۲)

جیسے آلِ فرعون کا دستور تھا اور ان سے پہلوں کا بھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے پھر ان کے گناہوں پر ان کی پکڑ کی۔

''کفر''، ''ذنب'' ہے:

فَاَخَذَھُمُ اللّٰہُ بِذُنُوْبِھِمْ وَمَا کَانَ لَھُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ وَّاقٍ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَانَتْ تَّاْتِیْھِمْ رُسُلُھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَکَفَرُوْا فَاَخَذَھُمُ اللّٰہُ۔ (المومن: ۲۱-۲۲)

پھر اللہ نے ان کے گناہوں پر اُنہیں پکڑا اور ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ یہ اس لیے کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی نشانیاں لے کر آتے تھے، پھر وہ انکار کرتے تھے۔ پھر اللہ نے ان کی پکڑ کی۔

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ۔ (الملک: ۱۰-۱۱)

وہ کہیں گے اگر ہم سنتے اور سمجھتے تو دوزخ میں نہ ہوتے۔ سو اُنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا۔

اس آیت میں لفظ کفر استعمال نہیں ہوا، لیکن یہ بات واضح ہے کہ حوالہ اسی کی طرف ہے۔ ذیل کی آیت میں لفظ استکبار (غرور کی وجہ سے اپنے کو بڑا سمجھنا) کفر کے بجائے استعمال ہوا ہے اور اسے ذنب قرار دیا گیا ہے۔

وَقَارُوْنَ وَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ۔ (العنکبوت: ۳۹-۴۰)

اور قارون اور فرعون اور ہامان، موسیٰ ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے۔ وہ زمین پر بڑائی دکھانے لگے اور جیت نہیں سکتے تھے پھر ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ پر پکڑ لیا۔

کفر اور ذنب کے درمیان جو قریبی رابطہ ہے، وہ اس طرح بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ ذنب پر جہنم کی آگ کی سزا لازم ٹھہرائی گئی ہے۔

وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (آل عمران: ۱۵-۱۶)

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیکھتا ہے جو کہتے ہیں، اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے، سو ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔

ذنب فاحشہ اور ظلم کا مجموعہ ہے:

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔ (آلِ عمران: ۱۳۴-۱۳۵)

اللہ تعالی نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور جو لوگ جب کوئی کھلا گناہ کر بیٹھیں یا اپنے ساتھ ظلم کر بیٹھیں تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو معاف کرنے والا ہے اور وہ اپنے کیے پر اڑتے نہیں اور وہ جانتے ہیں۔

فاسق کا گناہ:

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفَاسِقُوْنَ۔ (المائدہ: ۴۹)

اور اگر وہ نہ مانیں تو جان لو کہ اللہ یہی چاہتا ہے کہ ان کے بعض گناہوں پر اُنہیں سزا دے اور لوگوں میں سے اکثر فاسق ہیں۔

ذنب اور سیئہ:

رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ۔ (آلِ عمران: ۱۹۳)

اے ہمارے رب! ہم نے سنا کہ ایک پکارنے والا پکارتا ہے ایمان کی طرف کہ تم اپنے رب پر ایمان لے آؤ، سو ہم ایمان لے آئے۔ پس ہمارے گناہ معاف کر دے اور ہماری

سزائیں دور کر دے اور ہمیں نیک لوگوں کی موت دے۔

بیضاوی کے بقول ذنوب اور سیّات میں یہ فرق ہے کہ ذنب سے مراد کبیرہ گناہ ہیں اور سیئہ سے مراد صغیرہ گناہ۔ اس تفسیر کی قرآن کریم کی سورہ النساء آیت نمبر ۳۵ سے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، بخوبی تائید ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ اگر تم ان کبائر سے اجتناب کرو جن کی ہم نے ممانعت کی ہے تو ہم تمہارے برے کاموں سے درگزر کریں گے۔ عین ممکن ہے کہ مفسرین کے ذہن میں یہ تعبیر اسی آیت سے آئی ہو۔

ذنب، خطیہ:

واستغفری لذنبک انک کنت من الخطئین۔

(یوسف: ۲۹)

تو اپنے گناہ کے لیے معافی طلب کر، بے شک تو ہی خطا کار تھی۔

یہ الفاظ عزیز مصر نے اپنی بیوی سے کہے، جس نے حضرت یوسف کو صحیح راستے سے ہٹانے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہی۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ جو لوگ اس طرح کے ذنب کا ارتکاب کرتے ہیں، انہیں خاطئین کہا گیا ہے۔ یہاں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ذنب اور خطا دونوں ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ خطیہ پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔

۲۔ اثم:

اس لفظ کے بنیادی معنی کے بارے میں علماء نے مختلف آراء کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً محیط المحیط میں اس کی یوں تعریف کی گئی ہے کہ یہ ممانعت کی خلاف ورزی کا نام ہے۔ یعنی ایسا کام کرنا جس کی اجازت نہیں ہے۔ مفسر البیضاوی لکھتے ہیں کہ اثم ایسا ذنب ہے جو سزا کے مستوجب ہے۔ (بیضاوی، سورہ ۶۹، آیت ۱۲) دوسرے علماء کے نزدیک اثم ایسے ممنوع کام کے کرنے کو کہتے ہیں، جس میں نیت شامل ہو، جبکہ ذنب ایسا کام ہے، جس میں نیت کا شامل ہونا یا نہ ہونا دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔ یہ اختلاف

رائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اس لفظ کی تعریف تقریباً ناممکن ہے۔ اس کے معنی بہت مبہم ہیں اور کسی حد تک ناقابل گرفت۔ چنانچہ ہم اس بحث میں اس لفظ کا صرف جائزہ لے سکتے ہیں کہ یہ مختلف سیاق وسباق میں کیسے استعمال ہوا ہے۔

قرآن کریم میں لفظ اثم کے استعمال کے بارے میں پہلی قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ لفظ عام طور پر احکامی آیات میں مذکور ہے۔ مثلاً لین دین کے معاملات میں قرض کی صورت میں صحیح راستہ بیان کرتے ہوئے کہا گیا:

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ۔

(البقرۃ:۲۸۳)

اور گواہی کو مت چھپاؤ، جو شخص اسے چھپاتا ہے تو بے شک اس کا دل گنہ گار ہے۔

اگلی آیت وصیت کے بارے میں قواعد سے تعلق رکھتی ہے:

فَمَن بَدَّلَهُ بَعْدَمَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ فَمَنْ خَافَ مِن مُّوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ، إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ۔

(البقرۃ:۱۸۱-۱۸۲)

پھر جو کوئی (وصیت) سننے کے بعد اسے بدل ڈالے تو اس کا گناہ انہی پر ہے جنہوں نے اسے بدل ڈالا۔ بے شک اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ پھر جس کسی کو وصیت کرنے والے سے طرفداری کا خوف ہو یا گناہ کا ڈر ہو، پھر وہ ان میں صلح کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اسی طرح ایک اور آیت میں جہاں ایسے لوگوں کی شرائط بیان کی گئی ہیں، جو وصیت کے وقت قانونی گواہ بن سکتے ہیں۔ یہ واضح کیا گیا ہے کہ اگر وہ اپنی گواہی دیانت داری سے نہیں دیتے تو یہ اثم ہے۔ درج ذیل آیت میں حلف کے الفاظ بیان

ہوئے ہیں جو گواہ قسم اُٹھاتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ بے انصافی سے کام نہیں لے گا۔

لَا نَشْتَرِیْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ۔ (المائدہ:۱۰۶)

ہم اس (قسم) کی قیمت نہیں لیں گے، اگرچہ ہمیں کسی سے قرابت بھی ہو اور ہم اللہ کی گواہی نہیں چھپائیں گے، کیونکہ تب تو بے شک گناہ گار ہوں گے۔

اگلی آیت میں اپنی بیوی پر غلط الزام لگانے کے فعل کا ذکر ہے جس کا مقصد بیوی کو پہلے دی ہوئی دولت واپس لینا ہے۔ اس حکم کو بھی کھلا اثم قرار دیا گیا ہے۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا۔ (النساء:۲۰)

اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم ایک کو بہت سا مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی نہ لو۔ کیا تم بہتان اور صریح گناہ سے اسے لینا چاہتے ہو۔

گواہی چھپانا بھی اثم ہے، جیسا کہ ایک اور آیت میں ایک قطعاً مختلف صورتِ حال بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا۔ (الاحزاب:۵۸)

جو لوگ مسلمان مردوں اور عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، جنہوں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا تو اُنہوں نے بہتان کا اور صریح گناہ کا بوجھ اُٹھایا۔

اگلی آیت میں اثم سے مراد ناجائز طور پر دوسروں کی دولت کو ہڑپ کرنا ہے۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى

الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (البقرۃ:۱۸۸)

آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق مت کھاؤ اور اس کو حاکموں تک نہ پہنچاؤ کہ تم لوگوں کے مال کا حصہ گناہ کے ساتھ کھا جاؤ جب کہ تمہیں معلوم بھی ہو۔

اثم کے استعمال کے بارے میں دوسرا قابلِ ذکر نکتہ یہ ہے کہ یہ حرام کے تعلق سے بھی استعمال ہوا ہے۔ دوسرے الفاظ میں حرمت کی خلاف ورزی بھی اثم کہلاتی ہے۔ ان چیزوں کے ذکر کے بعد جن کا کھانا حرام ہے (سور، خون اور اللہ کے سوا دوسروں کے نام پر قربان کی گئی اشیاء)، یہ آیت آتی ہے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (البقرۃ:۱۷۳)

پھر جو کوئی مجبور ہو جائے لیکن نہ تو نافرمانی کرے، نہ زیادتی تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا اور نہایت مہربان ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ (البقرۃ:۲۱۹)

تم سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دیجیے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں اور ان کا گناہ فائدے سے بڑا ہے۔

تیسرے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ لفظ اثم کا اطلاق کفر کی بعض صورتوں پر بھی کیا گیا ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْا اِثْمًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۔ (آلِ عمران:۱۷۸)

اور کافر یہ نہ سمجھیں کہ ہم جو مہلت دیتے ہیں، اس
میں ان کی بھلائی ہے۔ ہم ان کو مہلت اس لیے دیتے ہیں کہ وہ
گناہ میں بڑھتے جائیں اور ان کے لیے خوار کرنے والا عذاب
ہے۔

اسی طرح ''اثم'' کا تعلق شرک اور افتراء الکذب (جھوٹ) سے بھی ہے۔

ومن یشرك باللہ فقد افتری اثما عظیما۔ (النساء:۴۸)

جس نے اللہ کا شریک ٹھہرایا تو اس نے بہت بڑا گناہ افتراء کیا۔

انظر کیف یفترون علی اللہ الکذب وکفی به
اثما مبینا۔ (النساء:۴۹)

دیکھو اللہ پر کیسا جھوٹ باندھتے ہیں اور یہی کھلا گناہ
کافی ہے۔

اس ضمن میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ دوزخ کے درخت زقوم کو جس کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ یہ دوزخ میں کافروں کی مخصوص غذا ہوگی، قرآن کریم میں اثیم (گنہگار) کا درخت بتلایا گیا۔ گویا اثیم (گناہگار) کا بالواسطہ معنی کافر کے سوا کوئی اور نہیں۔

ان شجرة الزقوم طعام الاثیم کالمهل یغلی فی
البطون کغلی الحمیم۔ (الدخان:۴۳-۴۶)

یقینا زقوم کا درخت گناہگار کا کھانا ہے، جیسے پگھلا ہوا
تانبا پیٹوں میں کھولتے ہوئے پانی کی طرح کھولتا ہے۔

خطیئہ:

ذیل کی آیت سے صریح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ خطیئہ کے بھی تقریبا وہی معنی ہیں جو اثم کے ہیں۔

ومن یکسب خطیئة او اثما ثم یرم به بریئا فقد

احتمل بُهتانا وّاِثما مُبينا۔ (النساء:۱۱۲)

اور جو کوئی خطا یا گناہ کرے پھر کسی بے گناہ پر تہمت لگا دے تو اس نے بہتان اور بہت بڑا گناہ اپنے سر لے لیا۔

حسب دستور مفسرین نے ان دونوں الفاظ کے درمیان فرق واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً بیضاوی کے نزدیک خطیہ صغیرہ گناہ ہے جو بلا ارادہ سرزد ہو اور اثم کبیرہ گناہ ہے جو ارادتاً کیا گیا ہو۔ قرآنِ کریم کی لغات اس تفریق کی صریحاً تردید کرتی ہیں۔ قرآنِ کریم میں خطیہ کا لفظ زیادہ تر شدید مذہبی گناہوں کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔ مندرجہ ذیل آیت سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے۔

قال نُوحٌ رّبّ انّهم عصوني واتّبعوا من لّم يزده
مالُهٗ وولدُهٗ الّا خسارا ومكروا مكرا كُبّارا وقالوا لا تذرُنّ
الهتكُم ولا تذرُنّ ودّا وّلا سُواعا وّلا يغوث ويعوق ونسرا
وقد اضلُّوا كثيرا وّلا تزد الظّلمين الّا ضلالا ممّا خطيئتهم
اُغرِقُوا فاُدخِلُوا نارا۔ (نوح:۲۱–۲۵)

حضرت نوحؑ نے کہا، اے رب، ان لوگوں نے میرا کہا نہیں مانا اور ایسے کا کہنا مانا جس نے اس کے مال اور اولاد میں گھاٹے کے سوا کوئی فائدہ نہیں دیا۔ اور انہوں نے بہت بڑا داؤ کیا۔ اور انہوں نے کہا، اپنے معبودوں کو نہ چھوڑو اور ود، سواع اور یعوق اور نسر کو نہ چھوڑو اور انہوں نے بہکا دیا۔ اور ظالموں کو گمراہی کے سوا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ان میں سے کچھ اپنی خطا کی وجہ سے غرق کر دیئے گئے اور پھر آگ میں ڈال دیئے گئے۔

اس آیت سے بہت ہی واضح طور پر اس لفظ کے معنی پتہ چلتے ہیں۔ اگلی آیت میں خاطی (یعنی جس سے خطا سرزد ہو) واضح طور پر لفظ کافر کے بدل کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ
ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ
وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا
حَمِيْمٌ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ لَّا يَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ۔
(الحاقہ: ۳۰-۳۷)

اس کو پکڑو، پھر اسے طوق ڈالو، پھر اسے آگ کے ڈھیر میں ڈال دو۔ پھر ایک زنجیر میں جو ستر گز لمبی ہو اسے جکڑ دو۔ یہ وہ ہے جو اللہ پر، جو بہت بڑا ہے، ایمان نہیں لاتا تھا اور مسکین کو کھانا کھلانے کی تاکید نہیں کرتا تھا۔ آج اس کا یہاں کوئی حمایتی نہیں۔ اس کا کھانا زخموں کے دھوون کے سوا کچھ نہیں، جسے صرف خطا کار کھاتے ہیں۔

ذیل میں ایک اور مثال سے واضح ہوتا ہے کہ خطا لازماً کفر کے اعمال کے لیے بولا گیا ہے۔

وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ
فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً۔ (الحاقہ: ۹-۱۰)

اور فرعون، اس سے پہلے لوگ اور الٹ دی جانے والی بستیاں خطائیں کرتے آئے۔ انہوں نے اپنے رب کے رسول کی نافرمانی کی، پھر اللہ نے ان کو سخت پکڑ سے پکڑ لیا۔

ایک اور آیت میں زمانۂ جاہلیت کی اس رسم کو بھی خطا کہا گیا ہے، جس کی رو سے لوگ غریبی کے ڈر سے اپنے بچوں کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ اس کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ
وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْـًٔا كَبِيْرًا۔ (بنی اسرائیل: ۳۱)

اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ انہیں اور

تمہیں ہم ہی رزق دیتے ہیں۔ ان کا قتل بہت بڑی خطا ہے۔

یہاں خطا کی جگہ دوسرے الفاظ مثلاً ذنب اور اثم بھی بہت آسانی سے استعمال ہو سکتے تھے اور ان سے معنی پر بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ اس ضمن میں یہ بات اہم ہے کہ ایک اور آیت میں ذنب اور خطا ساتھ ساتھ ایک ہی برائی کے فعل کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ یہ آیت سورہ یوسف میں ہے اور یہاں گناہ سے مراد وہ سازش ہے جو حضرت یوسف کے بھائیوں نے ان کے خلاف کی تھی، جب وہ بچے تھے اور اب اس پر پچھتا رہے تھے۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِــٕيْنَ۔ (یوسف:۹۷)

وہ کہنے لگے، اے ہمارے باپ! ہمارے گناہوں کی ہمارے لیے معافی کی درخواست کر، بے شک ہم خطا کار تھے۔

ہم ایک اور مثال خطا اور سیئہ کے درمیان قریبی تعلق کے ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً، قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۤـــَٔتُهٗ فَاُولٰۤىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ (البقرۃ:۸۰–۸۱)

اور وہ کہتے ہیں کہ ہم کو آگ صرف چند گنے چنے دن لگے گی۔ کہہ دو کیا تم نے اللہ کے ہاں عہد لیا ہوا ہے کہ اب اپنے عہد کے خلاف نہیں کرے گا، یا تم اللہ پر ایسا جھوٹ بول رہے ہو، جو تم نہیں جانتے۔ کیوں نہیں جس نے گناہ کیا اور اس کی خطا نے اسے گھیر لیا تو وہ دوزخ میں جانے والے لوگ ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

جرم:

جرم یقیناً ذنب کا ہم معنی ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اکثر اسم فاعل کے صیغے کے طور پر یعنی لفظ مجرم کے ساتھ آیا ہے جس سے اکثر و بیشتر کفر مراد ہے۔ مندرجہ ذیل آیات کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔

تکذیب جرم ہے:

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ وَّ لَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ۔ (الانعام:۱۴۷)

اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے کہ تمہارا رب بہت وسیع رحمت والا ہے، اور اس کا عذاب مجرموں کی قوم سے ٹلنے والا نہیں۔

استکبار جرم ہے:

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ۔ (الجاثیہ:۳۱)

اور جن لوگوں نے انکار کیا، کیا تمہارے سامنے میری آیت پڑھی نہیں جاتی تھیں، پھر تم نے غرور کیا اور تم لوگ مجرمین کی قوم بن گئے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُجْرِمِيْنَ۔ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الظّٰلِمِيْنَ۔ (الاعراف: ۴۰، ۴۱)

بے شک جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان کے مقابلے میں تکبر کیا، ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں

کھولے جائیں گے اور جب تک اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ گھس جائے وہ جنت میں داخل نہ ہوں گے۔ ہم مجرمین کو یونہی بدلہ دیتے ہیں۔ ان کے لیے بچھونا اور اوڑھنا دوزخ ہے اور ہم ظالموں کو یونہی بدلہ دیتے ہیں۔

مجرم لوگوں کا مومنین کے بارے میں تکبر کا جو خصوصی رویہ ہے، ذیل کی آیت میں اس کی تصویر کشی بہت واضح طور پر کی گئی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ آمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ وَاِذَا مَرُّوْا بِہِمْ یَتَغَامَزُوْنَ وَاِذَا انْقَلَبُوْا اِلٰی اَھْلِہِمُ انْقَلَبُوْا فَکِہِیْنَ وَاِذَا رَاَوْھُمْ قَالُوْا اِنَّ ھٰؤُلَاءِ لَضَالُّوْنَ۔ (المطففین: ۲۹-۳۲)

بے شک وہ لوگ جنہوں نے جرم کیا، وہ ایمان والوں پر ہنسا کرتے تھے، جب ان کے پاس سے گزرتے تو آپس میں آنکھ مارتے اور جب لوٹ کر گھر جاتے تو پھر باتیں بنانے لگتے اور جب ان کو دیکھتے تو کہتے یقیناً یہ لوگ بہک گئے ہیں۔

نفاق جرم ہے:

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ کَفَرْتُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَائِفَۃٍ مِّنْکُمْ نُعَذِّبْ طَائِفَۃً بِاَنَّہُمْ کَانُوْا مُجْرِمِیْنَ۔ (التوبہ: ۶۶)

بہانے مت بناؤ، تم نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا۔ اگر ہم تم میں سے کچھ کو معاف بھی کر دیں تو بعض کو عذاب دیں گے کیونکہ وہ مجرم تھے۔

افتراء الکذب جرم ہے:

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ کَذَّبَ

بِاٰیٰتِهٖ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ۔ (یونس:۱۰)

اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹا بہتان لگائے
یا اس کی آیات کو جھٹلائے۔ بے شک مجرم فلاح نہیں پاتے۔

اسی طرح کی مثالیں کثرت سے دی جا سکتی ہیں، لیکن فی الحال ہمارے مقصد کے لیے اتنی مثالیں کافی ہیں۔

حرج / جُناح:

یہ دونوں الفاظ اثم کے قریب قریب ہم معنی ہیں اور اکثر قرآنِ کریم میں احکامی آیات میں استعمال ہوئے ہیں۔ بظاہر اس کا معنی وہ جرم یا گناہ ہے جو سزا کا مستوجب ہے۔

لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ۔
(البقرۃ:۱۹۸)

اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل
تلاش کرو (یعنی ایامِ حج میں تم تجارت کے ذریعے منافع حاصل
کر سکتے ہو)۔

یہ بات کہ جُناح اثم کے ہم معنی ہے، اس طرح بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اگلی چند آیات میں یہی لفظ یعنی اثم ایسے ہی سیاق میں جُناح کی جگہ استعمال ہوا ہے۔

وَاذْکُرُوا اللّٰهَ فِیْ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ
یَوْمَیْنِ فَلَا اِثْمَ عَلَیْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَا اِثْمَ عَلَیْهِ لِمَنِ اتَّقٰی۔
(البقرۃ:۲۰۳)

گنتی کے چند دنوں میں اللہ کو یاد کرو، پھر جو کوئی دو
دن جلدی چلا گیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو ٹھہر گیا تو جو ڈرتا
ہے اس پر کوئی گناہ نہیں۔

نکاح اور طلاق کے احکام کے ضمن میں لفظ جُناح زیادہ کثرت سے استعمال

ہوا ہے۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل دو مثالیں کافی ہیں:

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ
أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ۔ (البقرہ:۲۳۵)

اور تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم ان عورتوں کو اشارہ میں
نکاح کا پیغام بھیج دو، یا اپنے دل میں پوشیدہ رکھو۔

تُرْجِي مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِي إِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ وَمَنِ
ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ۔ (الاحزاب:۵۱)

(اے محمدؐ!) تم ان میں سے جسے چاہو، پیچھے رکھ دو اور
جسے چاہو اپنے پاس جگہ دو۔ اور جنہیں تم نے ایک طرف کر دیا
تھا، ان میں سے جس کو تم چاہو، تم پر کوئی گناہ نہیں۔

اگلی آیت میں ہنگامی ضرورت کے پیشِ نظر نمازِ عصر کو قصر پڑھنے کا حکم ہے:

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ
تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا۔
(النساء:۱۰۱)

اور جب تم ملک میں سفر کرو تو اگر تمہیں ڈر ہو کہ کافر
تمہیں ستائیں گے تو تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم نماز کو کم کر لو۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى
الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يُنْفِقُونَ حَرَجٌ إِذَا نَصَحُوا لِلّٰهِ وَرَسُولِهِ۔
(التوبہ:۹۱)

ضعیفوں، بیماروں اور ان لوگوں پر کوئی گناہ نہیں، جن
کے پاس خرچ کرنے کو کچھ نہیں جب وہ اللہ اور اس کے رسول
کے ساتھ دل سے صاف ہوں۔

زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي
أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُولًا

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ۔ (الاحزاب:
۳۷-۳۸)

ہم نے اسے تمہارے نکاح میں دے دیا تاکہ
مسلمانوں پر اپنے لے پالکوں کی بیویوں سے نکاح کرنا گناہ نہ
رہے، جب وہ ان سے اپنی غرض پوری کر چکیں اور اللہ کا حکم تو بجا
لانے کے لیے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے نبی پر جو فرض کر دیا ہے،
اس میں کوئی حرج نہیں۔

اس باب میں ہم نے قرآن کریم کی ان اصطلاحات پر بحث کی ہے جو معنی کے اعتبار سے ''اچھے'' یا ''برے'' کے مفہوم میں استعمال ہوئی ہیں۔ ان آیات پر غور کرنے سے صراحت سے یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے کہ قرآنِ کریم میں نیک و بد کے بارے نظری تصورات پوری طرح تشکیل یافتہ نہیں ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ان میں سے بعض الفاظ اخلاقی اقدار کی درجہ بندی کے لئے نہیں بلکہ کسی فعل کی صفت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً حرام، حلال اور رجس ایسے الفاظ ہیں جو بعض افعال کی صرف صفت بیان کرتے ہیں۔ اگر وہ قدر بیان بھی کرتے ہیں تو بالواسطہ بیانیہ انداز میں۔ اسی طرح فاحشہ اور فساد بھی بنیادی طور پر توصیفی ہیں۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم نے اس باب میں جن الفاظ سے بحث کی ہے، ان میں سے بعض ایسے ہیں جو توصیف کے بجائے درجہ بندی بیان کرتے ہیں۔ صالح بڑی حد تک بیانیہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ درجہ بندی بھی کرتا ہے۔ سیئہ اور حسنہ جیسے الفاظ بیانیہ سے زیادہ درجہ بندی کرتے ہیں۔ باب کے آخر میں ہم نے جن الفاظ سے بحث کی ہے وہ تو یقیناً اخلاقی لغات کے دوسرے درجے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس سے قبل ہم نے ایک باب میں کفر اور ذنب کے موازنے کے ذریعے بھی اسی نکتے کی وضاحت کی تھی۔ کفر بہت واضح طور پر بیانیہ ہے جبکہ ذنب کا کام کفر کے معنوی مشتملات کی درجہ بندی کرنا ہے، تاکہ اسے قابلِ مذمت اور قابلِ سزا اعمال کا

درجہ دے سکے۔

ہم نے شروع میں کہا تھا کہ قرآنِ کریم کے دینی اخلاقی تصورات کا نظام لسانی سطح پر زبان کے پہلے مرحلے کے عمل پر مبنی ہے۔ زبان کے دوسرے درجے میں انتہائی منظم شکل میں ان تصورات کی نشوونما جنہیں ہم "پانچ قانونی مدارج"(۱۹) کے نام سے جانتے ہیں، بعد کے فقہا کی کوششوں سے وجود میں آئی ہے۔ تاہم ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ خود قرآن میں ثانوی درجے کے اخلاقی تصورات کے مربوط نظام پر مشتمل ایک اعلیٰ ڈھانچہ موجود ہے، خواہ وہ سادہ ہی کیوں نہ ہو۔

حواشی:

(۱) معروف، منکر اور خیرات کا تجزیہ آئندہ صفحات میں آئے گا۔

(۲) ظاہر ہے کہ یہاں حرمت کے اس رواج کی طرف اشارہ ہے جو قبلِ اسلام جاہلیت میں عام تھا۔ اس کی بہت سی وجوہات بیان کی گئی ہیں، مثلاً ایک توجیہ یہ ہے کہ جب کوئی عرب کسی چیز کی تلاش میں نکلتا، لیکن ناکام لوٹتا تو وہ گھر میں یا خیمے میں سامنے کے بجائے پیچھے سے داخل ہوتا تاکہ اپنے آپ کو نحوست کے اثر سے بچا سکے۔ (شریف المرتضیٰ، امالی، جلد اوّل، ص ۳۷۷)

(۳) یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہیں کہ ناپ تول میں انصاف کو آسمانی میزان کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ انصاف کا ترازو، جو روزِ حساب کام میں آئے گا۔ "ہم روزِ حساب انصاف کا ترازو قائم کریں گے تاکہ کسی پر ذرا سا بھی ظلم نہ ہو۔ حتیٰ کہ اگر یہ رائی کے دانے کے برابر بھی ہے تو ہم اسے سامنے لائیں گے۔ ہم مطلق حساب رکھنے والے ہیں۔" (۲۱:۴۷)

(۴) اس تصور کا تجزیہ آئندہ صفحات میں آئے گا۔

(۵) ملاحظہ ہو آئندہ فصل۔

(۶) مثلاً دیکھیے، تفسیر بیضاوی، سورۃ البقرۃ، آیت ۲۳۲۔

(۷) روبن لیوی، دی سوشل سٹرکچر آف اسلام (کیمبرج، ۱۹۵۷ء)، ص ۱۹۴۔

(۸) ابوتمام، حماسہ، ج ۳، ص ۲۴۔

(۹) بالکل اسی طرح معروف کی جگہ عرف کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے۔ "عرف" اور "نکر" معروف اور منکر کی طرح الفاظ کا جوڑا ہیں۔ جاہلی شاعری سے ایک مثال درج ذیل ہے:

اهل الحلوم اذا الحلوم هفت

والعرف فی الاقوام والنکر

''یہ صحیح فیصلہ کرنے والے لوگ ہیں جب کہ دوسرے لوگ ایسے وقت میں فیصلہ کرنے کی اہلیت کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ لوگ سارے قبائل میں اور غیرمعروف (دشمن) لوگوں میں عرف کے لیے پہچانے جاتے ہیں۔''

(حران بن عمرو بن عبدمنات، ابوتمام، حماسۃ، ج ۳، ص ۳۴)

(۱۰) کمال الدین احمد البیاضی، اشارات المرام من عبارات الامام (قاہرہ، ۱۹۴۹ء)، ص ۳۱۰۔

(۱۱) ایضاً، ص ۱۲۹۔

(۱۲) دیکھیے: بطرس البستانی، محیط المحیط، جلد دوم، صفحہ ۱۰۲۱۔

(۱۳) زمانۂ جاہلیت میں یہ لفظ ایک اخلاقی قدر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس مثال میں عنترہ کا مندرجہ ذیل شعر ہے:

یعیبون لونی بالسواد وانما
فعالهم بالخبث اسود من جلدی

(دیوان عنترہ، ص ۶۲)

یعنی یہ لوگ میرے کالے رنگ کو عیب شمار کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ان کے اپنے کرتوت اتنے گندے ہیں کہ میرے رنگ سے کہیں زیادہ سیاہ ہیں۔

(۱۴) ابوتمام، دیوان الحماسۃ: شرح الخطیب التبریزی، قاہرہ (۱۹۵۵ء)، ج ۲۱/۱ (تحقیق محمد علی عزام)

(۱۵) سورۃ المائدہ کی آیت نمبر تین میں زیادہ مکمل فہرست ہے۔ (مترجم)

(۱۶) دیکھیے: منٹگمری واٹ، ''محمد ایٹ مدینہ''، (آکسفورڈ، ۱۹۹۶ء)، ص ۲۹۶، ۲۹۷۔

(۱۷) البستانی، محیط المحیط، ج ۱، ص ۵۵، بحوالہ کلیات۔

(۱۸) ابن اسحاق، سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۲۲۶۔

(۱۹) حرام، حلال، مباح، مکروہ، مندوب۔

نتائجِ بحث

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تو اس کا عنوان تھا، ''قرآن میں اخلاقی اصطلاحات کا نظام'' (The Structure of Ethical Terms in the Quran) نظام یا ڈھانچے سے ہماری مراد ''معنویاتی نظام'' ہے۔ ہر کلیدی تصور کا نہ صرف اپنا مخصوص نظامِ دلالت ہوتا ہے، بلکہ ان کلیدی تصورات کی مجموعی عمارت کا خود بھی کم و بیش مستقل اور مکمل ڈھانچا ہوتا ہے۔ گویا ایک نظام کے بہت سے ذیلی نظام ہوتے ہیں۔

اس ڈھانچے کے خیال کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ ہر لسانی نظام دراصل بہت سے تصورات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ایک جانب تو یہ تصورات آپس میں مربوط ہوتے ہیں اور دوسری جانب یہ سب مل کر وہ تصورِ کائنات تشکیل دیتے ہیں جو اس زبان کے بولنے والوں سے مخصوص ہوتا ہے اور ان میں مشترک بھی۔ چنانچہ عربی زبان کا اسی طرح کا ایک مخصوص لسانی نظام ہے اور قرآنی عربی زبان کا اپنا۔ دلالت کے اعتبار سے قرآنی عربی قرآن کے تصورِ کائنات کی عکاسی کرتی ہے۔ قرآنی عربی زبان کا تصورِ کائنات قدیم عربی زبان کے وسیع تر تصورِ کائنات کا ایک حصہ ہے۔ عین اسی طرح قرآنی اخلاقیات لغات قرآن کے مجموعی تصورِ کائنات کا ایک حصہ ہے۔ مذہبی اخلاقیات کی لغات ایک ایسا ذیلی نظام ہے جو قرآن کے اخلاقی تصورِ کائنات میں قریب قریب مستقل اور جدا حیثیت رکھتا ہے۔

ہم نے اس کتاب میں جن اصطلاحات کا تجزیہ نہیں کیا ہے۔ ان میں سے

ہر ایک کا ایک مخصوص مفہوم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اُس مذہبی اخلاقیاتی نظام سے مربوط ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ ایک مرتبہ ہم الفاظ کے معانی کو اس پہلو سے سمجھنا شروع کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صرف لغت کی کتابیں دیکھنے سے یہ معانی معلوم نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے ایک طریقِ تحقیق وضع کرنا ضروری ہے جس سے یہ مشاہدہ کرنا ممکن ہو کہ کلیدی اصطلاح جب ایک مخصوص سیاق میں استعمال ہوتی ہے تو وہ اپنا مفہوم کیسے ادا کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں طریقِ تحقیق کے لیے لازمی ہے کہ وہ قرآنی اصطلاحات کو اپنا مفہوم خود بتانے دے۔

کتاب کے پہلے حصے میں ہم نے اس نئے طریقِ تحقیق کی تفصیل بیان کی، جس کی مدد سے ہر کلیدی اصطلاح کے معنویاتی نظام کو بہت کامیابی سے الگ کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔ کتاب کے دوسرے اور تیسرے حصے میں اس تحقیق سے حاصل شدہ نتائج پر بحث ہوئی۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں اس عبوری دَور کی تاریخ پیش کی گئی۔ بلاشبہ یہ دور قبل از اسلام اور اسلامی دَور کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی ہے کہ انتہائی لطیف انداز میں یہ دَور دونوں ادوار کے درمیان موجود ربط کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ معنویاتی تحقیق کے نقطۂ نظر سے اسلامی فکر کی پوری تاریخ میں یہ دَور سب سے زیادہ دلچسپ ہے، اس لیے بھی کہ یہ اسلام کا آغاز ہے، لیکن اس سے بڑھ کر یہ کہ اس دَور کی تاریخ سے اُس حیرت انگیز عمل کا بھی پتہ چلتا ہے جس نے اقدار کے ایک روایتی نظام کو جو جمود کا شکار ہو کر اندر سے کھوکھلا ہو گیا تھا، کس طرح ایک نئے نظام میں بدل دیا۔ دوسرے الفاظ میں اس دَور میں معنویاتی تبدیلیوں کے ایسے عمل کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جس میں کلیدی اصطلاحات کا نظام ٹوٹ کر بکھر رہا ہے، اصطلاحات کے نظامِ دلالت میں کس طرح تبدیلیاں آ رہی ہیں اور پھر یہی اصطلاحات کس طرح نئی ترتیب میں تشکیل پاتی ہیں اور بہت سی نئی اصطلاحات کے اضافے کے ساتھ مجموعی طور پر بالکل

نیا اور مختلف نظام وجود میں لاتی ہیں۔

اسی بات کو زیادہ واضح کر کے یوں کہا جا سکتا ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسلام کا قبل از اسلام جاہلیت کے دور سے کسی طرح کا کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام کا دور ماضی کے بت پرست دور سے مکمل اور قطعی علیحدہ ہے۔ بڑی حد تک یہ بات صحیح ہے۔ واقعتہً قرآن کے نزول سے ایک نئے مذہبی اور ثقافتی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ تاریخ عرب میں یقیناً یہ دور بے مثال ہے۔ یہ ایک روحانی انقلاب تھا، جس نے ذاتی اور سماجی، غرض ہر شعبۂ زندگی پر دُور رس اثرات مرتب کیے۔ حتیٰ کہ عرب زندگی کے مادی پہلو بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ تاہم ایک پہلو ایسا ہے جس میں اسلام کا توحیدی دور اور جاہلی عرب کا مشرکانہ دور ایک ناقابلِ تردید رشتے میں جڑے نظر آتے ہیں۔ ہم نے اپنی تازہ تصنیف ''خدا اور انسان'' (ٹوکیو، ۱۹۶۴ء) میں تفصیل سے لکھا ہے کہ قرآن کے وہ بنیادی تصورات جو خدا اور انسان کے مابین رشتے سے تعلق رکھتے ہیں، وہ کسی طرح قبل از اسلام عرب تصورات کی بدلی ہوئی نئی شکل ہیں اور اس طرح سے ایک تسلسل قائم کیے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ اللہ کے نام کو دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ وحی قرآنی نے کوئی نیا تصور پیش نہیں کیا۔ یہی بات قرآن کی اخلاقی اصطلاحات پر بھی صادق آتی ہے۔

یہ سوچنا غلط بلکہ قطعاً ظلم ہے کہ چونکہ قبل از اسلام عرب شاعری میں مذہبی تصور کا معیار بہت پست تھا اور عیش کوشی اور لذت پرستی شاعروں کے محبوب موضوع تھے، اس لیے اس دور کے عرب اعلیٰ اخلاقی اقدار سے بے بہرہ تھے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ان کی زندگی مروّت (مردانگی) کے سخت اخلاقی ضابطوں کی پابند تھی۔ شجاعت، صبر، سخاوت اور مستقل مزاجی مثال کے طور پر اس ضابطے کے چند بنیادی تصورات تھے۔ ان اخلاقی تصورات کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ ہر زمانے اور ہر قوم میں ان عالمگیر قدروں کو تسلیم کیا گیا ہے۔ تاہم چونکہ زمانہ قبل از اسلام کی اخلاقی اقدار قبائلی

عصبیت کے محدود اصول میں بند ہو کر رہ گئی تھیں، اس لیے مروّت اور مردانگی کے اخلاقی ضابطے ایک مخصوص مزاج کے حامل بن گئے تھے اور اپنا عالمگیر جوہر کھو بیٹھے تھے۔

قبل از اسلام کی بعض اخلاقی اقدار کو قرآن کریم نے کلیتہً رد کر دیا لیکن اکثر کو نئے دینی تقاضوں کے مطابق ترمیم اور اضافے کے ساتھ قائم رکھا۔ پرانی اقدار کی اس طرح کایا پلٹ گئی اور روایتی قبائلی طرزِ زندگی سے وہ یوں کٹ گئیں کہ اب اُنہوں نے خالصتہً نئی مذہبی اخلاقی اقدار کی شکل میں جنم لیا اور یوں اسلامی نظام کا اٹوٹ حصہ بن گئیں۔ عرب اخلاقی اقدار میں اندرونی تبدیلی کے اسی عمل اور اس سے پیدا شدہ مختلف مسائل کا معنویاتی نقطۂ نظر سے جائزہ اس کتاب کے دوسرے حصے کا موضوع تھا۔

یہ جائزہ تیسرے حصے کے لیے تاریخی پس منظر فراہم کرتا ہے۔ کتاب کے تیسرے حصے میں ہم نے اسی پس منظر کے ساتھ مذہبی اخلاقی تصورات کے قرآنی نظام کا معنویاتی تجزیہ پیش کیا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ کس طرح یہ نظام جو قرآنی تصورِ کائنات کا ہی ایک پہلو ہے، نیک و بد کی سادہ مگر بہت ہی مضبوط اور فعال دوئی پر مبنی ہے۔ قرآن انسانی رویّے اور کردار کا محاکمہ مجرد انداز میں نہیں بلکہ بہت ٹھوس اور واضح شکل میں پیش کرتا ہے۔ ایمان اور کفر قرآنی اخلاقیات کی عمارت کے دو اہم ستون ہیں، جو اپنے اردگرد بہت سے اور دوسرے تصورات سے جُڑے ہوئے ہیں جو ایمان اور کفر سے براہِ راست تعلق رکھتے ہیں۔ انسان کے رویّے اور کردار کو اسی اوّلین سطح کی اخلاقیات کی زبان میں بتایا اور جانچا گیا ہے۔ اخلاقیات کی اس سے اوپر کی سطح، اس کی لغات اور اصطلاحات کی تفصیل بعد کے فقہا کا کام ہے۔

یہ دُہرانے کی ضرورت نہیں کہ قرآنِ کریم میں دین ہر چیز کی بنیاد اور اصل ہے۔ ان معنوں میں ایسے تصورات جن کا تعلق مذہبی اخلاقیات سے ہے، وہ اخلاق

سے وابستہ تصورات میں سب سے اہم اور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ مزید برآں قرآن کی حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی فکر میں جو تصور اخلاقی ہے، وہ مذہبی ہے اور جو مذہبی ہے وہ اخلاقی۔ تاہم قرآن کی اخلاقی زبان کا ایک اور اہم میدان بھی ہے۔ یہ سماجی اخلاقیات کے کلیدی تصورات کا میدان ہے۔ اگرچہ یہ میدان بھی بنیادی طور پر مذہبی نوعیت کا ہی ہے۔ کیونکہ اس میں چال چلن کے تمام قاعدے آخر کار اللہ کے اوامر و نواہی پر ہی مبنی ہیں۔ لیکن ان تصورات کا واسطہ ایک مذہبی معاشرے میں رہنے والے انسانوں کے باہمی تعلقات سے ہے۔ یہ ایک لحاظ سے ان تعلقات کی افقی جہت ہے۔ اس کے برعکس مذہبی اخلاقیات جو انسان اور خدا کے مابین رشتے کی عمودی جہت کو ظاہر کرتے ہیں۔

قرآنی تعلیمات نے آگے چل کر نہ صرف مذہب کو فروغ دیا بلکہ ایک ثقافت اور تہذیب کی بنیاد بھی رکھی۔ اس حقیقت کے نقطۂ نظر سے ہمیں یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ سماجی اخلاقیات کے میدان کی اہمیت زیادہ ہے، کیونکہ معاشرے میں انسانوں کی روزمرہ زندگی کے تعلقات اس کا موضوع ہیں۔ قرآنِ کریم میں خصوصاً مدنی دور میں معاشرتی زندگی کے تعلقات اس کا موضوع ہیں۔ قرآنِ کریم میں خصوصاً مدنی دور میں معاشرتی زندگی کے بارے میں زیادہ تفصیل سے ہدایات ملتی ہیں۔ تاہم قرآنی اخلاقیات کے اس پہلو کا علمی تجزیہ اس کتاب کا موضوع نہیں۔ اس کے لیے ایک اور کتاب درکار ہوگی۔

اشاریہ

ادارہ ثقافت اسلامیہ

Price: Rs. 375:00